سالنامہ ۲۰۰۸ء

۲۰۰۸ء	۲۰۰۸ء	۲۰۰۸ء	۲۰۰۸ء	۲۰۰۸ء
انبساط ۱۲۳	بخش ۹۰۲	سال ۹۱	دو ہزار آٹھ ۶۲۹	مُبارک ۲۶۳
سال ہو گہر پاش ۶۳۰	لطیفِ جہاں وطن ہو ۲۶۴	سایبان ۱۲۴	چمن شگفتہ ۸۹۸	آئینی ہو ۹۲
چشمِ روشن ۸۹۹	پاک جبیں ۸۸	عافیتِ جہاں ہو ۶۳۱	سال باصفا ۲۶۵	مایہء ناز ہو ۱۲۵
موافقِ حال ۲۶۶	پاسبانی ۱۲۶	ہو یہ نیا سال سرمایۂ شادمانی ۹۰۰	حُبِ نبویؐ ہو ۸۹	سرمایہء ہوش ۶۲۷
گُل کدہ ہو ۹۰	منبعِ سُرور ۶۲۸	سالِ نیک نام ۲۶۲	یاقوی ۱۲۷	صاحبِ استقلال ہو یہ نیا سال ۹۰۱
۲۰۰۸ء	۲۰۰۸ء	۲۰۰۸ء	۲۰۰۸ء	۲۰۰۸ء

الاقرباء فاؤنڈیشن، اسلام آباد

سالنامہ ۲۰۰۸ء

سہ ماہی **الاقرباء** اسلام آباد

(تہذیب و معاشرت، علم و ادب اور تعلیم و ثقافت کی اعلیٰ قدروں کا نقیب)

جلد نمبر ۱۱ شمارہ نمبر ۱ جنوری۔ مارچ ۲۰۰۸ء

الاقرباء فاؤنڈیشن۔ اسلام آباد

مکان نمبر ۴۶۴ سٹریٹ نمبر ۵۸ آئی ۸/۳ اسلام آباد

فون ۴۴۴۲۶۸۶ فیکس ۰۵۱-۲۱۰۲۶۷۰

E-mail: al-aqreba@hotmail.com

www.alaqreba.com

بیرونِ ملک معاونینِ خصوصی

یورپ

بیرسٹر سلیم قریشی

برکلے چیمبر۔2۔اے، برکلے روڈ۔

لیٹن سٹون(Leytonstone)لندن۔

ای 11 '3ڈی جی' فون 5582289(0208)

فیکس 5583849 (0208)

ای میل: qureshi@ss.life.co.uk

امریکہ

محمد اویس جعفری

218 نارتھ ایسٹ 175 سٹریٹ پی۔او۔شورلائن

سیاٹل(Seattle)واشنگٹن 3516-98155(یو ایس اے)

فون 8094-361 (206)

فیکس 0411-361 (206)

ای میل jafreyomi@gmail.com

زرتعاون

فی شمارہ	۱۰۰ روپے
سالانہ (مع محصول ڈاک)	۴۰۰ روپے
بیرون ملک فی شمارہ	۷ڈالر/۵ پاؤنڈ
بیرون ملک سالانہ (مع محصول ڈاک)	۳۰ڈالر/۲۰ پاؤنڈ

کوائف نامہ

شمارہ	جنوری۔مارچ ۲۰۰۸ء
ناشر	سید ناصر الدین
کمپوزنگ	نعیم کمپوزرز۔اسلام آباد
طابع	ضیاء پرنٹرز۔اسلام آباد

سید انتخاب علی کمال

نقشِ کمال

توضیح واشاریہ سرورق

توضیح: مندرجہ بالا مربع نقش میں (۵ ذر۵) پچیس خانے ہیں۔ ہر خانے میں نئے سال ۲۰۰۸ء سے متعلق ایک مادّۂ تاریخ لکھا ہے ہر مادّے کے نیچے اس مادّے کے ابجدی اعداد دیئے گئے ہیں۔ ان اعداد کو جمع کرنے سے ۲۰۰۸ء برآمد ہوگا۔ یعنی مربع ہذا کی ہر سطر کے پانچ خانوں کے اعداد عرضاً (دائیں سے بائیں) شمار کیجیے۔ ۲۰۰۸ء برآمد ہوگا۔ اسی طرح طولاً (اوپر سے نیچے) جمع کیجیے تو بھی ۲۰۰۸ء ہی برآمد ہوگا بعینہٖ زاویہ بزاویہ (زاویہ حادّہ) کے خانوں کو یا زاویہ منفرجہ بنانے والے خانوں کو جمع کیجیے، حاصل جمع ہر طرف سے ۲۰۰۸ آئے گا۔

اشاریہ: اس قسم کی پہلی تاریخ میر شیر علی، قانع تتوی (صاحب مقالات الشعراء) نے ۱۱۶۸ ہجری (مطابق ۱۷۵۴ء) میں کہی۔ دوسری تاریخ اسی سال یعنی ۱۱۶۸ ہجری ہی میں مدّاح تتوی (غلام علی ابنِ محمد محسن) نے کہی۔ ان دونوں حضرات کے بعد جویا مرادآبادی (صاحب سرودِ غیبی) نے ۱۲۸۸ ہجری (مطابق ۱۸۷۱ء) میں، اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں، فاضل بریلوی (صاحب کنزالایمان فی ترجمۃ القرآن) نے اپنے مرشد سید آل رسول مارہروی کے وصال پر ۱۲۹۷ ہجری (مطابق ۱۸۷۹ء) میں، سید ابوالحسن حافظیاں مشہدی (صاحب لوح محفوظ) نے ۱۳۹۵ ہجری (مطابق ۱۹۴۰ء) میں، سید خورشید علی مہر تقوی جے پوری، (صاحب تذکرۂ درخشاں) نے ۱۳۷۷ ہجری (مطابق ۱۹۵۷ء) میں مولوی منظور احمد کوثر جے پوری کی وفات پر کہی۔ اور اب ان محترم اساتذہ کرام کے فیض اور اللہ کے فضل و کرم سے ہیچ مداں راقم الحروف نے ۱۴۲۸ ہجری (مطابق ۲۰۰۸ء) میں نئے سال کی آمد پر کہی ہے۔ جو سہ ماہی الاقرباء کی نذر ہے۔ (سید انتخاب علی کمال)

مندرجات

انشائیہ۔ خاکہ۔ افسانہ

حمد۔ نعت۔ سلام۔ منقبت

غزلیات

منظومات

تراجم

قطعات ۔ رباعیات

نقد و نظر

مراسلات

خبرنامہ الاقرباء فاؤنڈیشن

اداریہ

۲۰۰۸ء......زبانوں کا بین الاقوامی سال

اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ایک قرارداد کے ذریعہ ۲۰۰۸ء کو زبانوں کا بین الاقوامی سال قرار دیا ہے اس طرح دنیا بھر میں بولی جانے والی کم و بیش سات ہزار زبانوں کے لیے یہ خبر ایک مژدۂ جانفزا بھی ہے اور لمحہ فکریہ اس لیے بھی کہ عالمگیریت کا عفریت یک لسانی سامراجیت کو اس کرۂ ارضی کے چپہ چپہ پر مسلط کر دینے پر کمر بستہ نظر آتا ہے۔ اس کے باوجود کہ تخمیناً دنیا کی ساڑھے چھ ارب آبادی میں صرف چند کروڑ نفوس ایسے ہیں جن کی مادری زبان انگریزی ہے لیکن لگتا یوں ہے کہ سارے جہان پر اس زبان کی حکمرانی ہے، کسی زبان سے تعصب کا رویہ روا رکھنا اگرچہ کسی طرح بھی مناسب نہیں لیکن کسی بھی زبان کی طرح انگریزی زبان کے بھی تہذیبی، ثقافتی اور معاشی و معاشرتی مضمرات ہیں اس لیے اس کا تغلب دنیا کی دوسری زبانوں اور معاشروں کے لیے نہ صرف ایک چیلنج ہے بلکہ بیشتر صورتوں میں اولاً تہذیبی تصادم اور آخر کار زبانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کے لیے جرم ضعیفی کی سزا بن کر مرگِ مفاجات پر منتج ہوا ہے۔ بہر حال عالمی تنظیم پر امریکہ، برطانیہ، کینیڈا اور آسٹریلیا کی فیصلہ کن لسانی و سیاسی بالادستی سے قطع نظر یونیسکو (اقوام متحدہ کی تعلیمی، سائنسی و ثقافتی تنظیم) کا یہ اعلان خوش آئند ہے کہ ''زبانیں افراد کی اجتماعی و انفرادی شناخت اور ان کی پُر امن بقائے باہمی کا لازمہ ہیں، یہ مقامی و عالمی ہم آہنگی کے تناظر میں تسلسل پذیر ترقیاتی عمل میں اہم کردار ادا کرتی ہیں صرف کثیر اللسانیت کے ذریعہ ہی تمام زبانیں نظام عالمگیریت میں اپنا مقام حاصل کر سکتی ہیں''۔

نظام عالمگیریت کے حوالے سے ہمارے ہی نہیں ترقی پذیر ممالک کے برحق و برمحل تحفظات نہایت واضح ہیں تاہم ہمیں توقع ہے کہ اقوام متحدہ چونکہ اپنے موثر و فعال ذیلی اداروں بالخصوص یونیسکو کے حوالے سے اپنی پیشرو تنظیم لیگ آف نیشنز پر برتری کی حامل ہے، اس لیے کثیر اللسانیت اور ثقافتی تنوع کو نصب العین قرار دے کر عالمی سطح پر اس حقیقت کا ادراک سال ۲۰۰۸ء کے دوران عام کیا جائے گا کہ

عالمگیریت کے پسِ پردہ طاقتیں دنیا بھر میں زبانوں کا حلیہ بگارنے پر تلی بیٹھی ہیں، انگریزی زبان کی بالادستی کو مستحکم تر کرنے کے لیے سات ہزار سے زائد زبانوں کو پس منظر میں دھکیلا جارہا ہے جس کے نتیجے میں یہ زبانیں دنیا کے معاشی، سماجی، تہذیبی وثقافتی اور ادبی منظرنامے سے غائب ہورہی ہیں زبان صرف اظہار خیالات کا وسیلہ نہیں ہوتی بلکہ یہ خیالات کی تشکیل کی بھی ضامن ہوتی ہے جب ایک زبان مرتی ہے تو اس کے ساتھ ہی ایک مخصوص تہذیب وثقافت اور طریقِ زندگی بھی موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔ تہذیبی تنوع لسانی تنوع کا مرہونِ منت ہوتا ہے چنانچہ ایک زبان کی برتری کے نتیجہ میں عالمی تمدن کی کثیرالجہتی کو نقصان پہنچتا ہے اس لیے مقامی زبانوں کا تحفظ مقامی ثقافتوں کی بقا کے لیے نہایت ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ افراد واقوام کے درمیان ابلاغ اور باہمی تفہیم کی ناگزیریت کو تسلیم کیا جائے۔ انسانیت کے لسانی اور ثقافتی ورثے کے تحفظ نیز ان زبانوں اور ثقافتوں کے اثرات کو توسیع دی جائے جو اس ورثے کے اجزائے ترکیبی قرار پاتے ہیں یہی نہیں بلکہ اس خطرے کا تدارک کرنا بھی لازم ہے جو ابلاغ عامہ کے حوالے سے عالمگیریت اور دنیا کی دوسری زبانوں کی قیمت پر یک لسانی یلغار کے باعث لسانی تنوع کے عمل کو درپیش ہے یہی یلغار علاقائی زبانوں کی نیست ونابود پر بھی منتج ہوسکتی ہے۔

اس پُرخطر تناظر میں اقوام متحدہ کے رکن ممالک پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ کثیر اللسانیت کو فروغ دینے کے لیے بین الاقوامی سطح پر سماجی، فکری اور ابلاغیاتی فضا پیدا کریں نیز کثیر اللسانی تعلیم کے ذریعہ کسی بھی مادری زبان سے وابستگی کے قطع نظر تمام شہریوں کو حصول علم کے مواقع فراہم کئے جائیں اور کثیر اللسانیت کی تعمیر وتشکیل کے لیے حکمت عملی وضع کی جائے۔ اس ضمن میں یہ امر نہایت ضروری ہے کہ قدیم وجدید بڑی تہذیبوں کی زبانوں کے مطالعہ کی حوصلہ افزائی کے ذریعہ ادبی تعلیم کے تحفظ وارتقا کو بھی یقینی بنایا جائے اس ضمن میں یقیناً ایک وسیع البنیاد علمدرآمدی میکانزم کی ضرورت پیش آئے گی جس کا اہتمام رکن ممالک کرسکتے ہیں اور جس کے لیے نیک نیتی اور اخلاص ناگزیر ہیں۔ جن کا اگر فقدان نہیں تو قحط ضرور نظر آتا ہے۔ اقوام متحدہ اگر یونیسکو کے ذریعہ ایک موثر رابطہ کاری کا نظام قائم کرسکتی ہے تو مثبت نتائج کی بھی توقع بے محل نہ ہوگی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک جامع حکمتِ عملی کا نفاذ عجائب گھروں،

لائبریریوں اور دستاویزی مراکز کے توسط سے ممکن بنایا جاسکتا ہے کیونکہ یہ ادارے ثقافتی ورثے کے امین بھی ہیں اور معلوماتی نیٹ ورکس تک رسائی کے متحمل بھی ہو سکتے ہیں، یہی نہیں بلکہ تراجم کے وسائل و ذرائع کی توسیع کے ساتھ ساتھ اصطلاحات کے ابلاغ و تفہیم کے عمل کو بھی بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔

یونیسکو نے مادری زبانوں کو تحفظ فراہم کرنے اور ان کے فروغ و ارتقا میں کردار ادا کرنے کا بیڑہ اگرچہ ۱۹۹۹ء سے اٹھایا ہوا ہے لیکن اس ضمن میں جہاں ایک طرف سرد مہری کے رویے سامنے آئے ہیں، وہیں دوسری طرف بڑی طاقتوں کی عیّارانہ سیاست نے بھی مطلوبہ مقاصد کے حصول میں موانع پیدا کیے ہیں۔ یونیسکو کے ریکارڈ میں اس حقیقت کے باوجود کہ اردو عالمی سطح پر کثرتِ استعمال کے حوالے سے ایک ارب سے بھی متجاوز افراد کے درمیان بولی اور سمجھی جانے والی زبان ہے اسے 'ہندوستانی' کا نام دیا گیا ہے جس کی ناقابلِ رشک وجوہ برصغیر کی تاریخ میں پیوست ہیں۔ اُردو شمالی ہندوستان اور پاکستان کی فطری زبان ہے اور تمام جنوبی ایشیاء میں اس لیے مقبول ہے کہ اسے ایک بہت بڑی اکثریت بولتی اور سمجھتی ہے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اردو روزمرہ کے معمولات، معاشرتی ضروریات و روابط اور کئی نسلوں کے مذاقِ فطری کی ترجمان بن چکی ہے اور یہ عملی تسلسل صدیوں پر محیط ہے۔ بھارت کے مشہور ادیب، دانشور اور نقاد شمس الرحمان فاروقی نے اپنی کتاب ''اردو کی ابتدائی تاریخ'' میں اردو کے ارتقاء کو کم و بیش پندرہ علاقائی زبانوں کا مرہونِ منت قرار دیا ہے لیکن پنجابی اور سندھی سمیت انہوں نے پاکستان کی کسی بھی علاقائی زبان کا ذکر نہیں کیا حالانکہ اب تک منظرِ عام پر آنے والی لسانی تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ اردو کی نشو و نما میں پاکستان کے تمام خطوں میں بولی جانے والی علاقائی زبانوں کا زبردست کردار ہے بلکہ اس ضمن میں کیے جانے والے دعاوی سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو کی جڑیں پاکستان کی علاقائی زبانوں میں پیوست ہیں۔ مقتدرہ قومی زبان نے ''پاکستان میں اردو'' کے زیرِ عنوان پانچ جلدوں پر مشتمل تحقیق شائع کر کے ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے اور اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ سندھ، بلوچستان، پنجاب، کشمیر، صوبہ سرحد اور شمالی علاقہ جات اردو کے حوالے سے تاسیسی اہمیت کے حامل ہیں۔

یونیسکو کے ریکارڈ میں اردو کی جگہ "ہندوستانی" کے لفظ کا مزید ایک پس منظر یہ بھی ہے کہ غیر منقسم ہندوستان میں ہندو اکثریت نے اردو کو مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت بلکہ ایک حد تک مذہب کا پروردہ خیال کیا حالانکہ اس زبان کے نشوو ارتقا میں عربی و فارسی کے ساتھ ساتھ ہندی و سنسکرت کو بھی یکساں دخل حاصل رہا ہے بلکہ اردو ادب ہندو مسلمان اہلِ قلم کی یکساں میراث ہے، مہاتما گاندھی کو اردو زبان کی ہمہ گیریت کا اعتراف تھا لیکن ان کی سیاست کا تقاضا تھا کہ اردو کو "ہندوستانی" کا نام دیا جائے اور فارسی و سنسکرت کے دو رسم الخط تقسیم کا سبب بن جائیں۔ آنجہانی رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری نے اگرچہ اردو کے مقام و منصب کی وکالت میں دلائل دیئے لیکن دو رسم الخط کی تجویز پر وہ بھی متفق تھے البتہ قرۃ العین حیدر نے دوٹوک الفاظ میں کہا کہ اردو کو اغوا کرلیا گیا ہے اور نام ہندی رکھ دیا گیا ہے۔ بہرکیف ۱۹۴۹ء میں اردو کو ہندوستان سے بالکل خارج کردیا گیا اور اردو رسم الخط کو ناپید کردینے کی منظم کوششیں کی گئیں لیکن اردو زبان کی وسعت اور ہمہ گیری ہمیشہ ہر نوع کے تعصبات کو شکست دیتی رہی یہی وجہ ہے کہ آج بھارت کے دو بڑے صوبوں بہار اور یوپی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا مرتبہ حاصل ہے۔ جنوبی ریاستوں اور مہاراشٹر نیز دہلی میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا جاچکا ہے لیکن

از دشمناں بُرند شکایت بہ دوستاں
چوں دوست دشمن است شکایت کجا بُرم

اس مسلسل جاری و ساری سانحے کو کیا کہیے کہ آزادی کے بعد چھ دہائیاں گزر جانے کے باوجود بھی اردو کو سرکاری حیثیت میں، پاکستان میں داخل ہونے کی آج تک اجازت نہیں ملی اور تحریکِ پاکستان کی فاتح التواریخ یہ زبان جو ہمارے تہذیب و تمدن اور اندازِ فکر کی شناخت بن چکی ہے بدستور منافقتوں کے گرداب میں پھنسی ہوئی ہے۔ ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء کے دساتیر میں اردو کی قومی و سرکاری حیثیت کو تسلیم کیا گیا لیکن اس پر عملدرآمد تو کجا یہ دونوں دستور ہی وقت کی آندھیوں میں ورق ورق ہو کر منتشر ہوگئے جبکہ ۱۹۷۳ء کے واضح دستوری اعلان (آرٹیکل ۲۵۱) کے باوجود اور اس حقیقت کے باوجود کہ ملک میں متعلقہ اداروں نے جن میں مقتدرہ قومی زبان سرِفہرست ہے اردو کو علمی و فنی لحاظ سے دنیا کی

جدید ترین اور ترقی یافتہ زبانوں کے شانہ بشانہ لاکھڑا کیا ہے حکمرانوں نے غیر اعلانیہ طور پر انگریزی زبان کو پاکستان کی اول اور سرکاری زبان کا مرتبہ دے رکھا ہے۔ یہ رویہ ثقافتی اور ذہنی غلامی کا عکاس ہے جس نے ہماری نئی نسلوں کے فکری ارتقاء کو مجروح کیا ہے اور زندگی کے تمام شعبوں میں منفی اثرات مرتب کیے ہیں۔

کیا اس صورتِ حال کا کوئی حل بھی ہے کہ نہیں؟ قومی اور بین الاقوامی سطح کی اس زبان سے ناروا سلوک کے نتیجہ میں پاکستان کی علاقائی زبانوں کے فروغ و ارتقاء کا عمل بری طرح مجروح ہو رہا ہے۔ انگریزی زبان سے مرعوبیت ہماری قومی بے حسی ہی نہیں بے غیرتی کی بھی مظہر ہے۔ مفلوج الفکر اذہاں اس صورتِ حال کے حق میں جو دلائل دیتے ہیں وہ یا تو اُنکے احساسِ کمتری کا شاخسانہ ہیں یا خرد باختگی کی پاداش! حالانکہ پاکستان کے متصل تو کیا دور دور تک کوئی ملک ایسا نہیں جس نے اپنے عوام پر کسی غیر ملکی زبان کو مسلط کیا ہو بلکہ بھارت تو پاکستان سے کہیں زیادہ مختلف زبانیں بولی جانے والے علاقوں پر مشتمل ہے ہندی کو سب سے زیادہ مخالفت کا سامنا بنگالی اور دراوڑی بولی جانے والے علاقوں میں کرنا پڑا۔ لیکن ہندی ہی کو ملک کی قومی و سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ پاکستان میں اردو اور علاقائی زبانیں باہم شیر و شکر ہیں بلکہ ہر علاقائی زبان کو یہ اختصاص حاصل ہے کہ اس نے اردو کے فروغ و ارتقاء میں تاسیسی کردار ادا کیا ہے کاش اردو کے لئے ۲۰۰۸ء کا سال مبارک ہو اور اُسے پاکستان ہی میں نہیں بلکہ عالمی سطح پر بھی اُسکی ہمہ گیریت کے حوالے سے تسلیم کیا جائے اور یونیسکو کے ریکارڈ کی تصحیح کر کے ''ہندوستانی'' کی جگہ اردو کو دی جائے جس کے نام میں یائے نسبتی (ی) کا کوئی بھی ایسا حوالہ موجود نہیں جو 'ہندوستانی' کی طرح اِسے کسی ایک ملک سے منسوب و معنون کر دے۔ بلاشبہ اُردو ایک بین الاقوامی زبان ہے چنانچہ اس کا حق ہے کہ اِسے اقوامِ متحدہ کی سرکاری زبانوں میں بھی شامل کیا جائے۔

ڈاکٹر محمد معزالدین

ابن سینا، دنیائے اسلام کا شہرۂ آفاق طبیب وسائنس داں

ابن سینا کا پورا نام ابوعلی حسین ابن عبداللہ ہے جو ابن سینا یا بوعلی سینا کے نام سے مشہور ہے، فلسفہ، طب اور ریاضی میں اس کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں وہ بیک وقت بلند پایہ فلسفی بھی تھا اور طبیب، کامل، عظیم مفکر اور خوشگو شاعر بھی۔

اس جامع العلوم اور نابغۂ روزگار کا سنہ ولادت ۳۷۰ھ مطابق ۹۸۰ء ہے۔ اس کی ابتدائی تعلیم بخارا میں ہوئی، کم عمری ہی میں اس نے قرآن پاک حفظ کرلیا تھا اور علوم متداولہ میں دسترس حاصل کرلی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ طب کی تعلیم اس نے محض اٹھارہ سال کی عمر میں مکمل کرلی تھی زمانے کے نشیب وفراز اور نقل مکانی کے بعد دنیائے طب، فلسفے، ریاضی اور سائنس کا یہ بے مثال عالم ۴۲۸ھ مطابق ۱۰۳۷ء میں ہمدان میں راہیء ملک عدم ہوا۔

بوعلی سینا کی بے شمار تصانیف نظم ونثر میں ہیں جو فلسفہ، طب، ریاضی، دینیات، فلکیات اور مابعد الطبیعیات پر محیط ہیں۔ ان میں زیادہ تر عربی میں ہیں اور چند ایک فارسی میں، جن کے دیکھنے سے اس کے مطالعے کی وسعت، ذہنی بالیدگی، فکر ونظر کی جامعیت اور ہمہ گیری کا اندازہ ہوتا ہے۔

جُرجان، اصفہان اور ہمدان کے شاہی درباروں سے منسلک ہوکر اس نے اپنی تصنیفات مکمل کیں۔ تاجدارِ بخارا، نوح بن منصور نے اس کی طبّی صلاحیت اور علم سے بے پناہ شغف کے پیشِ نظر اسے شاہی کتب خانے کا مہتمم مقرر کردیا تھا جس سے اس نے بھرپور استفادہ کیا۔

اس کی نہایت جامع تصنیف ''الشفاء'' ہے۔ اس میں فلسفہ، منطق مابعد الطبیعیات (Metaphysics) اور موسیقی پر گہرے مباحث ہیں نیز مادّے اور ہیئت کے رشتے پر بحث کی ہے۔ دونوں کا انحصار ذاتِ باری تعالیٰ پر ہے۔ دنیا کی بیشتر زبانوں میں اس کے ترجمے ہوچکے ہیں۔ ابن سینا کی

مشہور تصانیف میں النجات، الاشارات، والتنبیہات وغیرہ کی شرحیں فخر الدین رازی، نصیر الدین طوسی، بدر الدین محمد اسعد جیسے نامور ارباب علم نے کی ہیں۔ اس کی ایک معرکۃ الآرا تصنیف الہدایۃ ہے، جو منطق طبیعیات اور الٰہیات پر ہے، اسلامی فکر کی تاریخ میں اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کتاب میں ابن سینا کے فارسی اشعار بھی ملتے ہیں جن سے اس کی شعری صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ طبّ میں اس کی تصنیف ''القانون فی الطبّ'' ایک شہرۂ آفاق تصنیف ہے، کہا جاتا ہے کہ جالینوس، رازی اور علی ابن عباس کے کارناموں کے مقابلے میں اس کو برتری حاصل ہے۔ یورپ میں یہ کتاب ''Canon medicine'' کے نام سے مشہور ہے، اسی طرح ''الادویات القلبیہ'' اس کی طبّ کی مشہور تصنیف ہے۔ ابن سینا کی ریاضی سے دلچسپی فلسفیانہ تھی۔ اس باب میں ''رسالۃ الزوایا'' اس کی اعلیٰ کتاب ہے۔ مشہور مستشرق پروفیسر اے۔ جی براؤن نے اپنی کتاب ''عربین میڈیسن'' میں لکھا ہے کہ ''قانون کی قاموسانہ شان، قابل تعریف ترتیب وتبویب، فلسفیانہ انداز بیان اور جدتِ مضامین، طب کے علاوہ دیگر علوم وفنون کے میدانوں میں اس کے مؤلف کی زبردست شہرت کے ساتھ مل کر دنیائے اسلام کے طبی لٹریچر میں اس کو ایک خاص مرتبہ بلند پر پہنچا رہی ہے''۔ (بحوالہ طبّ العرب، مترجمہ حکیم نیرؔ واسطی، صفحہ ۷۳)
مشرق ومغرب میں صدیوں یہ کتاب طبّ کی اساس تسلیم کی جاتی رہی ہے۔ معدنیات پر اس کی تصنیف، ارضی معلومات کی تیرہویں صدی میں یورپ میں بے حد مقبول رہی ہے۔ پہاڑوں کی ساخت، متحجّرات اور آثار قدیمہ (Fossils) پر بھی اس نے کتاب لکھی ہے جو بے حد مقبول تھی۔

ابن سینا ذات اور وجود کے مسائل سے خصوصی دلچسپی رکھتا تھا۔ ارسطو کی طرح اسے منطق سے خاص لگاؤ تھا۔ جدید منطق کا اس کو پیش رو کہا جاتا ہے وجودات (Existence) کے مسائل سے اسے خاص دلچسپی تھی۔ عقلی اور مذہبی اعتبار سے ذات باری تعالیٰ کی وحدانیت کو سمجھنے کی اس نے امکانی حد تک کوشش کی ہے، نفسیات پر اس کی تصنیفات موجود ہیں۔ جن میں اس نے نفسِ انسانی اور نفس حیوانی پر مدلّل بحث کی ہے۔ مغربی فلسفیوں نے اس کے نظریے کو اپنا لیا ہے۔ ابن سینا قیاسات میں متقدّمین کی رائے سے متفق نہیں، اس کے نزدیک طبیعیات ایک صفت نظری ہے اس کا قول ہے کہ روح سے ہی بدن

کی تکوین ہوتی ہے، چنانچہ وہ روح کے تصوّر کو صورت کے تصوّر سے الگ رکھتا ہے، بجنسبہ اس کا وجود قائم رہتا ہے، وہ انسانی روح کی انفرادی بقا کا قائل ہے۔ اس کے نزدیک جسم کی علیٰحدگی کے بعد یہ اپنی انفرادیت قائم رکھتی ہے علاّمہ اقبال کا بھی یہی خیال ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے

پاکستان کے مشہور عالم مفتی محمد سعید خان نے اپنی ایک ریڈیائی تقریر میں فرمایا ہے کہ روحیں مرنے کے بعد آپس میں گفتگو کرتی ہیں۔ ایک دوسرے کی خیر و عافیت دریافت کرتی ہیں اور دنیا میں زندہ رہنے والے دوستوں کے احوال معلوم کرتی ہیں ابن سینا کا بھی کہنا ہے کہ آئندہ و زندگی میں مسرّت اور رنج و غم کا وجود خالصاً روحانی ہوگا۔ ابن سینا کے یہاں مابعد الطبیعیات کا دار و مدار منطق پر ہے، استدلال اور استشہاد کی مدد سے عالم ماورائے طبیعیات تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے، اس کی نظر میں اور مابعد الطبیعیات دونوں میں اصول منطق کا دخل ہے۔ صفات الٰہیہ کے متعلق اس کا نظریہ یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا مرتبہ "معلّت العلل" "مبداء اوّل اور غایت الغایات" ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شریعت حکمت کی ضد نہیں، ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں، "مقامات عارفین" اس کے رسالے 'اشارات' کی ایک فصل ہے جس میں اس نے تصوف پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ عارف وہ ہے جو منطق اور علم کے راستے سے جدا ہو کر حقیقت سے اتصال کے ذریعہ عالم الٰہی میں داخل ہوتا ہے۔ ان کے مختلف درجات ہیں زہد و تقویٰ کی ریاضت کی بدولت قرب الٰہی میسر ہوتا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ پیغمبروں کا درجہ فلسفیوں سے بڑا ہے اور وحی کی حیثیت ایک بلند و بالا ادراک "قدرت قدسیہ" ہے، بہ الفاظ دیگر وحی، الہام اور رویا حکمت الٰہیہ کے اجزا ہیں، کچھ ایسے انسان بھی ہیں جن کی قوت حس تیز ہوتی ہے، اپنی کتاب 'النفس' میں ان باطنی حواس کی تفصیل بتائی ہے جن کے ذریعے انہیں ممکنہ حوادث کا پیشتر علم ہو جاتا ہے۔

مغرب نے ابن سینا کا بڑا اثر قبول کیا، علم و حکمت میں اس کے اجتہادات، خیالات اور معلومات کی یورپ میں بڑی قدر ہوئی بالخصوص طب میں اس کی سیادت اب بھی مانی جاتی ہے اس کی تصانیف کے

ترجمے ہوئے جن سے اس کا یورپ میں سکہ بیٹھ گیا۔ مشہور ہے کہ راجز بیکن اکثر مباحث میں اس کا خوشہ چیں ہے۔ اس کے معترفین بھی اس کے کمال علم و دانش کا اعتراف کرتے ہیں وہ اپنے زمانے کی عالی مرتبت سر برآوردہ شخصیات میں تھا۔ اس کا نام الفارابی، الکندی اور ابن رُشد وغیرہ کے ساتھ عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ فلسفے، سائنس اور طب میں اس کی سربلندی رہتی دنیا تک قائم رہے گی۔

ابن سینا کا کمال ہے کہ اس نے فلسفے، سائنس اور طب کے ساتھ اخلاقی اور روحانی اقدار اور دینی افکار کی تطبیق کی ہے اور یہی نقطۂ اتصال مولانا جلال الدین رومیؒ اور علامہ اقبالؒ کے یہاں بھی نمایاں ہے۔ وہ پیغمبر کی ضرورت پر بھی زور دیتا ہے کیونکہ پیغمبر قانون الٰہی کو انسان کے سامنے رکھ کر اپنی انفرادی قوت اور روحانی سَر بلندی سے زمیں پر خدا کا ترجمان بنتا ہے۔ ابن سینا کے دشمنوں نے اس کی شہرت اور اس کی اعلیٰ صلاحیتوں سے جل کر اِس پر کیچڑ اچھالنے کی کوششیں بھی کیں مگر انہیں منہ کی کھانی پڑی، ابن سینا نے ان کی ہرزہ سرائی کا مسکت جواب دے کر ان کے منہ بند کر دیئے، سَنائی ایران کا ایک مشہور طبیب اور قابل احترام صوفی شاعر تھا جو ابن سینا کا بڑا مدّاح تھا۔ اس نے ''ابن سینا کا احترام کرتے ہوئے'' ایک لازوال نظم لکھ کر ان حاسدوں کو خاموش کر دیا یہ وہی سنائی ہے، جس کی تعریف میں مولانا رومیؒ نے یہ شعر کہا تھا

عطار روح بود وسَنائی دو چشم او — ماز پے سَنائی وعطار آمدیم (مولانا روم)

مشرق اور مغرب دونوں میں ابن سینا کا بے پناہ اثر تھا اور اس کی غیر معمولی مقبولیت نے اسے ایک روایتی (Legnedry) شخصیت کی حیثیت عطا کر دی (بحوالہ دائرۂ معارف اسلامیہ لاہور) نظامی عروضی سمرقندی نے اپنی تصنیف ''چہار مقالہ'' میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ اگر بقراط اور جالینوس زندہ ہو کر دوبارہ دنیا میں آسکیں تو یقین کیجیے کہ وہ بھی اس کتاب (القانون فی الطبّ) کا احترام کرنے پر مجبور ہونگے۔ (بحوالہ اے۔ جی۔ براؤن)

بوعلی سینا علم کا سمندر تھا وہ بیک وقت ماہر فلسفہ و دینیات اور بے مثل طبیب شاعر و مفکر بھی تھا اور فنون موسیقی میں بھی یکتائے روزگار غرضکہ ''بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست''۔

بوعلی سینا عرف عام میں شیخ کہلاتا تھا، اس کی رباعیاں عمر خیام کے ساتھ خلط ملط ہو گئی ہیں۔

شیخ کی ایک رباعی 'مجمع الفصحا' سے درج ذیل ہے:

از قعرِ گل سیاہ تا اوج زحل   کردم ہمہ مشکلاتِ گیتی راحل

بیروں جستم زقید ہر مکر وحیل   ہر بند کشادہ شد مگر بندِ اجل

فٹز جیرالڈ (Fitz Gerald) نے اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا ہے۔ اس مغالطے میں کہ یہ عمر خیام کی رباعی ہے۔

"Up from earth is centre through the seventh gate"

مرکز زمین سے روانہ ہو کر فلک ہفتم سے گزر کر

I rose, and on the throne of saturn sate

میں زمین سے اٹھا اور زحل کے تخت پر جا بیٹھا

and many a knot unravelled the road

اور میں نے بہت سی گرہیں راہ چلتے کھول کر رکھ دیں

But not the master- knot of human fate"

مگر مجھ سے انسانی تقدیر کا عقدہ دشوار نہ کھل سکا

بقول پروفیسر براؤن ''شیخ کی مقبول ترین عربی نظم ہے جس میں اس نے بتایا ہے کہ روح کس طرح عالم علوی (محل ارفع) سے جو اس کا وطن ہے اتر کر جسم میں داخل ہو گئی یہ نظم حقیقتاً نہایت دلکش ہے۔

(بحوالہ طب عرب، ایڈورڈ جی براؤن اردو ترجمہ، حکیم سید علی احمد نیر واسطی مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور)

پروفیسر فتح محمد ملک

منیر نیازی کا شہر آشوب

منیر نیازی ابھی کل تک ہمارے درمیان موجود تھے مگر آج فقط ایک یاد بن گئے ہیں۔ انہوں نے زندہ رہنے کا ایک عجب طور اپنا رکھا تھا۔ منیر نے موجود سے زیادہ یاد میں اور حقیقت سے زیادہ خواب میں زندگی کرنے کی خُو اپنا رکھی تھی۔ اپنی ''یادوں کے بن'' سے اپنے خوابوں کے ''نئے شہرِ امکاں'' کی جانب ان کا سفر صبر آزما مصائب سے پُر تھا۔ اس انتہائی کٹھن سفر کا ایک دُھندلا سا عکس خود ان کے درج ذیل شعر میں لافانی ہو کر رہ گیا ہے:

کل دیکھا اِک آدمی اَٹا سفر کی دُھول میں
گُم تھا اپنے آپ میں جیسے خوشبو پھول میں

پاکستان ان کے لیے ایک روحانی واردات ہے۔ طلوعِ آزادی کے ساتھ وہ پاکستان میں پناہ گزیں ہو کر نہیں آئے بلکہ انہوں نے برطانوی ہند کے فرسودہ ہندی خانے سے ایک ''نئے شہرِ امکاں'' کی جانب ہجرت کی۔ اس ہجرت کا مفہوم آنحضورؐ کی مکہ سے مدینہ ہجرت میں پنہاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۶۵ء کے پاک بھارت معرکۂ ستمبر کے دوران منیر نیازی نے اپنے وطن پر سلام بھیجتے وقت ہجرت کے صدیوں پرانے تجربے کو تڑپ تڑپ کر یاد کیا ہے:

تو ہوا قائم خدا کی برتری کے نام پر
بازوئے حیدرؓ، جمالِ احمدیؐ کے نام پر
تو بھی ہے ہجرت کدہ، شہرِ مدینہ کی طرح
ہم نے بھی دہرائی ہے اک رسم، آبا کی طرح

......(اپنے وطن کو سلام)

منیر تحریکِ پاکستان کے خوابوں کو پاکستان کی عملی زندگی میں جلوہ گر دیکھنے کی شدید آرزو رکھتے تھے۔ یہ مقدس آرزومندی ان کی بیشتر شاعری کی صورت گر ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری بسا اوقات اقبال کی شاعری کو آواز دیتی سنائی دیتی ہے۔ اللہ میاں نے اقبال کی نظم ''شکوہ'' کے جواب میں اپنے پیغام کو اقبال ہی کی زبان میں یوں تمام کیا تھا:

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں — یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے — دہر میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا کر دے

اس پیغامِ ربانی کی روشنی میں نئی زندگی کی تخلیق کی بے تاب تمنا منیر نیازی کی شاعری میں جلوہ گر ہے۔ اس نئی زندگی کی تخلیق میں ناکامی نے لاحاصلی ہی کو شہر کی تقدیر بنا کر رکھ دیا ہے، ''خدا کی اس سر زمیں پہ یاروستم کا طوفان زور پر ہے''، ملک کی فضاؤں پر آسیب سایہ فگن ہے، حرفِ صداقت نایاب ہے اور حرفِ دروغ ارزاں ہے، زمین شر کا مسکن ہے تو آسمان سراب آلود، انفرادی اور اجتماعی خطاؤں کے باعث سارا عہد سزا میں مبتلا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے:

طوفان ابر و باد بلا ساحلوں پہ ہے — دریا کی خامشی میں ڈبونے کا رنگ ہے

ہوا یوں کہ ہم شہرِ صفا کا رستہ بھول کر رفتہ رفتہ اس شہرِ ہول میں آپہنچے جہاں ہر کام بے معنی ہو کر رہ گیا ہے، جہاں نہ تو اطاعت میں کوئی معنی باقی رہے اور نہ ہی بغاوت میں۔ اس ہولناک فضا میں منیر بے اختیار اپنے اللہ کو پکارتے ہیں اور اپنے رسولؐ کریم کو یاد کرتے ہیں، اس تمنا کے ساتھ کہ ہمارے سامنے شہرِ صفا کی راہیں ایک بار پھر منور ہو جائیں:

شعاعِ مہرِ منور شبوں سے پیدا ہو — متاعِ خوابِ مسرت غموں سے پیدا ہو
مری نظر سے جو گم ہو گیا وہ ظاہر ہو — صراطِ شہرِ صفا الجھنوں سے پیدا ہو
گلِ مراد! سرِ دشتِ نامرادی کھل — رُخِ نگارِ وفا محملوں سے پیدا ہو
فروغِ اسمِ محمدؐ ہو بستیوں میں منیر — قدیم یاد نئے مسکنوں سے پیدا ہو

درج بالا غزل کے آخری شعر تک پہنچتے پہنچتے جہاں اقبال کے بہت سے اشعار درِ دل پر دستک دیتے سنائی دیتے ہیں وہاں اقبال کا خطبۂ الٰہ آباد بھی از سرِ نو یاد آنے لگتا ہے۔ یہاں میں اقبال کے فقط ایک شعر اور خطبۂ الٰہ آباد کے فقط ایک پیراگراف کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ اقبال نے ہماری توجہ تکرارِ مسلسل کی بجائے نت نئی تخلیق کی جانب منعطف کراتے وقت کہا تھا:

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد — مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

بلاشبہ دہر میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا تقلید کی بجائے ایجاد کی خُو اپنا کر، نئے مسکنوں کی تازہ آب وہوا میں قدیم یاد کی از سرِ نو کاشت اور آبیاری سے ہی ممکن ہے۔ (سایۂ افلاکِ نو میں اے بہارِ دائی تجھ پر سلام!) منیر نیازی کی نظر میں پاکستان کا قیام ایک ایسے ہی نئے مسکن، کوفہ و بغداد سے مختلف تازہ بستی بسانے کی خاطر عمل میں آیا تھا۔ اہلِ کوفہ و بغداد تو اپنی بستیوں میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا کرنے میں ناکام ہو کر رہ گئے تھے۔ شاید اسی لیے مُفکرِ پاکستان علامہ اقبال نے خطبۂ الٰہ آباد میں برصغیر کے مسلمانوں کو اپنی کثرت کے علاقوں میں آزاد اور خود مختار مسلمان مملکتوں کے قیام کی راہ دکھائی تھی۔ اپنے اس عہد آفریں خطبہ صدارت میں اقبال نے یہ خواب بھی دیکھا تھا کہ ان آزاد اور خود مختار مملکتوں کے قیام سے اسلام کو یہ فائدہ پہنچے گا کہ ان نئے مسکنوں میں اسمِ محمدؐ کی قدیم یاد از سرِ نو سرگرمِ کار ہو سکے گا۔ یہاں اسلام پر سے ملوکیت کی بدنما چھاپ کو اتار کر اسلام کی حقیقی روح کو نئے سرے سے دریافت کیا جا سکے گا، اسلام کے کلچر، قانون اور تعلیم کا جمود حرکت و عمل سے بدلا جا سکے گا اور یوں اسلام کی حقیقی روح کو روحِ عصر کے ساتھ ہم آہنگ کیا جا سکے گا۔ منیر نیازی کے ہاں بھی قدیم یاد کو نئے مسکنوں میں پیدا کرنے کا یہی مفہوم ہے۔ آج سے سینتیس سال پہلے انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ: ''ہم نے یہ ملک بڑے چیلنج کے ساتھ حاصل کیا تھا۔ ہمیں اس کو خوبصورت بنانا تھا''۔ منیر کی شاعری اس بڑے چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کی تمنا سے سرسبز و شاداب ہے:

رات اتنی جا چکی ہے اور سونا ہے ابھی
اس نگر میں اِک خوشی کا خواب بونا ہے ابھی

ایسی یادوں میں گھرے ہیں جن سے کچھ حاصل نہیں
اور کتنا وقت ان یادوں میں کھونا ہے ابھی

ہم نے کھلتے دیکھنا ہے پھر خیابانِ بہار
شہر کے اطراف کی مٹی میں سونا ہے ابھی

بیٹھ جائیں سایۂ دامانِ احمدؐ میں منیر
اور پھر سوچیں وہ باتیں جن کو ہونا ہے ابھی

یہاں مجھے اقبال یاد آتے ہیں اور ''تازہ کن بہ مصطفیٰ پیمانِ خویش'' کے موضوع پر ان کی بیسیوں منظومات یاد آنے لگتی ہیں اور میں سوچنے لگتا ہوں کہ منیر نیازی ہمیں سایۂ دامانِ احمدؐ میں بیٹھ کر وہ باتیں سوچنے کی دعوت نہیں دے رہے جو ہو چکی ہیں بلکہ وہ ہمیں ان باتوں کی طرف متوجہ کر رہے ہیں جن

کو ابھی ہونا ہے اور دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا جن کے ہونے پر منحصر ہے۔ ناروے میں ایک مختصر قیام کے دوران جب انور مسعود نے منیر نیازی سے پوچھا تھا کہ ہمارے معاشرے سے ان بدصورتیوں کو نکالنے کی کوئی سبیل؟ تو منیر نیازی کا سیدھا سا جواب تھا کہ جیسے ہمارے رسول اکرمؐ نے کیا تھا''۔ بحیثیت شاعر اور انسان منیر نیازی کا المیہ یہ ہے کہ ہم پاکستان میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اس سے بھی بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم تحریکِ پاکستان کے اس خواب کو فراموش کر کے خوش بیٹھے ہیں۔ اب ہم کچھ اور ہی طرح کے خواب وخیال میں مست رہنے لگے ہیں۔ زر پرستی کے نئے خواب وخیال نے ہمیں افلاک سے خاک پر لا پھینکا ہے:

چمک زر کی اُسے آخر مکانِ خاک میں لائی — بنایا ناگ نے جسموں میں گھر آہستہ آہستہ

زر کی پرچھائیں جو پڑتی ہے چمک اُٹھتا ہے — آدمِ خاک کی خاموشی میں حالت دیکھو

مکان، زر، لبِ گویا، حدِ سپہر وزمیں — دکھائی دیتا ہے، سب کچھ یہاں خدا کے سوا

زوال عصر ہے کوفے میں اور گداگر ہیں — کھلا نہیں کوئی در بابِ التجا کے سوا

کہاں تو کل ہم کوفہ و بغداد سے دور بہت دور اسمِ محمدؐ کی روشنی میں تازہ بستیاں آباد کرنے چلے تھے اور کہاں آج ہم بھٹکتے بھٹکتے پھر سے کوفہ وبغداد آ پہنچے ہیں۔ چنانچہ ہمارا شاعر ہمارے ''ڈرائے گئے شہروں کے باطن'' سے ہمیں یوں متعارف کرا رہا ہے:

ان دنوں یہ حالت ہے میری، خوابِ ہستی میں — پھر رہا ہوں میں جیسے اِک خراب بستی میں
خوف سے مفر جیسے شہر کی ضرورت ہے — عیش کی فراوانی اس کی ایک صورت ہے
ان دنوں میں مے نوشی فعلِ سود لگتا ہے — عورتوں کی صحبت میں دل بہت بہلتا ہے

برصغیر کی اٹھارہویں صدی کے طبقۂ اُمراء کی مانند ہمارے ہاں آج عیش کی فروانی میں خوف سے نجات پانے کا چلن عام ہو کر رہ گیا ہے۔ زوال کی لپیٹ میں آئے ہوئے معاشرے میں منیر نیازی خود کو اجنبی پاتے ہیں اور زمانِ مصطفیٰؐ کی یاد میں گم رہنے لگتے ہیں:

وہ فضا اُس دور کی، اُس میں جمالِ مصطفیٰؐ　　　جہل کی تاریکیوں میں شہر سا اِک نور کا

....

ہمیں پاکستان کے جغرافیائی وجود کے اندر جمالِ مصطفیٰؐ سے پھوٹتے ہوئے نُور کا یہ شہر آباد کرنے میں جس اجتماعی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اس نے منیر کو برباد کر کے رکھ دیا تھا:

میں جو اِک برباد ہوں، آباد رکھتا ہے مجھے　　　دیر تک اسمِ محمدؐ شاد رکھتا ہے مجھے

....

اب منیر نیازی خوف کے اس شہر میں اسمِ محمدؐ کی یاد اور اللہ کی حمد و ثنا کے سہارے زندہ ہیں:

شامِ شہرِ ہول میں شمعیں جلا دیتا ہے تُو　　　یاد آ کر اس نگر میں حوصلہ دیتا ہے تُو

ماند پڑ جاتی ہے جب اشجار پر ہر روشنی　　　گھپ اندھیرے جنگلوں میں راستہ دیتا ہے تُو

....

ایسے میں کبھی کبھار منیر کو یادوں کے بَن سے نئے شہرِ امکاں کی جانب اپنی ہجرت کا مقصد یاد آتا ہے:

آیا ہوں مَیں منیر کسی کام کے لیے　　　رہتا ہے اِک خیال سا خوابوں کے ساتھ ساتھ

تہہ در تہہ مفہوم سے لبریز اس شعر کا فوری مفہوم ہمیں اس ''کام'' کی جانب متوجہ کرتا ہے جو پاکستان کے جغرافیائی وجود کے اندر ایک جہان تازہ کی تخلیق کے خوابوں سے عبارت ہے۔ وہ ''کام'' جس کا عزم لے کر منیر نے اپنے آبائی شہر خان پور سے پاکستان ہجرت کی تھی۔ اب میں یہ سوچ رہا ہوں کہ درج بالا شعر میں منیر نے اپنی کیفیت کی مصوری کی ہے یا میری، آپ کی یا ہم سب کی اس سنگین غفلت کی جانب اشارہ کیا ہے، ہم انفرادی اور اجتماعی طور پر جس کے مرتکب چلے آ رہے ہیں۔ یہ تحریکِ پاکستان کے خوابوں کی روشنی میں پاکستان میں ایک نئی زندگی کی تعمیر اور ایک نئی دنیا کی تخلیق سے غفلت ہے۔ آیئے، اس شہر آشوب سے نجات کی خاطر:

بیٹھ جائیں سایۂ دامانِ احمدؐ میں منیر　　　اور پھر سوچیں وہ باتیں، جن کو ہونا ہے ابھی!

....

حواشی

۱۔ بات سے بات۔ ص ۲۴، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء۔

ڈاکٹر نسیم اے ہائنز (ہارورڈ یونیورسٹی)

برصغیر پاک و ہند اور ترکی و ایران کے درمیان ثقافتی روابط

تیرھویں صدی عیسوی کے ربع اول میں حکمرانوں کی ہوس ملک گیری اور سیاسی عوامل کے سبب برصغیر کی شمال مغربی سرحد مسلسل تبدیلیوں اور تغیرات کی زد میں رہی، چنانچہ اس خطے میں آنے والے لوگ مختلف تہذیبوں اور معاشرتی اکائیوں میں منقسم ہونے کے باوجود شانہ بشانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور رہے اور باہمی ابلاغ و اظہار کی ضرورتوں کے پیشِ نظر ایک دوسرے کی زبان کی تفہیم ان کا مقصد قرار پائی۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ تبادلہ خیال کے مسلسل عمل سے گزرنے کے نتیجہ میں ایک دوسرے کے عقائد اور رسوم سے بھی آگاہی ہوئی۔ اس طرح فارسی، ترکی اور عربی زبانیں مقامی لسانی ڈھانچے کا تیزی سے جزوِ لاینفک بنتی گئیں۔ یہ عمل صوفیہ کے باہم دگر روابط اور تبادلہ خیالات کے نتیجہ میں اور بھی ارتقا پذیر رہا لیکن تاریخ سے اس حقیقت کی شہادت بھی ملتی ہے کہ یہ عمل ہمیشہ پُر امن نہیں رہا۔ بایں ہمہ صوفیہ، شعراء، اہل فن اور حکمرانوں نے گذشتہ صدیوں میں معاشرتی ہم آہنگی او باہمی روابط کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا بالخصوص ادب اور موسیقی کے شعبوں کو ان ہستیوں نے مالا مال کیا۔ عصر رواں کی وہ تہذیب جسے ''گنگا جمنی'' کہا جاتا ہے برصغیر کے شمالی خطوں میں ہم آہنگی کے عمل کی مرہونِ منت ہے۔ اس سلسلہ میں ہم پانچ اہم شخصیات کا ذکر کریں گے جن میں حضرت امیر خسرو (متوفی ۱۳۲۶ء) 'چنداین' کے مصنف مولانا داؤد (۱۴۰۰-۱۴۷۵) 'حقائق ہند' کے مصنف شیخ میر عبدالواحد (متوفی ۱۶۰۸ء) عظیم قوال نصرت فتح علی خاں (متوفی ۱۹۹۷ء) اور ہندی شاعر ہری ونش رائے، بچن (متوفی ۲۰۰۳) شامل ہیں۔

جیسا کہ کہا گیا تیرھویں صدی عیسوی کے لگ بھگ ایرانی اور ہندی حکمرانوں کے مابین آویزش کے نتیجہ میں دونوں ممالک کے درمیان سرحدی ردوبدل کا عمل جاری رہا۔ جو ایران پر منگولوں کی فوج کشی (چنگیز خاں متوفی ۱۲۲۷ء) کے باعث مزید عدم استحکام کا شکار ہوا اور مدبرین و علماء نیز فنکاروں کی ایک بڑی تعداد وسطی ایشیاء اور ایران سے آکر بھکر میں ناصرالدین قباچہ کے دربار نیز ملتان اور اُوچ

میں پناہ لینے پر مجبور ہوئی۔ بعدازاں بہت سے تارکین وطن کو التتمش کے دربار دہلی میں بھی پذیرائی میسر آئی۔ چنانچہ یہ تارکین وطن میزبان ملک میں اپنے ہمراہ فنونِ لطیفہ، مذہبی عقائد، مختلف زبانیں اور ادبی روایات بھی لائے اور نتیجتاً سرحد پار سے آئے ہوئے۔ اس ثقافتی ورثے اور شمالی برصغیر کے کلاسیکی نظامِ موسیقی و ادب نیز عوامی روایات کے درمیان امتزاج و ہم آہنگی کی ایک فضا قائم ہوئی۔ موسیقی کے شعبہ میں نئے آلاتِ موسیقی، مثلاً ستار اور اصنافِ موسیقی میں مثلاً قوالی وغیرہ معرضِ وجود میں آئیں، اسی طرح مختلف اصنافِ ادب مثلاً مثنوی اور غزل وغیرہ متعارف ہوئیں۔

اطہر عباس رضوی نے جنہوں نے برصغیر پر کثرت سے قلم اٹھایا ہے، اپنی کتاب ''ہندوستان میں تصوف کی تاریخ'' میں عہد وسطیٰ کی ہندو صوفیانہ روایتِ تصوف پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ برصغیر میں گیارہویں صدی عیسوی ہی سے صوفیہ اور یوگیوں کے درمیان روابط میں آویزش کی فضا میں بتدریج اضافہ ہی نہیں ہوا بلکہ اس نے اور بھی زیادہ بامعنی حیثیت اختیار کر لی، ترکی اور مصر کے قلندروں اور صوفیوں نے قریہ بہ قریہ گھومنے والے یوگیوں سے واضح اثرات قبول کیے۔ بدقسمتی سے ہمارا معاصر ادب یوگیوں کے احوال و کوائف پر جنہیں عرفِ عام میں جوگی کہا جاتا ہے روشنی ڈالنے سے قاصر رہا ہے۔ صوفیہ کے مراکز میں موجود دستاویزات کو بنیاد بنا کر رضوی نے تفصیلاً ان روابط پر روشنی ڈالی ہے جن کے ذریعہ صوفیوں اور یوگیوں نے اپنے اپنے عقائد اور معمولات پر تبادلہ خیال کیا ہے یہی نہیں بلکہ علمِ ہیئت اور علمِ حیوانات جیسے سائنسی موضوعات پر ان لوگوں کے درمیان معلومات کا تبادلہ ہوتا رہا ہے۔

برصغیر میں ادب کے حوالے سے امیر خسرو پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے شمال مغربی علاقوں میں ایرانی اور برصغیر کی ثقافتوں کے درمیان ہم آہنگی اور تفہیم باہمی کے لیے زبردست کام کیا۔ ابوالحسن امیر خسرو ۱۲۵۳ء میں بھارت میں ضلع ایٹہ کے ایک گاؤں پٹیالی میں پیدا ہوئے ان کا خاندان وسط ایشیا سے برصغیر منتقل ہوا تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں گیارہ بادشاہوں کا عہد حکمرانی دیکھا۔ وہ اگرچہ اپنی فارسی مثنویوں (مثلاً نہہ سپہر) کے حوالے سے شہرت رکھتے ہیں لیکن ان کے ادبی شاہکاروں میں فارسی شاعر نظامی گنجی کی طرز میں اعلیٰ پایہ کی نگارشات شامل ہیں۔ خسرو کو جو حضرت نظام الدین اولیاؒ (متوفی ۱۳۲۵ء)

کے مرید تھے، فارسی اور ہندوائی میں بیک وقت شعر کہنے کا اولین اعزاز حاصل تھا۔ اپنی کتاب ''تاریخ ہندی ادب'' میں جندل نے ہندوائی میں امیر خسرو کے اشعار کو ادب لطیف کے نادر نمونے قرار دیا ہے، ان کے وہ اشعار جن کا ایک مصرعہ فارسی اور دوسرا ہندوائی میں ہے اپنا مخصوص رنگ و آہنگ رکھتے ہیں اور امیر خسرو کی فکری صناعی کے مظہر ہیں۔ خسرو کو اپنے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیاؒ سے والہانہ عشق تھا ان کے وصال کی خبر خسرو پر بجلی بن کر گری چنانچہ اس صدمۂ جانکاہ نے انہیں ایک برس سے زیادہ نہ جینے دیا اور ۱۳۲۶ء میں وہ بھی اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

ادبی روایات اور فارسی ہندی کے ملاپ کا وہ دور جس کے نقیب اور معمار اول تیرھویں صدی عیسوی میں امیر خسرو تھے وہ مولانا داؤد کی مثنوی ''چندایں'' مصنفہ ۱۳۷۹ء کے ساتھ اپنے عروج کو پہنچ گیا۔ مولانا داؤد حضرت شیخ زین الدینؒ کے مرید تھے۔ مولانا کی مثنوی کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ اس کے اقتباسات دہلی کی مساجد کے خطبات میں بطور حوالہ پیش کیے جاتے تھے۔ اکبری عہد کے مشہور مورخ بدایونی نے بھی اس مثنوی کے اوصاف کا ذکر کیا ہے یہاں تک کہ مولانا شیخ تقی الدین جو واعظ ربانی کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے اپنے خطابات میں مثنوی ''چندایں'' سے شعری حوالے پیش کیا کرتے تھے۔ جنہیں وہ قرآن حکیم کی تشریحات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اس طرح یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہندی مثنوی کے ادبی منظرنامہ پر طلوع ہونے کے بعد اسلامی اور ہندو روایات کے موضوع پر مباحث کا عمل کافی رواج پا چکا تھا۔

سلاطین کے عہد سے جب ہم مغل دور میں داخل ہوتے ہیں تو ہمیں ''حقائقِ ہندی'' کے مصنف میر عبدالواحد بلگرامی کی شخصیت نظر آتی ہے۔ بلگرامی سے تعارف کا قدیم ترین حوالہ ابوالفضل (۱۶۰۲۔۱۵۵۱ء) کی تصنیف ''آئین اکبری'' ہے، جس کے ذریعہ ہمیں بلگرامی کی عظیم فارسی تصانیف کا علم ہوتا ہے لیکن ''حقائق ہندی'' نے ہندو مسلم اتحاد کی فضا پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا، جسے تقابلِ مذاہب کے حوالے سے بھی ایک مستند دستاویز سمجھا گیا۔ اس ضمن میں اکبری عہد کے ہندو مسلم روابط کو ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہے۔ چنانچہ اس تناظر میں مثنوی مولانا رومؒ (۱۲۷۳۔۱۲۰۷ء) سے اکبری دربار کے زعماء کا متعارف ہونا عین قرین قیاس ہے۔ اس دور میں موسیقی کو نمایاں اہمیت حاصل تھی چنانچہ

بلگرامی کے مطابق موسیقی روحانی ووجدانی کیفیات سے مملو ہے۔

قوالی کی مخصوص موسیقی نے بلاشبہ مختلف عقائد کے لوگوں کو نزدیک تر لانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ہندوپاکستان کی صوفیانہ موسیقی کے حوالے سے قوالی کو ایک صنف قرار دیا گیا۔ میرے علم کے مطابق کوئی دوسری صنف ایسی نہیں جو ہندی اردو شاعری کا قوالی کی طرح مکمل احاطہ کرتی ہو، دیکھا گیا ہے کہ قوال بلا کا حافظہ رکھتے ہیں اور شعروں پر گرہیں لگانے میں اس درجہ کمال رکھتے ہیں کہ سامعین پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور نظم یا غزل جسے وہ بنیادی طور پر گا رہے ہوتے ہیں اس کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے، اس سلسلہ میں قوالی پسند کرنے والے حلقوں میں نصرت فتح علی خاں (۱۹۹۷۔۱۹۴۸ء) بے حد مقبول رہے ہیں اور انہیں ''شہنشاہ قوالی'' کے نام سے یاد کیا جاتا رہا ہے۔ وہ گذشتہ چھ صدیوں کے روایتی قوالوں کا تسلسل خیال کیے جاتے ہیں، ان کی گائیکی کیف وسرور کی انتہائی بلندیوں کو چھوتی نظر آتی ہے یہاں تک کہ وہ لوگ جوان کے منہ سے نکلنے والے ایک لفظ کو بھی نہیں سمجھتے وہ بھی مسحور نظر آتے ہیں۔ ان کی آواز روح کی گہرائیوں میں اس طرح اتر جاتی ہے کہ قرب الٰہی کا احساس دل ودماغ کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے، یہاں میں ایک ہندو گیت کا حوالہ دونگی جسے نصرت فتح علی نے اپنے مسحور کن فن کے ذریعہ اسلامی طرز احساس میں ڈھال دیا تھا، یہ گیت رانی میرابائی متوفی ۱۶۴۷ء کی تخلیق تھا جو ایک راجپوت شہزادی اور ہندو متصوفانہ شاعری کی نمائندہ سمجھی جاتی تھی۔ اس گیت میں نصرت فتح علی دوسرے شعراء کے کلام سے گرہ لگانے کے بجائے خود اپنے مصرعے تخلیق کرتے تھے جنہیں ان پر طاری وجد کی انتہائی کیفیت کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے۔ ان کا کمال یہ تھا کہ وہ بھجن کے مفہوم کو سُر اور لَے کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کردیتے تھے کہ ایک بعید از بیان کیفیت روح کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی تھی، ان کا یہ کمالِ فن ہندو اور مسلم سامعین کو یکساں متاثر کرتا تھا۔

مثنوی اور قوالی کے ساتھ ساتھ دوسری شعری اصناف مثلاً غزل، نظم، قطعہ اور رباعی وغیرہ نے جنوبی ایشیاء میں زبردست مقبولیت حاصل کی، جن میں رباعیاتِ خیام انگریزی میں ترجمہ ہونے کے بعد مغرب میں بھی سند کا درجہ حاصل کر گئیں۔ اُردو ادب بالخصوص اردو شاعری میں جو مسلمانوں میں مرغوب و محبوب مقام رکھتی ہے۔ شراب کا موضوع اہم ترین حیثیت کا حامل ہے حالانکہ شراب دین اسلام میں

ممنوع ہے لیکن شراب کو تصوف کی زبان میں علامتی حیثیت دے کر امر بنا دیا گیا ہے، خمار و سرور کی کیفیات کے بیان نے شعراء میں قادر الکلامی کو جنم دیا، جس نے اردو شعر کو ابدیت سے ہمکنار کر دیا اور ایک عظیم الشان ذخیرہ الفاظ وجود میں آیا، شراب کے استعارہ کی شکل میں جہاں معرفت الٰہی کے مضامین نظام کیے گئے وہیں یہ لفظ سیاسی مفاہیم کی ادائیگی کے لیے بھی استعمال کیا گیا مثلاً

ہم تو سمجھے تھے کہ برسات میں برسے گی شراب — آئی برسات تو برسات نے دل توڑ دیا

بیسویں صدی کے نصف آخر میں بھارت میں ہندی زبان کے فروغ کے ساتھ اردو سے سرد مہری کا سلوک روا رکھا گیا۔ حد تو یہ ہے کہ اتر پردیش میں لکھنو جو اردو زبان و ادب بالخصوص اردو شاعری کا منبع و مرکز رہا ہے اردو سے اجنبیت کی بتدریج علامت بننے لگا۔ جس کے نتیجہ میں اردو شاعری کا عظیم الشان ورثہ دھندلکوں اور اندھیروں کی نذر کر دیا گیا ان حالات میں الٰہ آباد کے ایک ہندی شاعر ہری ونش رائے بچن نے جرأت مندانہ قدم بڑھایا اور اردو شاعری سے خمریات کی روایت کو ہندی شاعری میں منتقل کیا، بچن نے اردو کی خمریاتی شاعری کی اصطلاعات ولفظیات کو سنسکرت میں ترجمہ کیا اور وہ اس طرح کہ ان الفاظ و اصطلاحات کی اصل ہیئت و حیثیت کو تبدیل نہیں ہونے دیا۔ اپنی کتاب ''تاریخ ہندی ادب'' میں جندال لکھتا ہے کہ

> ''ہری ونش رائے نے جو ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوا۔ کیمبرج یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں پی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔ وہ ایک طلسمانی شخصیت کا مالک شاعر تھا جو اپنی شاعری کے ذریعے گھنٹوں اپنے سامعین کو مسحور کیے رکھتا تھا اور شراب کے موضوع پر اس کے فکر و فن کی بڑھتی ہوئی گرفت اس کی روز بروز بڑھتی ہوئی مقبولیت کا سبب بن رہی تھی''۔

آخر میں مولانا رومیؒ کی مثنوی معنوی کے حوالے سے میں کہنا چاہوں گی جسے محمد یوسف علی شاہ نے ''پیر ہن یوسفی'' کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔ مولانا رومی کے مطابق ہمیں حقیقت کی تلاش و جستجو کے لیے ان علامتوں کی جانب رجوع کرنا پڑے گا جن سے وہ حقیقت منکشف ہوتی ہے۔ اشیاء در حقیقت وہ کچھ نہیں ہوتیں جیسا کہ وہ نظر آتی ہیں۔ اس لیے ہمیں اپنے اذہان کو کشادہ کر کے حقیقت کو دریافت کرنا ہوگا اور یہ حقیقت ہمارے تمام گرد و پیش میں موجود ہے۔ جس کا اظہار علامتوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔

سید انتخاب علی کمال

ناسخ لکھنوی کی تاریخ گوئی

شیخ امام بخش ابن شیخ خدا بخش، ناسخ لکھنوی اردو زبان کے بہت ہی عظیم اور قابلِ احترام شاعر تھے اور خاص لکھنوی طرز کے موجد بھی کہلائے۔ ناسخ کو زبان کی صحت، قواعد کی پابندی اور صرف ونحو کا لحاظ بہت عزیز تھا۔ اصلاحِ زبان کے سلسلے میں اُن کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ اردو زبان کی اصلاح کی تحریک شاہ ظہور الدین حاتم اور میر تقی میر سے انشاء اللہ خان انشاء تک اور پھر انشاء سے ناسخ تک پہنچی۔ حاتم اور میر نے زبان کی اصلاح کے جو اصُول وضع کیے خود اُن اصولوں کی سختی سے پابندی نہیں کی۔ کیونکہ دونوں ہی شعراء کو اصلاحِ زبان سے زیادہ اسلوبِ شاعری سے دلچسپی رہی۔ جبکہ ناسخ کو زبان کی صحت اور علمِ زبان سے زیادہ دلچسپی تھی۔ اسلوبِ شاعری سے کم۔ ناسخ کی اصل خدمت حاتم اور میر کے وضع کردہ اصولوں کو رائج کرنا ہے۔ رشید حسن خان نے ناسخ کی انہی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''...... ناسخ کا یہ کام ضرور ہے کہ اُن کے آغازِ شاعری تک جس قدر متروکات کی نشان دہی کی جا چکی تھی۔ ان میں اکثر کو انہوں نے ترک کر دیا اور سختی سے ان کی پابندی کی......''
> (''انتخاب ناسخ''۔ رشید خان، مکتبہ جامع نئی دہلی ۱۹۷۲ء)

اسی طرح صفیر بلگرامی نے ناسخ کے اصولوں پر طویل بحث کے بعد لکھا:

> ''...... ناسخ کے بعد کتنی کتابیں اس اصول پر تحریر کرنا لوگوں کے لئے آسان ہو گیا۔ اور وہ قاعدۂ صرف ونحو ہے جو زبان کی جان اور اصل اصول ہے......''
> (جلوۂ خضر، صفیر بلگرامی۔ حصہ دوم، مطبع نور الانوار، آرہ۔ ۱۸۸۵ء)

''خوش معرکہ زیبا'' سعادت خان ناصر مرتبہ مشفق خواجہ میں ناسخ کے دو ادبی معرکوں کا ذکر ہے۔ جس میں پہلا معرکہ لالہ موجی رام کے ساتھ اور دوسرا ادبی معرکہ مرزا محسن برادر مرزا حاجی کے ساتھ ہوا۔ ان دونوں معرکوں سے ناسخ کی علمی دسترس اور قابلیت، استعداد کی دھاک بیٹھ گئی۔ ''ناسخ کا مزاج بنیادی طور پر فن شعر، صحتِ زبان، رعائت لفظی، قافیہ پیمائی۔ سنگلاخ زمینوں کی آبیاری، صنعتوں

کے اہتمام سے شغف رکھنے والے صناع کا ہے"۔ ("ناسخ کا لسانی شعور"۔ ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر۔ اردو سہ ماہی جلد: ۵۔۷۔ جنوری تا دسمبر ۱۹۹۹ء)۔ ناسخ کے صناعی مزاج میں تاریخ گوئی بھی شامل تھی۔ لیکن ناسخ کی تاریخ گوئی پر لکھا بہت کم گیا ہے۔ حالانکہ بعض تذکرہ نگاروں نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ وہ بات بات پر تاریخیں کہتے تھے لہٰذا ناسخ کی تاریخ گوئی کو زیرِ تحریر مقالے کا موضوع بناتے ہوئے مختلف کتب میں بکھری تاریخوں کو یکجا کر کے نذرِ قارئین کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ جسے میں تحقیق تو نہیں کہہ سکتا البتہ حاصلِ مطالعہ ضرور کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ میری نظر میں تحقیق بہت بڑا کام ہے۔ کسی علم، کسی فن یا کسی فنکار پر سچائی کی تلاش کا دوسرا نام تحقیق ہے۔ المیہ یہ ہے کہ فنِ تاریخ گوئی میں تو تحقیق کا کام ہوا ہی نہیں ہے نہ ہی اس پر تحقیق کی ضرورت سمجھی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ فن ترقی بھی نہیں کر سکا۔ قطعاتِ تاریخ کہنے والے تو ہیں مگر قطعاتِ تاریخ کے محاسن و معائب پر بے باک نقاد اپنے تنقیدی مضامین و مقالات تحریر کریں تو یہ فنِ مردہ، زندہ بھی ہو سکتا ہے اور ترقی کی راہ پر گامزن بھی ہو سکتا ہے۔ اس اہم مقصد کے لئے راقم الحروف نے اردو ادب کے عظیم شاعر استاد ناسخ لکھنوی کے قطعاتِ تاریخ کا انتخاب کیا ہے:۔

☆ ناسخ لکھنوی نے ۱۱۹۵ھ مطابق ۱۷۸۰ء میں مرزا محمد رفیع (ابن مرزا محمد شفیع) سودا لکھنوی کی وفات پر کہا:

از وحشت آبادِ دنیا — رفت بخلد رفیع سودا
گفتم سالِ وفاتش ناسخ — "شاعرِ ہندوستاں واویلا"[۱]
۹۵ ہجری ۱۱

☆ ۱۲۱۶ ہجری مطابق ۱۸۰۱ء عیسوی میں آپ کے والد شیخ خدا بخش کا انتقال ہوا:

والد من زیں جہاں رحلت نمود — یا الٰہ العالمیں مغفور باد
گشت ناسخ! سالِ تاریخِ وفات — "بارسولِ ہاشمی محشور باد"[۲]
۱۶ ہجری ۱۲

☆ ۱۲۲۱ ہجری مطابق ۱۸۰۶ء عیسوی شاہ عالم بادشاہ کی وفات پر یہ تاریخ کہی:

ختم شد سلطنتِ حضرتِ تیمور امروز — کرد ملکِ عدم آبادشہِ کشورِ ہند
سالِ تاریخ پئے رحلتِ شاہِ عالم — گفت دل "زیر زمیں بادشہِ کشورِ ہند"
۲۱ ہجری ۱۲

۱۔ کلیاتِ ناسخ ص ۳۷۵ ۲۔ تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ ص ۱۹۲

صاحب تذکرۂ درفشاں نے لکھا ہے کہ اس قطعہ میں ردیف نہایت خوبی کے ساتھ لائی گئی ہے۔ واقعی اہلِ نظر بھی اس امر کی تعریف کریں گے۔ نیز عدد صرف ''زیرِ زمیں بادشہِ کشورِ ہند'' کے شمار کئے گئے ہیں۔ ''گفت دل'' کے نہیں۔

۹۵ ہجری ۱۱

☆ ۱۲۲۵ ہجری مطابق ۱۸۱۰ عیسوی میں شیخ قلندر بخش، جرأت دہلوی کی وفات پر یہ قطعۂ تاریخ کہا:

جب میاں جرأت کا باغ دھر سے گلشنِ فردوس کو جانا ہوا

مصرعِ تاریخ ناسخ نے کہا ''ہائے ہندوستان کا شاعر مُوا'' [۱]

۲۵ ہجری ۱۲

☆ اسی سال یعنی ۱۲۲۵ھ میں میر تقی میر کا بھی انتقال ہوا۔ تو ناسخ نے یہ قطعہ تاریخ نذرِ ادب کیا:۔

شُد زجہاں میر مُحمّد تقی آہ زہے مہرِ اہلِ جہاں

ناسخ تاریخ وفاتش نوشت ''وادیلا مُرد شہِ شاعراں'' [۲]

۲۵ ہجری ۱۲

☆ ۲۰، شعبان ۱۲۲۷ ہجری مطابق ۱۸۱۲ عیسوی میں تحسین علی خان خواجہ سرا کا انتقال ہوا۔ ناسخ نے تاریخ کہی۔ مادہ تاریخ یہ ہے:

''شعبانِ شب ستم'' (۳)

۲۷ ھ ۱۲

۱۔ تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ ص ۱۹۲

۲۔ کلیات ناسخ ص ۳۶۷ (قطعہ کے تیسرے اور چوتھے مصرعے کے نقل کرنے میں فاضل مقالہ نگار سے غالباً سہو ہوا ہے، یہ دونوں مصرعے خارج از وزن ہیں)۔ (ادارہ)

۳۔ ماخوذ حاشیہ ۳۲: مقالہ ''نواب وزیر علی خان آصف جاہ اور دہم کی غیر مطبوعہ مثنوی'' از ڈاکٹر اکبر حیدری مطبوعہ سہ ماہی ''اردو'' جلد ۵۷۔ ص ۱۹۳۔ بحوالہ دیوان ناسخ غیر مطبوعہ۔ راجہ صاحب محمد آباد

''تحسین علی خاں کا شمار ممتاز خواجہ سراؤں میں ہوتا ہے۔ ان کی بنائی ہوئی یادگار مسجد چوک لکھنو میں موجود ہے۔ جو ۱۲۰۵ھ میں تعمیر کی گئی تھی۔ ''مسجد تحسین علیت'' اس کی تاریخ، مسجد کے دروازے پر موجود ہے''۔ (بہ روایت ڈاکٹر اکبر حیدری) راقم الحروف نے ''مسجدِ تحسین علیت'' کے اعداد نکالے تو ۱۱۵۵ برآمد ہوئے۔ جبکہ تعمیرِ مسجد ۱۲۰۵ ہجری میں ہونا ڈاکٹر اکبر حیدری نے لکھا ہے۔ موجودہ حالت میں اس تاریخ میں ۵۰ عدد کی کمی ہے۔ یہ کس طرح پوری ہوگی۔ واللہ علم۔ یہ کس کی نکالی ہوئی ہے۔ اس کے بارے میں بھی ڈاکٹر صاحب نے کچھ نہیں لکھا۔ اب آیئے ناسخ کی کہی ہوئی تاریخ وفات تحسین علی خاں (خواجہ سرا) ''شعبانِ شب ستم'' کی طرف اس مادہ تاریخ کے نیچے ۱۲۲۷ عدد لکھے ہیں۔ جبکہ ۱۲۲۵ عدد حاصل ہوتے ہیں۔ یعنی ۲ عدد کم ہیں۔ شاید ناسخ سے شمار میں سہو ہوا ہو۔ (کمال)

☆ ۱۲۳۳ ہجری مطابق ۱۸۱۷ عیسوی میں ایک مسجد تعمیر ہوئی۔ تعمیرِ مسجد کی تاریخ ناسخ کہی:۔

بہر سالِ بنائے مسجد — فکر کردند جملہ اہلِ زمیں
کز سرِ آسماں ندا آمد — "سجدہ گاہِ محدثین است ایں"[۱]

۱۲ ہجری ۳۲
\+ ۱
۱۲ ہجری ۳۳

☆ ۱۲۳۳ ہجری مطابق ۱۸۱۷ عیسوی میں فرزند مرزائی بیگ کی تاریخِ ولادت کہی:

کرد خالق عطا بہ مرزا ایم — پُر ز خوشتر بشہرِ ذی الحجہ
سالِ تاریخ ایں فرح ناسخ — شد محرّر "بشہرِ ذی الحجہ"

۱۲ ہجری ۳۳

☆ ۱۲۳۴ ہجری مطابق ۱۸۱۸ عیسوی میں مرزا آسمان قدر کے فرزند کی ولادت پر آپ نے تاریخ کہی:

جو مرزا آسماں قدر، آسماں قدر — ز خالق یافت پُرِ ماہ طلعت
پے سالِ ولادت طبع ناسخ — بگفتا۔ "کوکب بُرجِ شرافت"

۱۲ ہجری ۳۴

☆ ۱۲۳۵ ہجری مطابق ۱۸۱۹ عیسوی میں ناسخ بخار میں مبتلا ہوئے۔ جب بخار سے صحت پائی تو ناسخ نے اپنی صحت یابی پر مندرجہ ذیل تاریخ نکالی:

"رفت تپ نوبہ من"[۲]

۱۲ ہجری ۳۵

☆ ۱۲۳۵ ہجری مطابق ۱۸۱۹ عیسوی میں ناسخ پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ اس موقعہ پر آپ قتل ہونے سے بال بال بچ گئے اس موقعہ پر بھی آپ نے تاریخ کہی:۔

"گنم شکرِ خدا"

۱۲ ہجری ۳۵

۱۔ اس تاریخ میں "سرِ آسماں" کا اشارہ کر کے "آسماں" کے الف کا ایک عدد جمع کر کے تاریخ حاصل کی ہے۔

۲۔ ماخوذ از مضمون مختار الدین آرزو، بعنوان "غالب کی تاریخ گوئی" مطبوعہ "ادبی دنیا"، مارچ ۱۹۴۰ عیسوی۔ بحوالہ آبِ حیات مرتبہ محمد حسین آزاد

☆ ۱۲۳۵ ہجری مطابق ۱۸۱۹ عیسوی ہی میں ہمایوں بادشاہ کے غسل صحت کے حوالے سے ''ادبی دنیا'' میں مختار الدین آرزو نے ناسخ کی یہ تاریخ بھی لکھی ہے:۔

''شُود صحت ہمایوں و مبارک''

۱۲ ہجری ۳۵

(مطبوعہ ''ادبی دنیا'' مارچ ۱۹۴۰ عیسوی۔ بحوالہ آبِ حیات)

☆......حکیم مہدی کی معزولی کا مصرعہ تاریخ ناسخ نے ۱۲۳۵ ہجری میں یہ کہا:

کاشو برائے پختنِ شلغم ''گریختہ'' (۱)

۱۲۳۵ ہجری

☆ ۱۸۲۲ عیسوی۔ ۱۲۳۸ ہجری ناسخ نے چاند گرہن کی تاریخ کہی۔ یہ گرہن ۱۴ تاریخ کو ہوا تھا۔

از خسوف ایں شب چہاردہم | در نظر ہائے شد شب تیرہ
سالِ تاریخ خامۂ ناسخ | زد رقم ''وائے شد شب تیرہ''

۳۸ ہجری ۱۲

☆ ۱۲۴۱ ہجری/ ۱۸۲۵ عیسوی میں نواب فقیر محمد خاں گویا کا نعتیہ دیوان (جو مطبع منشی نول کشور بمقام کان پور، بماہ نومبر ۱۸۸۸ء مطابق ۱۳۰۶ ہجری میں بار ششم طبع ہوا)۔ مکمل کئے جانے کی تاریخ کہی:۔

ترتیب کی تاریخ جو ناسخ نے طلب کی | بولا، کہ ''یہ دیوان ہے گلستانِ فصاحت'' (۲)

۴۱ ہجری ۱۲

☆......اسی دیوانِ گویا کے اتمام (۱۲۴۲ ہجری/ ۱۸۲۶ عیسوی) کی ناسخ نے ایک اور تاریخ کہی:

سالِ اتمام و سنہ ترتیبش | گفت دل۔ ''ہست کتابِ دلکش'' (۳)

۴۲ ہجری ۱۲

☆......ایک قطعۂ تاریخ دیوانِ گویا کی تکمیل کا ۱۲۴۲ ہجری میں اور بھی کہا ہے:

ہر ایک بحرِ دیوانِ گویا ہے دُرخیز | نہ یوں بے بہا پائے دریا نے موتی

۱۔ اس تاریخ میں ناسخ نے صرف ایک لفظ سے تاریخ نکالی ہے جو ایک خاص صنعت ہے۔ سالِ مطلوبہ ۱۲۳۵ ہجری صرف ''گریختہ'' سے متخرج ہوتا ہے۔

۲۔ دیوانِ گویا ص ۱۰۱/۱۰۲۔

۳۔ دیوانِ گویا

یہ تاریخِ ترتیبِ دیواں ہے ناسخ "پروئے ہیں لڑیوں میں گویا نے موتی" (۱)

۴۲ ہجری ۱۲

☆......۱۲۴۳ ہجری مطابق ۱۸۶۷ عیسوی میں غازی الدین حیدر (شاہِ لکھنؤ) کی وفات پر ناسخ نے شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ کے مصرعے سے غازی الدین حیدر کی وفات کی تاریخ نکالی ہے:

گشت تاریخ مصرعِ استاد "اے بسا آرزو کہ خاک شُدہ" (۲)

۴۳ ہجری ۱۲

☆......۱۲۴۴ ہجری/۱۸۶۸ عیسوی میں آصف جاہ (والئی دکن) کی وفات ہوئی۔ ناسخ اس موقعہ پر قطعہ تاریخ کہتے ہیں:

دلا نواب آصف جاہ مغفور ازیں دارِ فنا شُد ہائے افسوس
ندا آمد پئے تاریخ از غیب "دکن تاریک شُد اے وائے افسوس" (۳)

۴۴ ہجری ۱۲

☆......۱۲۴۵ ہجری/۱۸۲۹ عیسوی میں آپ کے ایک شاگرد خواجہ وزیر کا فرزند تولد ہوا تو ناسخ نے نومود کی ولادت پر کہا:۔

"صبح طالع شُد برآمد آفتاب" (۴)

۴۵ ہجری ۱۲

☆......۱۲۴۸ ہجری مطابق ۱۸۳۲ عیسوی میں حکیم مہدی پر شاہی عتاب ہوا۔ جن کی تنخواہ ایک ہزار روپیہ تھی جو بحکم شاہی نصف (پانچ سو) کردی گئی۔ بدقسمتی نے اسی سال پھر ان کو عتاب کا نشانہ بنایا اور پھر تنخواہ آدھی (ڈھائی سو) کردی گئی اسی سال پھر شاہی ناراضگی ہوئی اور پھر آدھی تنخواہ کم کردی گئی اور اب وہ سوا سو روپیہ ماہوار کے تنخواہ دار رہ گئے۔ ناسخ نے اس کی تاریخ حرفِ مفرد (ح) سے حاصل کی جوان کی طباعی وندرتِ فکر کی آئینہ دار ہے۔ ناسخ کی وہ نادر تاریخ یہ ہے:۔

۱۔ از دیوانِ گویا، ص ۱۰۳
۲۔ از تذکرۂ دُرفشاں مرتبہ مہر تقوی، ص ۹۵۷
۳۔ از تذکرۂ دُرفشاں مرتبہ مہر تقوی جے پوری، ص ۹۵۷
۴۔ از غرایب الجمل، ولا حیدر آبادی

از حائے حکیم ہشت برگیر سہ مرتبہ نصف نصف کم کن (۱)

☆......۱۲۴۸ ہجری میں کنور جسونت سنگھ پروانہ (پسر راجہ بنی بہادر) کی وفات ہوئی تو ناسخ نے تاریخ کہی:۔

از مردنِ پروانۂ جاں سوختہ شمع بزم اہلِ سخن ہائے بُمرد
تاریخ چنین رقم نمودم ناسخ ''پروانہ بُمرد شمع ہم روئے بُمرد'' (۲)
۴۸ ہجری ۱۲

☆......نواب فقیر محمد خان گویا نے ''انوارِ سہیلی کا اردو ترجمہ ''بستانِ حکمت'' کے نام سے کیا۔ جو ۱۲۵۴ ہجری میں طبع ہوا۔ ناسخ نے تاریخ طباعت نکالی:۔

پے سالِ تاریخِ اتمام ناسخ خرد، گفت، ''بستانِ سیراب حکمت'' (۳)
۵۴ ہجری ۱۲

☆......۱۲۴۳ ہجری مطابق ۱۸۲۷ عیسوی میں کسی دودھ پیتی ہوئی بچی کی وفات پر صنعتِ صوری و معنوی میں تاریخ کہی:۔

زیں جہاں رفت باِیّامِ رضاعت افسوس قرۃ العین امرالامرائے عادل
یافتہ مصرعِ تاریخِ وفاتش ناسخ ''شنبہ و بست و دوم بود ربیع الاوّل'' (۴)
۴۳ ہجری ۱۲

۱۔ ''حرف ح کے عدد جُمل ۸ ہیں۔ اس کو نصف کیا تو ۴ ہوئے۔ پھر آدھا کیا تو ۲ رہ گئے، تیسری بار پھر آدھا کیا تو ایک رہ گیا۔ اب ان چاروں کو اس سطر میں برابر اور بالترتیب لکھا جائے تو ۱۲۴۸ ہوتے ہیں جو سند واقعہ کے مطابق ہے''۔
(از غرائبُ الجُمل ۔ ولا حیدر آبادی)

۲۔ دیوانِ دوم ناسخ، ص ۲۴۲

۳۔ تذکرۂ دُرفشاں مرتبہ مہر تقوی بے پوری

۴۔ مندرجہ بالا تاریخ میں ''شنبہ و دوم ربیع الاول'' سے صوری انداز پر وفات کا دن، تاریخ اور مہینہ ظاہر ہوتا ہے اور معنوی انداز سے شنبہ (۲۵۷) + و (۶) + بست (۴۶۲) + و (۶) + دوم (۵۰) + بود (۱۲) + ربیع (۲۸۲) + الاوّل (۶۸) = ۱۲۴۳ کے الفاظ سے بھی تاریخ نکلتی ہے۔ لہٰذا یہ تاریخ صنعت صوری و معنوی دونوں صنعتوں میں ہے۔

وقتی یہ حسابِ ظلم کب ہے   تاریخ کے حافظے میں سب ہے

برطانوی جہاز ہیکٹر کا کمانڈر ہاکنز (Hawkins) وسط اپریل ۱۶۰۹ء میں مغل شہنشاہ جہانگیر کے دربار میں آگرہ پہنچا۔ (۱) مئی ۱۶۰۹ء میں انگریزوں کی درخواست پر برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کو تجارتی مراعات مل گئیں۔ بعد میں سرتھامس رو کی چار سالہ کوششوں (۱۶۱۵۔۱۶۱۹) سے ایسٹ انڈیا کمپنی برصغیر پاک و ہند میں قدم جمانے میں کامیاب ہوگئی۔ فروری ۱۶۱۹ء میں جب سرتھامس رو برطانیہ واپس گیا تو اس وقت سورت، آگرہ، احمد آباد اور بروچ میں انگریزوں نے صنعتی منصوبے مکمل کر لیے تھے اور مقامی تجارت اور معیشت پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔ ۱۶۶۱ء میں چارلس دوم نے پرتگیزوں سے جزیرہ بمبئی اپنی ملکہ کے جہیز میں وصول کیا۔ (۲) پرتگیز ۱۴۹۸ء سے واسکوڈے گاما کی آمد سے کالی کٹ کے راستے برصغیر کی تجارت میں دخیل تھے۔ چارلس دوم نے ۲۳ ستمبر ۱۶۶۸ء کو جزیرہ بمبئی ایسٹ انڈیا کمپنی کو پٹے پر دے دیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۶۳۹ء میں مدارس کی بندرگاہ ہندو راجہ وینکٹ دری نائک سے پٹے پر لے لی۔ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی تجارت کے پردے میں ہوس ملک گیری کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ ان کا مرکزی خیال یہ تھا کہ تجارت صرف اُسی صورت میں کی جاسکتی ہے جب ہاتھ میں تلوار بھی ہو۔

فرخ سیئر نے جب مغلیہ سلطنت کی باگ ڈور سنبھالی تو انگریزوں کو کُھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ فرخ سیئر ایک خطرناک بیماری کا شکار ہوگیا۔ ڈاکٹر ہملٹن نے اس کا علاج کیا۔ اس کے صلے میں فرخ سیئر نے انگریزوں کو حیدر آباد، گجرات، بنگال اور بہار میں آزادانہ تجارت کی اجازت دے دی۔ انگریز تاجروں نے مغل حکمرانوں کے باہمی مناقشوں کو ہوا دی۔ انگریز تاجروں نے ہندوستانی سیاست میں مسلسل گہری دلچسپی لینا شروع کردی (۳)۔ انگریز تاجروں نے تجارتی کوٹھیوں کو فوجی قلعوں میں تبدیل کرلیا۔ بے حسی کا عفریت ہر طرف منڈلا رہا تھا۔ مقامی باشندے جو آلامِ روزگار کے مہیب بگولوں کی زد میں تھے، انگریزوں کے ملازم ہوگئے۔ وہ لوگ جنھیں ناموس وطن اور دفاع وطن کے لئے جان کا نذرانہ پیش کرنا چاہیے تھا وہ استعماری قوتوں کا آلۂ کار بن گئے۔ برطانوی استعمار کو برصغیر پاک و ہند میں کچھ ایسے ابن الوقت عناصر مل گئے جن کی بے غیرتی، بے ضمیری اور ملک دشمنی نے آزادی کو ناقابل تلافی

نقصان پہنچایا۔غداروں نے برعظیم پاک و ہند کی جائز حکومت کی پیٹھ میں چھرا گھونپ کر انتہائی گھٹیا مقاصد کی خاطر قومی اور ملی مفادات کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔اجلاف، ارزال اور سفہا کی پست ذہنیت اور انتہائی خودغرضیوں نے مسلمانوں کی حکومت کو زوال کی بھینٹ چڑھایا۔اس طرح ایک عظیم الشان سلطنت کو راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا (۴) اب کوئی علاقہ بھی انگریزوں کی غاصبانہ دسترس سے محفوظ نہ تھا۔ ۱۷۵۷ء کو واٹسن نے سراج الدولہ کو لکھا:

"I will kindle such a flame in your country which all the water in the ganges shall not be able to extinguish"

۲۳ جون ۱۷۵۷ء کو پلاسی کے میدان میں سراج الدولہ کو میر جعفر کی غداری کے باعث انگریزوں سے شکست ہوئی اور وہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔میر جعفر اب حکمران تھا اور بنگال پر اس کے بیٹے میرن کا قبضہ تھا۔یہ لوگ چام کے دام چلا رہے تھے۔میرن کے بارے میں کلائیو نے ایک خط میں ہیسٹنگز کو اپنے تاثرات سے اس طرح آگاہ کیا!!!

''مجھے اکثر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ آج نہیں تو کل یہ نوجوان کتا اپنے باپ کو نیچا دکھانے کی کوشش کرے گا۔میں کئی بار اس بوڑھے احمق (میر جعفر) کو سمجھا چکا ہوں کہ اپنے رشتہ داروں کے ہاتھ میں زیادہ اختیار و طاقت نہ دے''۔ (۶)

برصغیر پاک و ہند کی سیاست میں انگریزوں کا عمل دخل مسلسل بڑھتا چلا جا رہا تھا، مقامی حکمران بے بس کٹھ پتلی بنا دیے گئے۔ایک سازش کے ذریعے مقامی حکمرانوں کو بے دست و پا کر دیا گیا۔ اس کا اندازہ کلائیو کے ایک خط سے لگایا جا سکتا ہے جو اس نے اورم (ORME) کے نام لکھا تھا:

"I am possessed of volumes of materials for the continuation of your history, in which will appear fighing, tricks, chicanery, intrigues, politics and the Lord knows what."

ہم پر بھی کیسے کیسے لوگ حکومت کر گئے۔اکبر کی جہالت بھگتی تحریک کو آگے بڑھانے کا باعث

ہوئی۔ اُردو ادب پر اس کے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ اردو شاعری میں حریت فکر کی روایت کو استحکام نصیب ہوا۔ اصلاحی تحریکوں نے اس عرصے میں موثر اور فعال کردار ادا کر کے عوامی شعور و آگہی کی بیداری میں اہم کردار ادا کیا۔ ارضی و ثقافتی حوالے سے تہذیب و ثقافت کی بقا کو مطمحِ نظر بنایا گیا۔ ٹائن بی نے کہا تھا:

"تمدن کی بالیدگی اور ترقی کے لیے ضروری ہے کہ تمام چیلنجوں کا بھرپور جواب دیا جائے کیونکہ جو تمدن چیلنج کا جواب نہ دے سکے وہ ختم ہو گئے"۔ (۱۲)

اردو شاعری میں ۱۸۵۷ء کے بعد فکر و نظر کا ایک جہان تازہ جلوہ گر دکھائی دیتا ہے۔ اس سانحے نے باضمیر ادیبوں کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ انہوں نے ضمیر کی للکار کو اپنے فکر و فن کی اساس بنا دیا۔ آج بھی ان کے یہ خیالات ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں کہ حالات خواہ کتنے ہی مایوس کن ہوں ادیب کو قوم کے ضمیر کا کردار ادا کرتے ہوئے جبر کا ہر انداز مسترد کر دینا چاہیے۔ در کسریٰ پر صدا کرنے والوں کو جان لینا چاہیے کہ ان کھنڈروں میں گرد و غبار کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اردو شعرا نے ہر ظالم پہ لعنت بھیجنا اپنا منشور قرار دیا اس کی چند مثالیں پیشِ خدمت ہیں:

مرزا اسد اللہ خان غالب (۱۷۹۶ء ـ ۱۸۶۹ء)

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے ... کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

گلشن میں بندوبست برنگ دگر ہے آج ... قمری کا طوق حلقۂ بیرون در ہے آج

آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ ... تار نفس، کمند شکار اثر ہے آج

اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل ... سیلاب گریہ درپئے دیوار و در ہے آج

رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجئے ... کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہئے

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالبؔ ... خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہئے

بہادر شاہ ظفر (۱۷۷۵ء۔۱۸۶۲ء) نے ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے تجربات کو نہایت پُر درد انداز میں اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔

کر گئی ویراں چمن باد خزاں گل جھاڑ کے	بس قفس میں بیٹھ رہ پر اپنے بلبل جھاڑ کے
کہہ دو غنچے سے نہ پھولے مشتِ زر پر باغ میں	آخرش جانا ہے یاں سے ہاتھ بالکل جھاڑ کے

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے اثرات معاشرتی زندگی کے رگ و پے میں اس طرح سرایت کرتے چلے جا رہے ہیں کہ آج استعمار کے خلاف نفرت یہاں کے باشندوں کی جبلت بن گئی ہے۔ برطانوی استبداد نے نوے سال تک یہاں کے مجبور عوام پر عرصہ حیات تنگ کیے رکھا آج تک اس کے خلاف نفرت کے جذبات برقرار ہیں۔ پنڈرل مون نے لکھا ہے:

> "واقعی یہ دور برطانوی راج کا سنہری زمانہ ہے۔ ملکہ وکٹوریہ کی بے حد عزت کی جاتی تھی۔ ہر کوئی اُس کا احترام کرتا تھا۔ اگر آج بھی تمہیں امرتسر جانے کا اتفاق ہو تو وہاں ملکہ کا بت نصب ملے گا، جس کی ناک توڑ دی گئی ہے"۔ (۱۳)

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی ٹھہرے ہوئے پانی میں ایک پتھر کے مانند تھی۔ اس کے بعد لوگوں کے دلوں میں جبر کے خلاف بغاوت کا جو شعلہ بھڑکا وہ ہر دور میں شعلۂ جوالا بن کر سامنے آتا رہا۔ اُردو شاعری کو اس واقعہ نے ایسے شعور سے متمتع کیا جس کے اعجاز سے جبر کے ایوانوں کے در و دیوار ہلا دینے کا ولولہ پیدا ہو گیا۔ بقول ظفر علی خان۔

حاشا کہ اس قدر نہیں سارے جہاں کی لُوٹ	جتنی ہے ایک سال میں ہندوستاں کی لوٹ
گلچیں کے دستِ شوخ کی گیرائیوں کو دیکھ	سُنبل کی لوٹ، لالہ کی لوٹ، ارغواں کی لوٹ
اُجڑے ہوئے چمن میں ہے بلبل کا آشیاں	منظور انہیں ہے شاید اب اس آشیاں کی لوٹ
مغرب کے رہزنوں کی نظر میں ہے رات دن	مشرق کے نقد امن و متاع اماں کی لوٹ

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد محکومی، غلامی اور محرومی کے خلاف جدوجہد کا آغاز ہو گیا۔ ظالم و سفاک، موذی اور مکار استحصالی طبقے کی ریشہ دوانیوں کے خاتمے کی کوششیں تیز تر ہو گئیں۔ ظلم کے خلاف سینہ سپر ہونے کی روش نے قوت پکڑی۔ سلطانی جمہور کے لیے ہر قربانی دینے کا عزم توانا صورت میں دیکھا گیا۔ یہ بات واضح ہے کہ ۱۸۵۷ء کے حالات نے برصغیر پاک و ہند کے باشندوں کو

آزادی کی تڑپ عطا کردی۔ برصغیر پاک و ہند میں آزادی کو سلب کر کے انگریزوں نے یہاں مہیب جنگل کا ماحول پیدا کر دیا تھا۔ اس عرصے میں ایک مہیب سناٹا تھا۔ دشتِ مصیبت میں کوئی کسی کا پرسانِ حال نہ تھا۔ استعماریت کی بادِ سموم نے امیدوں کا گلشن اجاڑ کے رکھ دیا۔ نوے سالہ غلامی کا منحوس دور آج بھی ہمیں اپنے روز و شب کا احتساب کرنے کا احساس دلاتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جذبۂ حریت کسی نہ کسی شکل میں دلوں میں موجزن چلا آ رہا ہے۔ اس کی عملی صورت ۱۹۴۷ء میں رونما ہوئی جب برطانوی سامراج کا طلسم سامری کافور ہو گیا۔ انگریزوں کی مسلط کردہ آمریت اور ابلیسی نظام اپنی بساط لپیٹنے پر مجبور ہو گیا۔

۱۸۵۷ء کے بعد کا عرصہ عہد غلامی کے ہولناک تجربات پر محیط ہے۔ اس عرصے میں بے یقینی کے مسموم اثرات کا قلع قمع کرنے میں یہاں کے دانشوروں نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ یہ کاروانِ ہستی اس قدر تیز گام ہے کہ یہاں سکوں محال ہے۔ چلنے والے آگے نکل جاتے ہیں اور جامد و ساکت رہنے والے کچلے جاتے ہیں۔ زندگی اور کائنات کا ہر ذرہ حرکت اور تغیر کی زد میں ہے۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی نے جہد للبقا کو مہمیز کیا۔ آج بھی اسی جذبے کو بروئے کار لانے کی اشد ضرورت ہے۔ علامہ اقبالؒ نے لکھا ہے۔

کھول کر کہیے تو کرتا ہے بیاں کوتاہی　　سخت باریک ہیں امراضِ اُمم کے اسباب
دیکھتے ہیں فقط اک فلسفۂ روباہی　　دینِ شیری میں غلاموں کے امام اور شیوخ
قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللہی　　ہو اگر قوتِ فرعون کی در پردہ مرید

گزشتہ ڈیڑھ صدی سے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے اثرات کم نہیں ہو سکے۔ آج بھی ہم سر سید احمد خاں اور اُن کے نامور رفقائے کار کی ان خدمات کا ذکر کرتے ہیں جو انہوں نے آزمائش کی اس گھڑی میں قومی فلاح کے جذبے سے سرشار ہو کر انجام دیں۔ مولانا حالی نے کہا۔

اُمت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے　　اے خاصۂ خاصانِ رسل وقت دعا ہے

شبلی نعمانی نے ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے تباہ کن حالات اور اُس کے مسموم اثرات

سے بچنے کے لیے لوگوں کو جھنجھوڑا

اے مدعیانِ حُبِ اسلام — حجروں میں تو اب کرو نہ آرام
دعوے ہیں تو کچھ ہنر دکھاؤ — ہمت کے قدم ذرا بڑھاؤ
انداز عرب اگر ہے خُو میں — باقی ہے وہ جوش اگر لہو میں
موقع ہے یہی ہنر دکھاؤ — جو کہتے تھے آج کر دکھاؤ

مآخذ

1. H.H. Dodwell: The Cambridge History of India, 1929, Page, 77.

(۲) محمود خان منگلوری: تاریخ جنوبی ہند پبلشرز یونائیٹڈ، لاہور، بار دوئم ۱۹۴۷ء، صفحہ ۲۳۹۔

3. A.P. Newton: The British Empire, Since 1783.

(۴) اشتیاق حسین قریشی ڈاکٹر: برعظیم پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ، صفحہ ۲۲۵۔

5. H.H. Dodwell: The cambridge History of India, Page 146.

(۶) ای۔پی۔مون: وارن ہیسٹنگز اور انگریزی راج، اردو ترجمہ سید محمد اولاد علی گیلانی، صفحہ ۴۳۔

7. H.H. Dodwell; The Cambridge History of India, Page 151.

(۸) حسن ریاض سید: پاکستان ناگزیر تھا، جامعہ کراچی، اشاعت سوم، جون ۱۹۸۲ء، صفحہ ۱۵

(۹) ایضاً صفحہ ۱۹

(۱۰) فرمان فتح پوری ڈاکٹر: ہندی اُردو تنازع نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد

(۱۱) رئیس احمد جعفری: بہادر شاہ ظفر اور اُن کا عہد، کتاب منزل، لاہور، اشاعت اول صفحہ ۵۰

(۱۲) بحوالہ مبارک علی ڈاکٹر: تاریخ اور فلسفہ تاریخ فکشن ہاؤس، لاہور، اشاعت اوّل ۱۹۹۳ء صفحہ ۲۱۷

(۱۳) پنڈرل مون: ہندوستان میں اجنبی راج، مکتبہ جدید، لاہور صفحہ ۴۳۔

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد

محاورے کا لسانی مطالعہ

انسان فطرتاً تنوع پسند واقع ہوا ہے۔ ماحول کی یکسانیت اور کیفیت کی یک رنگی سے اس کی طبیعت زیادہ دیر ہم آہنگ نہیں رہ سکتی۔ وہ کوشش و کاوش سے اس یکسانیت اور یک رنگی کے جمود کو توڑ کر ہمہ رنگی کی کشادہ فضا میں داخل ہو جاتا ہے، جہاں اس کی طبیعت مظاہر کی رنگا رنگی سے شاد کام ہوتی ہے۔ تعقل اور تدبر کے اوصاف اس کے خمیر میں گندھے ہوئے ہیں اور نطق اس کا وسیلۂ اظہار ہے۔ یوں انسان عقل و شعور کے بل بُوتے پر احساسات، خیالات، تجربات، مشاہدات اور جذبات کی تشکیل کرتا ہے اور نطق کے وسیلے سے انھیں اظہار کا لباس پہنا دیتا ہے۔ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کا ذوق تنوع پسندی اس کے خیالات و احساسات اور تجربات و مشاہدات میں نت نئی صورتیں پیدا کرتا ہے اور انہیں رنگا رنگ اسالیب کے ذریعے ظاہر کرنے کا جتن کرتا ہے۔ اس کوشش و کاوش کے نتیجے میں نئے نئے لسانی پیکر اور اسالیب وجود میں آتے ہیں۔ محاورہ بھی اس نوع کا ایک لسانی سانچہ ہے۔ ذیل میں محاورے کے مفہوم، دائرہ کار، تشکیل، ضرورت، افادیت اور اہمیت کا اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان غلط فہمیوں کی نشان دہی کی جارہی ہے جو محاورے کے ضمن میں رواج پا چکی ہیں اور اب جنھیں مسلمات کی حیثیت حاصل ہے۔

محاورہ کے لغوی معنی باہمی گفتگو، بات چیت، مکالمہ، بول چال، اور سوال جواب کے ہیں۔ صاحب فرہنگ آصفیہ نے عادت، لپکا، مہارت، مشق اور ابھیاس کو بھی محاورے کے ذیلی معانی میں شامل کیا ہے۔ (۱) محاورہ بہ بطور اصطلاح اگرچہ عام فہم اور سادہ دکھائی دیتا ہے مگر حقیقت میں دیگر اصطلاحات لسان و ادب کی طرح پیچیدہ اور مشکل اصطلاح ہے۔ اس کی پیچیدگی اور اشکال کا بنیادی سبب یہ ہے کہ علمائے لسان و ادب نے اس کی تعریف میں روزمرہ کو بھی شامل کر دیا ہے۔ یوں محاورہ بطور اصطلاح روزمرہ کے لیے بھی مستعمل ہے اور الفاظ کے اس مجموعے کے لیے بھی جو کہ اپنے مجازی معنوں میں استعمال ہوتا ہو۔ روزمرہ

بذاتِ خود ایک لسانی اصطلاح ہے اور بول چال کی اس زبان کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ جس میں لفظ اپنے حقیقی یا وضعی معنوں میں برتے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس محاورہ مجازی اسلوبِ اظہار کی نمائندگی کرتا ہے اور اس میں مصادر، افعال اور اسما اپنے حقیقی معنوں کی بجائے مجازی اور غیر وضعی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ یوں حقیقت اور مجاز کو یک جا کرنے سے محاورے کی اصطلاح غیر واضح اور پیچیدہ بن گئی ہے۔ ذیل میں علمائے ادب و لسانیات کی چند ایسی تعریفیں پیش کی جاتی ہیں جن سے اس پیچیدگی اور اشکال کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

۱۔ مولانا الطاف حسین حالی

''اصطلاح میں خاص اہلِ زبان کے روزمرہ یا بول چال یا اسلوبِ بیان کا نام محاورہ ہے۔ پس ضرور ہے کہ محاورہ تقریباً دو یا دو سے زیادہ الفاظ میں پایا جائے۔ کیوں کہ مفرد الفاظ کو روزمرہ یا بول چال یا اسلوبِ بیان نہیں کہا جاتا۔ بخلاف لغت کے اس کا اطلاق ہمیشہ مفرد الفاظ پر یا ایسے الفاظ پر جو بمنزلہ مفرد کے ہیں، کیا جاتا ہے۔ مثلاً پانچ اور سات دو الفاظ ہیں جن پر الگ الگ لغت کا اطلاق ہو سکتا ہے مگر ان میں سے ہر ایک کو محاورہ نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ دونوں کو ملا کر جب پان سات بولیں گے تب محاورہ کہا جائے گا، یہ بھی ضرور ہے کہ وہ ترکیب جس پر محاورہ کا اطلاق کیا جائے قیاسی نہ ہو بلکہ معلوم ہو کہ اہلِ زبان اس کو اسی طرح استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً اگر پان سات یا سات آٹھ یا آٹھ سات پر قیاس کر کے چھ آٹھ یا آٹھ چھ یا سات نو بولا جائے گا تو اس کو محاورہ نہیں کہیں گے، کیوں کہ اہلِ زبان کبھی اس طرح نہیں بولتے یا مثلاً بلاناغہ پر قیاس کر کے اس کی جگہ بے ناغہ، ہر روز کی جگہ ہر دن، روز روز کی جگہ دن دن یا آئے دن کی جگہ آئے روز بولنا ان میں سے کسی کو محاورہ نہیں کہا جائے گا کیوں کہ یہ الفاظ اس طرح اہلِ زبان کی بول چال میں نہیں آتے...... کبھی محاورہ کا اطلاق خاص کر ان افعال پر کیا جاتا ہے جو کسی اسم کے ساتھ مل کر اپنے حقیقی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں...... محاورہ کے جو معنی ہم نے اوّل بیان کیے ہیں وہ عام یعنی دوسرے میں بھی شامل ہیں لیکن دوسرے معنی پہلے معنی سے خاص ہیں۔ پس جس ترکیب کو پہلے معنوں کے لحاظ سے محاورہ کہا جائے گا اس کو دوسرے معنوں کے لحاظ سے بھی محاورہ کہا جائے

گا۔لیکن یہ ضرور نہیں کہ جس ترتیب کو پہلے معنوں کے لحاظ سے محاورہ کہا جائے اس کو دوسرے معنوں کے لحاظ سے بھی محاورہ کہا جائے۔ مثلاً تین پانچ کرنا (یعنی جھگڑا ٹنٹا کرنا) اس کو دونوں معنوں کے لحاظ اپنے حقیقی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی معنوں میں بولا گیا ہے۔لیکن روٹی کھانا یا میوہ کھانا یا پان سات یا دس بارہ وغیرہ صرف پہلے معنوں کے لحاظ سے محاورہ قرار پاسکتے ہیں، دوسرے معنوں کے لحاظ سے نہیں۔ کیوں کہ یہ تمام ترکیبیں اہلِ زبان کی بول چال کے موافق تو ضرور ہیں مگر ان میں کوئی لفظ معنوں میں مستعمل نہیں ہوا''۔(۲)

اس طویل اقتباس سے مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:

(الف) محاورہ دو یا دو سے زیادہ الفاظ میں پایا جاتا ہے اور اس کا اطلاق مفرد لفظ پر نہیں ہوتا۔

(ب) محاورے میں الفاظ کی ترتیب و ترکیب قیاسی نہیں ہوتی بلکہ اہلِ زبان کی ترتیب و ترکیب کے مطابق ہوتی ہے۔

(ج) بلاناغہ، روز روز، آئے دن، ہر روز وغیرہ از روئے معنیِ اوّل محاورے ہیں۔

(د) کبھی محاورہ کا اطلاق ان افعال پر کیا جاتا ہے جو اسم کے ساتھ مل کر مجازی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔

(ہ) پہلے معنی کے لحاظ سے یعنی لفظوں کا مجموعہ جو اہلِ زبان کی ترتیب کے مطابق ہو جس کو محاورہ کہا جائے گا، دوسرے معنوں (مجازی) کے لحاظ سے بھی وہ محاورہ ہوسکتا ہے۔

(و) یہ ضروری نہیں کہ جس ترتیب کو پہلے معنوں کے لحاظ سے محاورہ کہا جائے اس کو دوسرے معنوں کے لحاظ سے بھی محاورہ کہا جائے۔

مندرجہ بالا نتائج کے تجزیے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مولانا حالی کے نزدیک محاورہ کی اصطلاح دوہرے معنی کی حامل ہے۔ایک معنی حقیقی جب کہ دوسرے مجازی ہیں۔گویا محاورہ کی اصطلاح میں روزمرہ بھی شامل ہے۔مولانا حالی کا یہ کہنا نہایت مغالطہ انگیز ہے کہ ''کبھی محاورہ کا اطلاق ان افعال پر بھی کیا جاتا ہے جو اسم کے ساتھ مل کر مجازی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں''۔ ''کبھی'' کے استعمال سے یہ متبادر ہوتا

ہے کہ اکثر یا ہمیشہ ایسا ہونا ثابت نہیں۔ جب کہ حقیقت اس کے سراسر اُلٹ ہے۔ اسماو افعال کے وہ مرکبات جو مجازی معنوں میں مستعمل ہوں ہمیشہ محاورہ کہلاتے ہیں۔ مولانا حالی کے اقتباس سے جو نتائج برآمد ہوئے ہیں ان میں سے آخری دو نتیجے معنوی طور پر ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اصل میں یہاں مولانا سے سہو ہوا ہے۔ ان کا مقصود یہ تھا کہ دوسرے معنوں کے لحاظ سے جس کو محاورہ کہا جائے گا وہ پہلے معنوں کے اعتبار سے بھی محاورہ کہلائے گا لیکن یہ ضروری نہیں کہ پہلے معنوں کے مطابق جو محاورہ ہے وہ دوسرے معنوں کے مطابق بھی محاورہ ہو۔ اس حوالے سے انہوں نے جو مثالیں پیش کی ہیں وہ درست اور واضح ہیں۔

۲۔ سید احمد دہلوی

''اصطلاحِ عام، روزمرہ، وہ کلمہ یا کلام جسے چند ثقات نے لغوی معنی کی مناسبت یا غیر مناسبت سے کسی خاص معنی کے واسطے مختص کر لیا ہو جیسے حیوان سے کل جاندار مقصود ہیں مگر محاورے میں غیر ذوی العقول پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اور ذوی العقول کو انسان کہتے ہیں''۔ (۳)

سید احمد دہلوی نے بھی محاورے کے اصطلاحی معنی میں روزمرہ کو شامل رکھا اور حقیقی یا مجازی دونوں طرح کے کلمہ یا کلام کو محاورہ قرار دیا ہے۔ مولانا حالی کے برعکس سید احمد دہلوی مفرد لفظ (کلمہ) پر بھی محاورے کے اطلاق کو صحیح سمجھتے ہیں۔ ان کی پیش کردہ مثال میں بھی مفرد لفظ ہی بہ طور محاورہ استعمال ہوا ہے۔

۳۔ شان الحق حقی

''وہ فعلِ مرکب جو مخصوص معنی میں یا بلاتغیر اسی ترکیب کے ساتھ اہلِ زبان میں مستعمل ہو''۔ (۴)

حقی صاحب کی پیش کردہ تعریف بھی پیچیدہ اور قدرے مبہم ہے۔ اس تعریف میں موجود ''یا'' کے باعث یہ پیچیدگی جنم لے رہی ہے۔ موجودہ صورت میں یہ تعریف کسی حتمی نتیجے تک نہیں پہنچاتی۔ ''مخصوص معنی'' سے مراد مجازی معنی ہیں ''یا'' کہ استعمال کی وجہ سے یہ اشتباہ پیدا ہوتا ہے کہ عام معنی (حقیقی) کا حامل فعل مرکب بھی محاورہ کہلاتا ہے۔ قصہ مختصر یہ کے محاورہ اور روزمرہ اگرچہ آپس میں گہرا تعلق رکھتے ہیں اور محاورے کی تشکیل میں روزمرہ سب سے اہم اور بنیادی کردار ادا کرتا ہے تاہم اس گہرے تعلق کے باوجود دونوں کا دائرۂ کار الگ الگ ہے اور ایک دوسرے سے مختلف۔ روزمرہ کا تعلق الفاظ کے حقیقی اور وضعی

معنوں سے ہے جب کہ اس کے برعکس محاورہ الفاظ کے غیر حقیقی یا مجازی معنوں سے متعلق ہے۔ اس لئے محاورے کے اصطلاحی مفہوم میں روزمرہ کو شامل نہیں کیا جانا چاہیے کیوں کہ اس طرح محاورہ کا درست تعین ممکن نہیں رہتا۔ اصطلاحاتِ روزمرّہ و محاورہ کی مؤثر تفہیم کے لئے سیّد قدرت نقوی کی یہ تعریف پیش نظر رہنا چاہیے۔

> ''اگر الفاظ اپنے لغوی معنی میں مستعمل ہوں اور ترتیب و ترکیب اہلِ زبان کے استعمال کے مطابق ہو تو اس کو اصطلاحاً روزمرہ کہا جاتا ہے اور اگر مجازی معنوں میں مستعمل ہوں تو محاورہ، گویا محاورے میں بنیادی بات یہی ہے کہ اس کے الفاظ اہلِ زبان کی ترتیب و ترکیب کے مطابق مجازی معنی میں استعمال کیے گئے ہوں''۔ (۵)

محاورہ کس وقت تشکیل پاتا ہے؟ اس نوع کے بہ ظاہر آسان سوالوں کے جوابات حددرجہ مشکل ہوتے ہیں۔ مختلف لسانی پیکروں کی تشکیل کا صحیح وقت متعین کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ تاہم یہ بات واضح ہے کہ لفظ جب کثرتِ استعمال کے باعث بے رنگ اور پژمردہ ہوجاتے ہیں تب افرادِ معاشرہ نئے لفظوں کی تشکیل کر کے زبان کے ذخیرۂ لفظیات کو بڑھاتے ہیں اور ساتھ ساتھ پُرانے لفظوں کو نئے لسانی پیکروں میں ڈھال کر اظہار و بیان کے نئے اسالیب وضع کرتے ہیں۔ یہیں سے مجاز کا سفر آغاز ہوتا ہے اور محاورہ اس سفر کا اوّلین سنگِ میل ہے۔ کیوں کہ محاورہ لسانی اعتبار سے روزمرّہ کے بہت قریب ہوتا ہے۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بے محل نہیں کہ محاورہ یا دیگر اسالیبِ بیان کی تشکیل شعراء و ادبا اور لسانیات و قواعد کے ماہرین نہیں کرتے بلکہ ان کی تعمیر و تشکیل میں عام افرادِ معاشرہ حصہ لیتے ہیں اور یہ کام شعوری اور لاشعوری دونوں سطحوں پر رواں دواں رہتا ہے۔ یہ بات بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ محاورے کی تشکیل کے وقت اظہار و بیان کے دیگر وسیلے جیسے تشبیہ، استعارہ، کنایہ وغیرہ سرگرمِ عمل نہیں ہوتے۔ کیوں کہ ایک تو محاورے کو ان پر زمانی تقدم حاصل ہے اور دوسرا یہ کہ اگر بیان کے یہ اسالیب پہلے سے موجود ہوں تو محاورے کا جواز باقی نہیں رہتا۔ اس لیے علمائے ادب و لسان کا یہ اصرار کہ محاورہ کی بنیاد تشبیہ، استعارہ یا کنایہ (۶) پر ہے، محلِ نظر

ہے۔اس میں شبہ نہیں کہ ان تمام لسانی پیکروں کے ساتھ محاورے کا ایک لسانی رشتہ ہے لیکن یہ لسانی پیکر کسی صورت میں بھی اس کی تشکیل میں اساسی کردار ادا نہیں کرتے۔ پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی کا یہ کہنا کہ محاوروں کی بنیاد استعارے پر نہیں بلکہ تمثیل پر ہوتی ہے، زیادہ قرینِ حقیقت ہے۔(۷) ڈاکٹر گوپی چند نارنگ بھی اس معاملے میں پنڈت کیفی کے ہم نوا دکھائی دیتے ہیں۔ (۸)

محاورہ کے اجزائے ترکیبی میں مصادر، افعال اور اسما شامل ہیں اور انہی کے اشتراک سے محاورہ وجود میں آتا ہے۔ تکنیکی اعتبار سے محاورے کی مندرجہ ذیل چار اقسام ہوتی ہیں:

۱۔ ایسے مرکبات جن میں مصادر اور ان کے مشتقات (فعل) مجازی معنوں میں استعمال ہوں، جیسے: غم کھانا، دل جلانا وغیرہ۔

۲۔ ایسے مرکبات جن میں اسم مجازی معنوں میں استعمال ہو، جیسے: ہوا ہو جانا، لٹو ہونا وغیرہ۔

۳۔ ایسے مرکبات جن میں اسم اور فعل دونوں مجازی معنوں میں استعمال ہوں، جیسے خاک چاٹنا، لہو رُلانا وغیرہ۔

۴۔ ایسے مرکبات جو دو افعال سے مل کر بنے ہوں یعنی فعلِ مرکب۔ جیسے: بھاگ اٹھنا، ٹوٹ پڑنا وغیرہ۔

آخر الذکر قسم کے محاورات علماء لسان وادب کے نزدیک محاورے میں شامل نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے مرکبات میں محاورے کی حقیقی روح موجود ہوتی ہے؛ بقول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ:

> ''اگر چہ ہمارے علماء نے مرکب افعال کو محاوروں میں شامل نہیں کیا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ دو آزاد فعلیہ اجزا سے مل کر بننے والے مرکب افعال دراصل ایک طرح کے محاورے ہیں جو کثرتِ استعمال سے خاص معنی دینے لگتے ہیں مثلاً چل پڑنا، آ جانا وغیرہ''۔ (۹)

محاورہ اظہار و بیان کی بے رنگی کو ختم کر کے اُسے تازگی اور شگفتگی کے ذائقے سے سرشار کرتا ہے کیوں کہ اس کی تشکیل و تعمیر کا مقصدِ اولیٰ یہی ہے۔ محاورے کی شمولیت سے کلام اور گفتگو کی پژمردگی ختم ہو

جاتی ہے اور تازہ کاری کی ایک نئی فضا خلق ہوتی ہے جو زبان کے بولنے والوں میں اظہار و بیان کی نئی صلاحیتیں پیدا کر دیتی ہے۔ محاورہ محض تازہ کاری کی فضا تخلیق نہیں کرتا بلکہ مختلف النوع کیفیات اور مفاہیم کو نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ کلام میں شامل کر دیتا ہے۔ کفایتِ لفظی میں اظہار و بیان کا اور کوئی وسیلہ محاورے کی ہم سری نہیں کرسکتا۔ رشید حسن خاں نے محاورے کو غیر تخلیقی چیز قرار دیتے ہوئے اسے معنی کے لحاظ سے نہایت درجہ متعین اور محدود قرار دیا ہے؛ ان کے بقول:

''محاورہ وہ ہے جسے ہم جامد استعارہ کہتے ہیں کہ استعارہ جو اپنی حرکت کھو دیتا ہے اور معنوی پائیداری اور رنگارنگی کھو دیتا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ لفظ جب اپنی حرکت اور معنوی تہوں کو کھو دیتے ہیں اور ایک خاص مفہوم میں جم کر رہ جاتے ہیں، تب محاورے بنتے ہیں...... اگر کوئی شخص زیادہ محاورے استعمال کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس کے ہاں تخلیقی الفاظ کی اسی نسبت سے کمی ہوگی اور کسی کتاب میں محاورے زیادہ استعمال ہوئے ہیں تو یہ بہت خوبی کی بات نہیں ہوگی، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کا بہت سا حصہ تحریر کا، گھیر لیا اُن لفظوں نے جو اپنے معنی کے لحاظ سے نہایت درجہ متعین اور محدود ہیں۔ ان میں پھیلاؤ، وسعت اور تہ داری نہیں ہے جو الفاظ کا خاصہ ہونا چاہیے''۔ (۱۰)

محاورے کو جامد استعارہ اور غیر تخلیقی چیز قرار دینا اور اس کے معنی کو حد درجہ محدود و متعین ٹھہرانا، درست لسانی اپروچ نہیں۔ اگر محاورہ غیر تخلیقی چیز ہے اور اس کے معنی نہایت محدود و متعین ہیں تو پھر اس کی تعمیر و تشکیل کا کیا جواز ہے؟ محاورے کا صدیوں سے متواتر و مسلسل استعمال کیا اس کی تخلیقی صلاحیت کا منہ بولتا ثبوت نہیں؟ اگر محاورہ غیر تخلیقی چیز ہوتی تو کتنا عرصہ رواج پذیر رہتی؟ اس میں شُبہ نہیں کہ محاورہ ایک خاص مفہوم کا حامل ہوتا ہے لیکن اس کا ہنر مندانہ استعمال اس میں معنی کی کئی پرتیں اور تہیں وضع کر دیتا ہے جو عام لفظ کے ذریعے حاصل نہیں ہوسکتیں۔ ڈاکٹر امیر اللہ شاہین نے درست کہا ہے کہ:

''محاورے کے اندر معنی کی مختلف تہیں اور پرتیں ہوتی ہیں اور تہیں جن کے ساتھ

محاورہ سینکڑوں سالوں کے تجربے کے بعد سامنے آیا، اس کو نظر انداز کر دینا مناسب نہ ہوگا"۔ (۱۱)

محاورے کے ہُنر مندانہ استعمال سے اس کی تخلیقی شان ظاہر ہوتی ہے اور مفاہیم کی کئی پرتیں الفاظ کے مختصر سے مجموعے میں سمٹ آتی ہیں۔ محاورے کا کمال یہ ہے کہ وہ پڑھنے اور سُننے والوں میں کیفیات کی وہ ہمہ رنگی پیدا کر دیتا ہے جو کلام کرنے والے نے اس میں ملفوف کر رکھی ہے۔ مثال کے طور پر غالب کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

گدا سمجھ کے وہ چُپ تھا، مری جو شامت آئے　　اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کیلئے

غالب نے دو محاوروں "شامت آنا" اور "قدم لینا" کے ہُنر مندانہ اور تخلیقی استعمال سے کتنی تفصیلات کو دو مصرعوں میں قید کر لیا ہے۔ اب اس شعر کو پڑھنے والے ان محاوروں کے وسیلے سے ان تمام تفصیلات اور کیفیات سے کما حقہ، واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ محاورات کے استعمال نے بیان کو جو خوب صورتی اور چُستی عطا کی ہے وہ اس پر مستزاد ہے۔ یہ بات درست ہے کہ محض محاورے کے استعمال کا شوق محاورے کے تخلیقی استعمال کا ضامن نہیں اور نہ اس سے کوئی لسانی یا ادبی فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے مگر یہ بات صرف محاورے کے ساتھ خاص نہیں؛ کوئی بھی لسانی پیکر جیسے تشبیہ، استعارہ، علامت، کنایہ وغیرہ اگر شوقِ فضول کے ہاتھوں کھلونا بن جائے تو اس کے استعمال کی غرض و غایت، دم توڑ دیتی ہے۔ تخلیقی استعمال ہی ان پیکروں میں روح پیدا کرتا ہے اور انہیں زندگی اور توانائی کے جوہر سے متصف ٹھہراتا ہے۔

رشید حسن خاں محاورے کو شاعری کے لیے بے کار اور نثر کے لیے کار آمد خیال کرتے ہیں اُن کا خیال ہے کہ: "محاورہ نثر کے کام کی چیز زیادہ ہے، نظم کے کام کی چیز کم، کیوں کہ نظم میں اصل چیز ہوتی ہے لفظ کا تخلیقی استعمال اور محاورہ ایک غیر تخلیقی چیز ہے"۔ (۱۲)

محاورہ نثر میں ہو یا نظم میں تخلیق کے حُسن کو جلا بخشتا ہے۔ اُردو زبان محاورات کے اعتبار سے امیر ورثے کی مالک ہے بلکہ پنڈت دتا تریہ کیفی کے بقول تو اُردو میں محاورات کا ذخیرہ شاید تمام زبانوں

سے زیادہ ہے۔ (۱۳) یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ اُردو کا قدیم شعری سرمایہ نثری سرمائے سے مقدار میں کئی گنا زیادہ ہے۔ ہمارے شعراء نے محاورے کے مسلسل و متواتر استعمال سے شعروادب کو معنی کی نئی لطافتوں سے ہم کنار کیا ہے۔ دبستانِ داغ سے وابستہ شعراء اور لکھنوی شعراء کے ہاں محاورے کے صناعانہ اور ہُنر مندانہ استعمال کے باوجود یہ کہنا کہ محاورہ شاعری کے لیے زیادہ کارآمد نہیں، شاعری اور خود محاورے کے ساتھ زیادتی ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا یہ خیال مبنی بر حقیقت معلوم ہوتا ہے کہ اُردو میں محاورے کے کثرت اور تموّل کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ غزل کے شاعروں نے بہ طورِ خاص محاورے کے استعمال کو استحکام بخشا ہے اور اسے توسیع دی ہے۔ (۱۴)

محاورہ تہذیب کی کوکھ سے پھوٹتا ہے۔ لوگوں کے انفرادی اور اجتماعی رویے، میلانات، عادتیں، عقاید و نظریات اور معمولات اس کے آئینے میں ہمیشہ جلوہ گر رہتے ہیں۔ محاورے کے مطالعے سے ہم قدیم ترین تہذیبوں اور معاشرتوں کے احوال سے آشنا ہوتے ہیں۔ محمد حسن عسکری محاورے کے تہذیبی خال وخط بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''محاوروں میں اجتماعی زندگی کی تصویریں، سماج کے تصورات اور معتقدات، انسان، فطرت اور کائنات کے متعلق سماج کا رویہ، یہ سب باتیں جھلکتی ہیں۔ محاورے صرف خوب صورت فقرے نہیں، یہ تو اجتماعی تجربے کے ٹکڑے ہیں جن میں سماج کی پوری شخصیت بستی ہے۔ محاورہ استعمال کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے انفرادی تجربے کو اجتماعی تجربے کے پس منظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ محاورہ فرد کو معاشرے میں گُھلا دیتا ہے۔ تخصیص میں تعیم اور تعیم میں تخصیص پیدا کرتا ہے۔ محاورہ ہمیں بتاتا ہے کہ فرد کے ایک تجربے کو اس کے دوسرے تجربوں سے، فرد کے تجربے کو سماج کے تجربے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ محاورہ جزو نہیں رہنے دیتا اُسے کُل میں ڈبوتا ہے''۔ (۱۵)

محاورہ پُر تاثیر اور معنی خیز لسانی پیکر اور وسیلۂ اظہار ہے۔ اس کا مؤثر اور عمدہ استعمال کلامِ نظم و

نثر کی رعنائی و دل آویزی اور گفتگو کی چاشنی و دل کشی کا اظہاریہ ہے۔ یہ تہذیب و تمدن کا امین ہے۔ اور عہدِ رفتہ کو حال اور مستقبل سے ملانے اور جوڑنے کا ایک بہترین ذریعہ۔

حواشی و حوالے

۱۔ مولوی سیّد احمد دہلوی؛ فرہنگِ آصفیہ (جلد چہارم)؛ لاہور، اُردو سائنس بورڈ؛ طبعِ دوم ۱۹۸۷ء، ص ۳۰۳۔

۲۔ مقدمہ شعر و شاعری؛ لکھنؤ، انوار المطابع؛ س ن، ص ۱۷۵.....۱۷۳۔

۳۔ فرہنگِ آصفیہ (جلد چہارم)؛ ص ۳۰۳۔

۴۔ فرہنگِ تلفظ؛ اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان پاکستان؛ طبعِ اوّل ۲۰۰۲ء؛ ص ۸۴۵۔

۵۔ لسانی مقالات (حصہ اوّل)؛ اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان پاکستان؛ اوّل، جون ۱۹۸۸ء؛ ص ۲۳۱۔

۶۔ دیکھیے:

(۱)۔ مولانا حالی: ''اکثر محاورات کی بنیاد اگر غور سے دیکھا جائے تو استعارہ ہی پر ہوتی ہے......کنایہ بھی زیادہ تر محاورات ہی کے ضمن میں استعمال ہوتا ہے''۔ مقدمہ شعر و شاعری) ص ۱۷۲۔

(۲) سیّد قدرت نقوی: ''ہر محاورے میں بنیادی اور معنوی حیثیت سے مجاز، تشبیہ، استعارہ اور کنایہ کا ہونا ضروری ہے''۔ لسانی مقالات (حصہ اوّل)؛ ص ۲۳۳۔

۷۔ کیفیہ؛ دہلی؛ ۱۹۴۲ء؛ ص ۱۷۹۔

۸۔ اُردو زبان اور لسانیات؛ لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز؛ ۲۰۰۷ء؛ ص ۵۹۔

۹۔ ایضاً؛ ص ۵۷۔

۱۰۔ لسانی مذاکرات (مرتب: شیما مجید)؛ عنوان: اُردو زبان میں محاورے کی اہمیت؛ اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان پاکستان؛ اوّل ۲۰۰۶ء؛ ص ۳۰۲۔

۱۱۔ ایضاً: ص ۳۰۳۔

۱۲۔ ایضاً: ص ۳۱۳۔

۱۳۔ کیفیہ؛ ص ۱۷۹۔

۱۴۔ اُردو زبان اور لسانیات؛ ۶۰۔

۱۵۔ مجموعہ؛ لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز؛ ۲۰۰۰ء؛ ص ۲۸۸۔

محمود اختر سعید

اوّلیاتِ اُردو ادب۔۔۔ تحقیقی مطالعہ

اُردو کا آغاز وارتقاء:

عام خیال یہ ہے کہ ہندوستان میں پہلے سے آباد اور نئے آنے والوں کے آپس میں میل جول اوران کی بولی جانے والی مقامی بولیاں اور زبانیں جن میں فارسی' ہندی' بھاشا اور پنجابی کے امتزاج سے ایک نئی زبان وجود میں آئی' دکن کے حکمرانوں نے اس کی سرپرستی کی' حتیٰ کہ یہی زبان سرکاری اور دفتری زبان قرار پائی۔ باہم بول چال کے ساتھ ساتھ تحریر وتصنیف میں بھی نئی زبان کا رواج عام ہوگیا۔ رفتہ رفتہ اسی زبان نے ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے 'اردو' نام پایا۔

بعد ازاں ہمارے صوفیہ کرام، جن کا مشن رشد وہدایت تھا، انہوں نے اس عوامی زبان میں مختلف رسائل اور مثنویاں لکھیں۔ ان بزرگوں میں شیخ عین الدین گنج العلمؒ، خواجہ محمد گیسودرازؒ، سید محمد عبداللہ الحسینی، شاہ میراں شمس العشاقؒ، میرالدین جانم اور شاہ امین الدین اعلیٰ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں اُردو زبان کے آغاز وارتقاء کے سلسلہ میں ماہرین اور محققین کے مختلف نظریات ہیں۔ ہر مکتبہ فکر اپنے اپنے نظریہ کے ثبوت میں مختلف دلائل میں پیش پیش ہے۔ ان کا زور بیان یہاں آکر ختم ہوتا ہے کہ اُردو زبان نے ان کے علاقہ وخطہ میں جنم لیا۔ بعد ازاں سنٹرل ہندوستان، دہلی، لکھنؤ اور لاہور میں ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی یہ ہر دلعزیز زبان کے مرتبہ پر فائز ہوئی۔ ماہرین لسانیات بھی تاحال کسی ایک نظریے پر متفق نہ ہوسکے۔ قیاس آرائیوں، مفروضوں اور تحقیق وجستجو کا یہ سلسلہ تاحال جاری ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ کسی بھی زبان کے آغاز وارتقاء کا عمل دنوں، مہینوں پر مشتمل نہیں ہوتا، بلکہ سالہا سال اور صدیوں کے جغرافیائی، سیاسی، تہذیبی اور تمدنی، علمی وادبی عوامل اس میں کارفرما ہوتے ہیں۔ ایسے عوامل کے زیر اثر ہی اُردو زبان وجود میں آئی ہوگی۔ باقی رہے ماہر لسانیات کے نظریات اور تخمینے، یہ بھی بہت حد تک صداقت کے قریب ہیں۔

ماہر لسانیات گریرسن بھی ابتداء میں اسی نظریہ کا حامی تھا۔ بعدازاں اس نے اپنے نظریہ میں تبدیلی کر لی تھی۔ اور کہا کہ اُردو زبان۔ ہندی، فارسی اور عربی کے میل جول سے نہیں بنی بلکہ اُردو ایک قدیم بولی سے ترقی کر کے زبان کے مرتبے پر فائز ہوئی۔

محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' میں یہ نظریہ پیش کیا کہ برج بھاشا اور فارسی کے میل جول سے اُردو وجود میں آئی، اور ہریانہ کے علاقہ میں پروان چڑھی۔ حافظ محمود شیرانی نے بڑی عرق ریزی سے اُردو اور پنجابی کی صرف ونحو کا مطالعہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ پنجابی اور اُردو میں ماں بیٹی کا رشتہ ہے۔ اُردو زبان نے پنجابی الفاظ کی ایک کثیر تعداد کو اپنے اندر سمویا ہے اور اس کی صرف ونحو کا ڈھانچہ بھی پنجابی سے اخذ کیا ہے۔ علاوہ ازیں بے شمار حوالے اور ثبوت فراہم کر کے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اُردو نے پنجابی سے جنم لیا ہے۔ اس لئے اُردو زبان کی جنم بھومی پنجاب ہے، دہلی نہیں۔ انہوں نے محمد حسین آزاد کے اس نظریے کی بھی نفی کر دی کہ اُردو نے برج بھاشا سے جنم لیا کیونکہ اُردو اور برج بھاشا کی صرف ونحو میں زمین وآسماں کا فرق ہے جبکہ اُردو اپنی پیشرو پنجابی زبان سے بہت قریب ہے۔ بہت سے نقاد حافظ شیرانی صاحب کے اس نظریے سے متفق نہیں، جن میں ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

نصیر الدین ہاشمی نے ''دکن میں اُردو'' میں یہ نظریہ پیش کیا کہ اُردو نہ دہلی میں پیدا ہوئی اور نہ پنجاب میں بلکہ اس کا آغاز وارتقاء دکن میں ہوا۔ ان کے دلائل یہ ہیں کہ ''آغاز اسلام سے قبل بھی عربوں کے، دکن کے عربوں سے سماجی تعلقات تھے۔ قبول اسلام کے بعد عربوں کے تعلقات دکن سے اور زیادہ مقبول ہو گئے۔ عرب، موپلے اور دکن کے مقامی لوگوں کے میل جول سے اُردو زبان وجود میں آئی۔ بعد میں یہ زبان شمالی ہند پہنچی''۔ مگر ماہرین لسانیات کو اُن کے اس نظریہ سے اختلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دکن کی مقامی زبان دراوڑی ہے، جبکہ عربی 'سامی' نسل سے تعلق رکھتی ہے، اس لئے دونوں کے ملاپ سے اُردو نہیں بن سکتی۔ دوسرے یہ بھی حقیقت ہے کہ 'موپلوں' کی قلیل تعداد اتنی بڑی لسانی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتی۔

سید سلیمان ندوی نے یہ نظریہ پیش کیا کہ محمد بن قاسم نے جب سندھ پر حملہ کیا تو اس کے فوجی

سندھ اور ملتان میں رہ گئے تھے۔ مقامی آبادی اور عربوں کے اختلاط سے اُردو زبان پیدا ہوئی۔ مولانا سید سلیمان ندوی 'نقوشِ سلیمانی' میں رقم طراز ہیں "...... ہندوستان کی متعدد زبانوں کا پہلا گہوارہ سندھ ہے۔ جس کو آج ہم اُردو کہتے ہیں' اس کا ہیولا اسی وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا......"۔ جبکہ محققین کو سید سلیمان ندوی کے اس نظریہ سے بھی اختلاف ہے، ان کے نزدیک عربی اور سندھی کے ملاپ سے جدید سندھی زبان تو معرضِ وجود آئی جبکہ اُردو کا ارتقاء سندھ میں نہیں ہوا۔

رام بابو سکسینہ (صاحب 'تاریخ ادب اُردو) مولانا محمد حسین آزاد کی اس تحقیق سے متفق ہیں اس سلسلہ میں سکسینہ کہتے ہیں: "۔۔۔ پس یہ خیال کرنا' جیسا کہ میر امّن اور بعض قدیم اُردو شاروں کا خیال معلوم ہوتا ہے کہ اُردو ایک مخلوط زبان ہے جس میں وہ سب زبانیں داخل ہیں جو کسی زمانے میں دلی کے بازاروں میں بولی جاتی تھیں 'صحیح نہیں ہے۔ یہ ضرور سچ ہے کہ لشکر یا بازار سے اس زبان کی نشو ونما اور ترقی کو اس قدر تعلق ضرور تھا کہ اس کا نام ہی 'اُردو' ہو گیا۔ جس کو زبان ترکی میں "لشکر" کہتے ہیں۔ زبان میں ہنوز پختگی نہیں آئی تھی اور وہ بحالت تشکیل تھی۔ اجنبی الفاظ اور جملوں کو قبول کر لینے کا مادہ اس میں بہت تھا، جیسا کہ اب بھی ہے۔ اس زمانہ میں انگریزی تقلید میں اردو کو "ہندستانی" کہتے ہیں۔ مگر یہ لفظ ہماری رائے میں گو باعتبارِ لفظ صحیح ہو' مگر حقیقت میں صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس لفظ میں مشرقی ہندی مغربی ہندی اور راجستانی ہندی سب شامل ہیں۔ اسی طرح ہمارے خیال میں برج بھاشا کو اُردو کا ماخذ قرار دینا جو کہ مغربی ہندی کی ایک شاخ ہے اور جیسا کہ مولانا محمد حسین آزاد نے بھی سمجھا ہے، صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس وجہ سے کہ برج بھاشا سے جو متھرا اور اس کے جوانب میں بولی جاتی تھی۔ گو اس بھاشا سے جو اطراف دہلی میں بولی جاتی تھی، بہت مشابہت رکھتی ہے۔ مگر پراکرت کی ایک علیحدہ شاخ ہے اور یہی شاخ یعنی دلی بھاشا ہمارے خیال میں اُردو زبان کی اصل سمجھی جا سکتی ہے۔۔۔"

اُردو کے ارتقاء کے بارے میں ماہرین لسانیات گروہوں میں منقسم ہیں۔ مولوی عبدالحق۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر شوکت سبزواری وغیرہ کو یقین ہے کہ اُردو نے دہلی کے گرد ونواح کی بولی سے ترقی کر کے زبان کا درجہ حاصل کیا۔ موجودہ دور میں

عین الحق فرید کوٹی نے اپنی کتاب ''اُردو زبان کی قدیم تاریخ'' میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اُردو آریائی زبان نہیں اور اس نے سنسکرت سے نہیں بلکہ دراوڑی زبان سے استفادہ کیا ہے، اس لیے وہ موہنجودڑو سے اِس کا تعلق بتاتے ہیں۔

''اُردو زبان کا مولد''، کے عنوان سے گذشتہ سالوں میں کئی مضامین نظر سے گزرے۔ جن میں سے تین چار بہت اہم ہیں:

۱۔ اُردو کا مولد۔ از ڈاکٹر وفا راشدی (روزنامہ جنگ، مڈویک میگزین) ۱۲۔ نومبر ۱۹۸۶ء

۲۔ اُردو کا مولد سندھ۔ از خدا بخش امیر (روزنامہ جنگ) ۲۸۔ جنوری ۱۹۸۷ء

۳۔ اُردو کا مولد۔ از معین قریشی (روزنامہ جنگ) ۱۸۔ مارچ ۱۹۸۷ء

۴۔ اُردو کا مولد کہاں ہے؟۔ از شیخ عزیز۔ (روزنامہ حریت، کراچی) ۲۰۔ مارچ ۱۹۸۷ء

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اُردو زبان کے آغاز و ارتقاٗ کے بارے میں ہمارے محقق اور ماہر لسانیات تا حال کسی ایک نظریے پر متفق نہیں ہوئے۔ مندرجہ بالا مضامین میں بھی فاضل مضمون نگاروں نے مختلف دلائل سے اپنے اپنے نظریہ کی وضاحت کی ہے۔ ڈاکٹر وفا راشدی نے اُردو کا مولد سندھ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کا اساسی ماخذ تحقیقِ سلیمانی ہے۔ انہوں نے اپنے مقالے میں اہم نکتے اٹھائے ہیں، پیر حسام الدین راشدی بھی مولانا سید سلیمان ندوی کے نظریہ کے قائل ہیں جبکہ علامہ نیاز فتح پوری اور مولانا محمود شیرانی دونوں اس بات پر تو اتفاق کرتے ہیں کہ اُردو زبان کا وجود اس زمانے سے ہے جب مسلمان ہندوستان میں آباد ہوئے۔ ڈاکٹر خدا بخش امیر نے وفا راشدی کے نظریہ کی نفی کرتے ہوئے اپنے مضمون میں یہ ثابت کیا ہے کہ اُردو کہیں اور پیدا ہوئی۔ معین قریشی صاحب اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ

> ''......ایک قدیم نظریہ کے مطابق جو سید محمد احمد (مؤلف فرہنگ آصفیہ) نے پیش کیا تھا کہ تقریباً ایک ہزار سال قبل مسیح جب ایران کے حکمرانوں نے ہندوستان کا رُخ کرنا شروع کیا تو انہوں نے اپنی زبان کے الفاظ کا اثر مقامی زبانوں پر ڈالا، نو سو سال قبل ایران کا حکمران ''کیکاؤس'' ہندوستان کے بہت سے حصوں پر قابض تھا''۔

مولوی سیّد محمد احمد لکھتے ہیں ''......اصل میں یہی زمانہ زبانِ اُردو کی بنیاد پڑنے کا پورا پورا زمانہ ہے۔ کیونکہ اس وقت راجہ بھرت تختِ ہند پر جلوہ افروز تھا۔ اور اسی کے عہد میں برج بھاشا اضلاع متھرا نیز ممالکِ مغربی میں اور پوربی بھاشا مشرق میں رائج ہوئی۔ اسی نے زبان اُردو کو اپنی آغوش میں لیا......''

شیخ عزیز اپنے مقالہ ''اُردو کا مولد کہاں ہے؟'' (روزنامہ حریت، کراچی ۲۰۔ مارچ ۱۹۸۷ء) میں لکھتے ہیں:

''...... جہاں تک اُردو زبان کی تاریخ اور ارتقاُ کا تعلق ہے۔ یہ ادبی، لسانی تاریخ کا سب سے بڑا نزاعی مسئلہ رہا ہے، غیر منقسم ہندوستان کے تقریباً تمام خطوں نے اُردو کی جنم بھومی ہونے کا دعویٰ کیا ہے...... تاہم اس سے انکار نہیں کہ اُردو زبان کی اس غیر معمولی ترقی نے ہر خطے کو اس کا مولد ہونے کا داعی کر دیا۔ چنانچہ اس پورے ادبی مباحثے کے دوران ہم دیکھتے ہیں کہ گجرات میں اُردو، دکن میں اُردو، پنجاب میں اُردو، مدراس میں اُردو جیسے مقالات بھی منظرِ عام پر آئے ہیں......''

مزید لکھتے ہیں کہ ''......۱۹ ویں صدی کے اواخر تک اُردو کے متعلق صرف تین نظریات معروف ہو چکے تھے۔ ان میں پہلا نظریہ ''باغ و بہار'' کے مصنف کا ہے۔ انہوں نے دلی کو اُردو کا مولد قرار دیا ہے۔ جن کے مطابق دلی کے بازاروں میں مختلف قوموں کے معجون مرکب کا نام اُردو ہے۔ دوسرا نظریہ ۱۸۸۰ء میں سامنے آیا، جو آبِ حیات کے مصنف محمد حسین آزاد نے دیا۔ ان کے مطابق برج بھاشا، اُردو کی ماں ہے۔ تیسرا نظریہ چارلس لائل کا ہے جو انہوں نے ۱۸۸۰ء کے قریب پیش کیا۔ ان کے مطابق دلی اور میرٹھ کا بالائی دوآبہ کا علاقہ اُردو کا وطن ہے۔ ان کے اس نظریئے کے حامی دوسرے لسانیاتی ماہرین اور اسکالرز بھی ہوئے، جن میں ۱۹۲۷ء میں رام بابو سکسینہ، گریرسن اور گراہم بیلی ہوئے......''

۱۔ بعض ماہرین لسانیات اور محققین جن میں سلیمان ندوی، ڈاکٹر وفا راشدی بھی شامل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اُردو کی اِبتدا سندھ سے ہوئی۔

۲۔ حافظ محمود شیرانی ''پنجاب میں اُردو'' (۱۹۲۸ء) میں یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ پنجاب اُردو زبان کا پہلا گہوارہ ہے۔

۳۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ اُردو کا سرچشمہ پنجابی نہیں بلکہ وہ قدیم زبان ہے، جس سے خود پنجابی زبان نکلی ہے، اور جو کسی زمانے میں تمام شمال مغربی سرحدی علاقوں میں بولی جاتی تھی۔

۴۔ چند ماہرین اُردو کی ارتقائی کڑیوں کو تین نظریات

۱) سامی۔ ۲) پالی۔ ۳) مسلم آریائی نظریہ

پر مبنی قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر شوکت حسین بزواری اپنی کتاب ''اُردو کا ارتقا'' میں اُردو کا ناتا ''پالی زبان'' سے جوڑتے ہیں، مگر سید احتشام کے کہنے کے مطابق مواد کی کمی کی وجہ سے سبزواری صاحب کے دعوی کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اس تمام بحث کو سمیٹتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''......ان دعووں کی حقیقت کچھ بھی ہو ایک بات اس سے ضرور ثابت ہوجاتی ہے اور وہ یہ کہ ان میں سے ہر علاقہ کسی نہ کسی دلیل پر اُردو کی اِبتدا اپنے سے منسوب کرتا ہے اور اس طرح ہر علاقے سے اس کا تعلق قائم ہوجاتا ہے''۔

۵۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی کتاب ''تاریخِ ادب اُردو'' میں فرماتے ہیں:

''......گیارہویں صدی عیسوی سے لے کر سولھویں صدی عیسوی تک یہ زبان جسے ہم آج اُردو کے نام سے پکارتے ہیں، مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دہلی سے نکل کر براعظم کے دور دراز گوشوں تک پہنچ کر سارے براعظم کی لنگوافرانکا بن چکی تھی......''

بہرحال ہر نظریہ کی بنیاد کسی نہ کسی حقیقت پر مبنی ہے۔ لیکن عام خیال یہ ہے کہ جب ۱۶۴۷ء میں شاہجہاں آگرہ چھوڑ کر دہلی پہنچا اور وہاں اُردوئے معلی کا سنگِ بنیاد رکھا۔ یہاں میل ملاپ کے بعد وجود آنے والی زبان نے اتنی سرعت سے ترقی کی منازل طے کیں کہ کچھ ہی عرصے کے بعد یہ 'بولی' سے ادبی زبان کا روپ اختیار کرگئی۔

اُردو زبان کے مختلف نام:

مولانا سیّد سلیمان ندوی کی تحقیق کے مطابق ''......بارہویں صدی ہجری کے اواخر کی

تصنیفات 'تذکرہ نکات الشعراء میر اور ذکرِ میر اور نوطرزِ مرصع تحسین میں یہ نام یعنی 'زبانِ اُردوئے معلّیٰ' اضافت کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ تیرھویں صدی کے اوائل سے کثرتِ استعمال کے سبب یہ اضافت جاتی رہی اور خود زبان کا نام اُردو ہو گیا''۔

پروفیسر شیرانی کا کہنا ہے کہ اضافت کے بغیر یہ 'اُردو' نام بارہویں صدی ہجری کے اخیر ہی سے استعمال میں آ گیا تھا۔ ثبوت میں مصحفیؔ کا یہ شعر پیش کیا ہے۔

خدا رکھے زباں ہم نے سنی ہے میرؔ و مرزاؔ کی　　کہیں کس مُنہ سے ہم اے مصحفیؔ اُردو ہماری ہے

'خدا رکھے' سے ظاہر ہے کہ اس وقت میرؔ و مرزاؔ زندہ تھے۔ اس لئے یہ شعر مصحفی نے ۱۱۹۵ھ سے پہلے کہا ہوگا۔ ''تذکرہ مخزن الغرائب'' میں جو ۱۲۱۸ھ کی تالیف ہے۔ مرزا مظہر جانِ جاناں کے حال میں ہے۔ ''در زبان ہندی کہ مراد از اُردو است' خیلے فصیح و بلیغ بود' فورٹ ولیم کالج کی تصنیفات میں یہ لفظ زبان کے معنوں میں عام طور سے بولا گیا ہے...... (نقوشِ سلیمانی۔ صفحہ ۵۸۔۵۷)

جب مسلمان برصغیر پاک و ہند میں وارد ہوئے، تو انہوں نے یہاں کی دیسی زبان کو 'ہندی' یا 'ہندوی' کا نام دیا۔ قدیم فارسی لغت نویسوں نے بھی دیسی بھاشاؤں کو 'ہندی' یا ہندوی لکھا۔ فارسی کی مشہور فرہنگوں مثلاً 'ادات الفضلاً' 'مفتاح الفضلاً' اور 'دستور لبیان' میں بھی اس زبان کو 'ہندی' لکھا گیا۔ حافظ محمود شیرانی لکھتے ہیں کہ اُردو کا سب سے قدیم نام 'ہندی' یا 'ہندوی' ہے۔ حضرت شاہ شمس میراں جی شمس العشاق (متوفی ۹۰۲ء) نے اپنے رسالہ ''خوش نغز'' میں اس زبان کو 'ہندی' لکھا۔ ملا وجہی نے اپنی کتاب 'سب رس' میں اس زبان کو 'زبانِ ہندوستان' لکھا ہے۔ حضرت امیر خسروؒ نے اُردو کو 'زبانِ دہلوی' کہا ہے۔ اس کے علاوہ موسیقی میں ''ریختہ'' کی اصطلاح بھی وضع کی۔ بعد میں 'ہندی' یا ہندوی گیتوں کو 'ریختہ' کہنے لگے۔ رفتہ رفتہ 'ریختہ' اس زبان کو کہنے لگے جو فارسی، عربی اور ہندوی الفاظ سے مل کر بنی ہو۔

زمانہ قدیم کے صوفیائے کرام مثلاً حضرات نصیر الدین چراغ دہلویؒ، شرف الدینؒ، یحییٰ منیریؒ، اور حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے اس زبان کو 'ہندی' یا 'ہندوی' ہی کہا۔ شعراء اور ادباً بھی اسے 'ہندی' یا 'ہندوی' کہتے تھے۔ مثلاً شاہ میراں شمس العشاق، برہان الدین جانمؒ، جعفر زٹلی، میر اثر اور فضلی وغیرہ۔ اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے ایک خط میں اس زبان کو 'ہندی' لکھا ہے۔ شاہ عبدالقادرؒ نے بھی

اس زبان کو 'ہندی' کہا ہے۔

دراصل ریختہ موسیقی کی ایک اصطلاح تھی اور بعدازاں ہندوی گیتوں کو اور پھر رفتہ رفتہ زبان کو ریختہ کہا جانے لگا۔ مولانا محمد حسین آزاد 'آبِ حیات' میں لکھتے ہیں ''...... چونکہ اس زبان میں الفاظِ پریشاں (بکھرے ہوئے) جمع ہیں، اس لئے اسے 'ریختہ' کہا گیا''۔ جیسا کہ تحریروں سے ظاہر ہے کہ ابتداء میں یہ لفظ اُردو شاعری اور کبھی غزل کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ بعدازاں زبان کو بھی ریختہ کہا جانے لگا صاحبِ 'گلشنِ بے خار' نے اُردو شاعری کو 'ریختہ' کہا ہے۔ غزل اور زبان کے لئے 'ریختہ' غالب کے عہد تک مستعمل تھا۔

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ　　　کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

سعدی کاکوروی (متوفی ۱۵۹۳ء) کا ایک مشہور شعر بھی اسی تائید میں ہے:

سعدیؔ کہ گفتہ ریختہ، درریختہ دُرریختہ　　　شیروشکر آمیختہ، ہم شعر ہے، ہم گیت ہے

پروفیسر حامد حسن قادری فرماتے ہیں ''...... اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بھی شمالی ہند میں اُردو کو ریختہ کہتے تھے......''۔ ریختہ کے بارے میں سیّد سلیمان ندوی 'نقوشِ سلیمانی' میں فرماتے ہیں:

''...... یہ خیال کہ اُس زمانے میں دکن میں اُردو، ریختہ کے نام سے پکاری جاتی تھی' غلط ہے۔ یہ غلطی اکثر مصنفین نے کی ہے۔ یہاں تک کہ خود اُردو سروے کمیٹی کی رپورٹ میں یہ غلطی موجود ہے۔ رپورٹ کے صفحہ گیارہ پر تحریر ہے۔ ''دکن میں اُردو نہ محض پورے طور پر بولی جاتی تھی' بلکہ رفتہ رفتہ ادبی زبان ہوگئی۔ واقعہ یہ ہے کہ دکن میں ولیؔ سے پہلے اُردو کبھی ریختہ کے نام سے نہیں پکاری گئی۔ سب سے پہلے ولیؔ نے اور وہ بھی غالباً سفرِ دہلی یعنی تقریباً ۱۷۰۰ء/۱۲۲۰ھ کے بعد اس لفظ کا استعمال اُردو کیلئے کیا ہے' فرماتے ہیں۔

یہ ریختہ ولیؔ کا جا کر اُسے سنادو　　　رکھتا ہے فکر روشن جو انوریؔ کے مانند

'اُردو' ترکی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی 'لشکر' کے ہیں۔ سب سے پہلے یہ لفظ، زبان کے لئے شاہجہاں کے عہد میں استعمال ہوا جب شاہجہاں ۱۶۴۷ء میں آگرہ چھوڑ کر دہلی پہنچا، قلعے کے قریب لشکر کے لئے ایک بڑی چھاؤنی تعمیر کروائی تو اسے ''اُردوئے معلّٰی'' کا خطاب دیا۔ رفتہ رفتہ وہاں بولی جانے والی زبان کو ''اُردوئے معلّٰی'' کہا جانے لگا۔ بعدازاں صرف 'اُردو' کہنے لگے۔

اُردو کی ابتداء کے بارے میں سب سے پہلے میر امّن دہلوی نے 'باغ و بہار' کے دیباچے میں یہ لکھا کہ "...... دہلی شہر عہد قدیم سے ہندو راجا اور مہاراجوں کا علاقہ رہا ہے۔ ان کی پرجا اپنی بھاشا بولتی تھی۔ جب مسلمان بادشاہ سلطان محمود غزنوی، غوری اور سلاطین وغیرہ یہاں آئے اور اس علاقے کو فتح کیا۔ قطب الدین ایبک نے دہلی کو پایہ تخت بنایا اور اس کے بعد سلطنت مختلف خاندانوں سے ہوتی ہوئی خاندانِ مغلیہ تک پہنچی تو مسلمانوں اور ہندوؤں کے میل جول سے اُردو زبان وجود میں آئی"۔

اسی دور میں اُردو کو زبان کے معنوں میں سب سے پہلے محمد عطا حسین خاں تحسین نے 'نوطرزِ مرصع' میں استعمال کیا۔ لفظ 'اُردو' کے بعد اُردو زبان کی ابتداء کی داستاں بڑی دلچسپ ہے۔ یہ فانوس کی وہ لو ہے، جس کا ہر زاویہ اور ہر پہلو آنکھوں کو بھاتا اور دل کو لبھاتا ہے۔

اُردو نثر کی ابتداء:

اُردو نثر کے بارے میں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ اس کی ابتدا دکن سے ہوئی۔ ابتدا میں چھوٹے چھوٹے مذہبی اور تبلیغی رسالے لکھے گئے جو عموماً ترجمے تھے جو فارسی اور عربی زبانوں سے کئے گئے۔ ان کے بعد دکن کے نثری ادب میں قصے کہانیاں نظر آئی ہیں، مثلاً ملا وجہی کی 'سب رس' (۱۰۴۵ھ) ان کی نمائندہ ہے۔ فضلی کی کربل کتھا اور سودا کا دیباچہ بھی اُردو نثر کے نمونوں میں شمار ہوتا ہے۔ شمالی ہند کی ایک اور نثری کاوش 'نوطرز مرصع' ہے جو فارسی 'قصہ چہار درویش' کا ترجمہ ہے۔ اسے عطا حسین خاں تحسین نے اُردو کا جامہ پہنایا۔

قاضی مشتاق احمد کے مطابق "۔۔۔۔ محمد شاہ کے زمانہ میں فضلی کی 'دہ مجلس' یا 'کربل کتھا' جو ۱۱۴۵ھ میں لکھی گئی تھی، اردو نثر کی پہلی کتاب ہے۔"

ڈاکٹر سید اعجاز حسین کے مطابق اس سے بہت پہلے دکن میں نثر کا وجود ظہور میں آچکا تھا، "شیخ عین الدین گنج العلم کے رسالے سب سے قدیم ہیں۔ شیخ موصوف کا انتقال ۷۹۵ھ میں ہوا۔ افسوس کہ یہ رسالے موجود نہیں ہیں۔ لہٰذا وثوق سے کہا نہیں جا سکتا۔ حضرت خواجہ گیسو درازؒ کی تصنیف 'معراج العاشقین' یقیناً پہلی کتاب ہے۔ خواجہ صاحب کا انتقال ۸۲۵ھ میں ہوا۔"

ریحان فاطمہ بدایوانی اپنے ایک مضمون (ادبی دنیا۔ جون ۱۹۴۴ء) میں لکھتی ہیں ''۔۔۔آزاد نے آبِ حیات میں فضلی کی 'دہ مجلس' (۱۱۴۵ھ) کو اُردو نثر کی پہلی کتاب لکھا ہے۔ لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ نثر میں سب سے پہلے ۷۰۸ھ میں خواجہ اشرف جہانگیر سمنانی نے ایک رسالہ تصوف میں لکھا تھا۔ خواجہ صاحب ۶۸۸ھ بمطابق ۱۲۸۹ء میں پیدا ہوئے اور ۸۰۸ھ/۱۴۰۵ء میں آپ کی وفات ہوئی۔ آپ اس حساب سے امیر خسروؒ کے ہی زمانے میں تھے۔ آپ کی زبان کا نمونہ یہ ہے۔

''اے طالب آسمان زمین سب میں خدا ہے۔ جو تحقیق جان، اگر تجھ میں کچھ سمجھ کا ذرہ ہے تو صفات کے باہر بھیتر تمام ذات ہی ذات ہے۔''

اسی سلسلہ میں مہر نذر علی درد کاکوروی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔ ''۔۔۔۔خواجہ سیدؔ اشرف جہانگیر سمنانی نے اُردو میں ایک رسالہ اخلاق وتصوف پر ۷۰۸ھ/۱۳۰۸ء میں تصنیف کیا تھا۔ انہوں نے اپنے سلسلے کے ایک بزرگ مولانا وجیہہ الدین کے ارشادات کو اُردو زبان میں (جس کو اُس زمانے میں 'زبان ہندی' کہا کرتے تھے) خود جمع کیا ہے۔ میں نے اپنے ایک بزرگ کے پاس خود اس کتاب کو دیکھا ہے۔ یہ قلمی کتاب ۲۰۷ صفحہ کی ہے،۔۔ نثر اُردو میں اس سے پہلے کوئی کتاب ثابت نہیں ہے۔ سیدؔ اشرف صاحب ۱۲۸۹ء/۶۸۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۶۰ سال کی عمر کو (بحساب قمری پہنچ کر ۱۴۰۵ء/۸۰۸ھ) وفات پائی۔ ممکن ہے کہ سیدؔ صاحب کی کتاب ہی اُردو زبان کی تصنیف اولین ہو۔''

(رسالہ نگار، لکھنو۔ دسمبر ۱۹۲۵ء)

حامد حسن قادری اپنی کتاب 'داستان تاریخ اُردو' (صفحہ ۲۴) پر تحریر کرتے ہیں۔ ''۔۔۔اب تک اربابِ تحقیق متفق الرائے تھے کہ شمالی ہند میں اٹھارویں صدی عیسوی سے پہلے تصنیف وتالیف نثر کا کوئی وجود نہ تھا، یہ فخر دکن کو حاصل ہے کہ وہاں شمالی ہند سے چاسو برس پہلے اُردو کی تصانیف کا آغاز ہوا۔ اب سیدؔ اشرف جہانگیر کے رسالہ تصوف کی دریافت سے وہ نظریہ باطل ہوگیا اور ثابت ہوگیا کہ دکن میں اُردو زبان کی بنیاد پڑنے سے پہلے شمالی ہند میں امیر خسروؒ اور سیدؔ اشرف جہانگیر سمنانی نے نظم ونثر دونوں کی بنیاد ڈال دی تھی۔'' حامد حسن قادری، خواجہ سید اشرف جہانگیر کا نام دستیاب مواد کی اساس پر قدیم ترین نثر

نگاروں میں کرتے ہیں اور اُن کے رسالہ تصوف (تالیف ۸۰۷ھ) کو اُردو کی پہلی نثری تصنیف قرار دیتے ہیں۔ اُردو نثر کی اولیات کے سلسلہ میں مولانا محمد حسین آزادؔ آبِ حیات' میں لکھتے ہیں:

"محمد شاہ کے عہد میں (۱۷۳۲ء) میں فضلی تخلص ایک بزرگ نے 'دہ مجلس' لکھی۔ اس کے دیباچہ میں سبب تالیف لکھتے ہیں۔ اور غالباً یہی نثر اُردو کی پہلی تصنیف ہے۔"

حکیم شمس الدین قادری مصنف 'اُردوئے قدیم' کا بھی یہی خیال ہے کہ فضلی کی 'دہ مجلس' اُردو میں لکھی جانے والی نثر کی پہلی کتاب ہے۔ لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ عین الدین گنج العلم (۷۰۶ھ تا ۷۹۵ھ) نے تین رسالے تحریر کئے تھے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخی ولسانی اعتبار سے پیر روشاں (متوفی ۱۵۷۲ء) جنہوں نے اپنی تصنیف 'خیر البیان' میں دینی مسائل چار زبانوں۔ عربی' فارسی' پشتو اور اُردو۔ میں بیان کئے ہیں۔ ان کی تصنیف کو غیر معمولی اہمیت کا حاصل قرار دیا ہے۔ 'خیر البیان' دسویں صدی ہجری میں لکھی گئی۔ چنانچہ اسے بجا طور پر شمالی ہند میں اُردو نثر کی پہلی تصنیف قرار دیا جاسکتا ہے۔ (تاریخ اُردو ادب، جلد اوّل۔ صفحہ ۵۸)

پروفیسر حافظ منظور الحق عثمانی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"۔۔۔۔ سب رس' سے پہلے کی نثر میں لکھے ہوئے چند ایک رسائل بھی دستیاب ہیں۔ لیکن وہ ایسے نہیں کہ انہیں ادب میں کوئی خاص اہمیت دی جائے۔ ان میں کچھ تو تبلیغی ہیں یا مسائل سے متعلق ہیں اور کچھ فلسفیانہ موضوع پر ہیں۔ ایسے مسائل جو بہت مختصر ہیں، مستقل کتاب کی حیثیت نہیں رکھتے۔ اُردو نثر میں سب سے پہلی قابل ذکر کتاب' جس میں ادبی شان اور ادبی شعور پایا جاتا ہے' وہ 'سب رس' ہے۔ 'سب رس' لسانیاتی اور خالص ادبی دونوں حیثیتوں سے اُردو ادب کی سب سے پہلی کتاب ہے۔"

(رسالہ کوہسار۔ راولپنڈی۔ جوبلی نمبر ۷۹-۱۹۷۸ء۔ صفحہ ۳۴)

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے 'رسالہ جنونیہ' (۱۳۹۶ء) کو اردو نثر کی قدیم ترین کتاب شمار کیا ہے اور اس کا مصنف محمد دخان روز بتایا ہے۔ 'علی گڑھ تاریخ ادب اردو' (صفحہ ۱۴۶) کی روشنی میں سیدؔ یوسف حسین شاہ راجو (متوفی ۳۱-۱۳۳۰ء) کا ایک رسالہ جس پر صرف 'رسالہ شاہ راجو' تحریر ہے، یہ رسالہ بعض دوسرے اُردو رسالوں کے ساتھ جن میں حضرت گیسو درازؒ کے کچھ رسالے بھی شامل ہیں، ملا ہے۔ بعض محققین نے شواہد

کی بناء پر رسالہ شاہ راجو' کو اُردو نثر کا قدیم ترین نمونہ اور شاہ راجو کو پہلا نثر نگار قرار دیا ہے۔

مشہور ترقی پسند مصنف سجاد ظہیر اپنے ایک مضمون ''اُردو ہندی، ہندوستانی مسئلہ'' میں لکھتے ہیں:

''۔۔۔کھڑی بولی میں فارسی الفاظ کی آمیزش کے ساتھ سب سے ابتدائی فقرے اور چند اشعار مشہور درویش اور صوفی بابا فرید گنج شکرؒ سے منسوب ہیں۔ بابا فریدؒ خود اس زبان کو ہندی یا ہندوی کہتے تھے۔ بابا فریدؒ بارویں صدی کے آخر ۱۱۷۳ء میں پیدا ہوئے اور آپ کا انتقال ۱۲۶۵ء میں ہوا...... اُردو نثر کا سب سے پہلا رسالہ حضرت گیسو دراز بندہ نوازؒ کا لکھا ہوا ہے۔ آپ کا رسالہ 'معراج العاشقین' غالباً ۱۳۹۸ء یعنی چودھویں صدی کے خاتمہ پر لکھا گیا۔ تقریباً ایک سو سال بعد ۱۴۹۵ء میں حضرت شاہ میراں جی شمس العشاقؒ کی شرح 'مرغوب القلوب' ملتی ہے۔ جس کی زبان 'معراجَ العاشقین' کی زبان سے بہت ملتی جلتی ہے''۔

مولوی عبدالحق کے نزدیک خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ (متوفی ۸۲۵ھ) کی تحریر کردہ 'معراج العاشقین' کو شرفِ اولیت حاصل ہے۔

اُردو کا پہلا شاعر

اُردو کے پہلے شاعر کے طور پر ایک عرصہ سے مختلف ناموں پر 'پرکھ پرچول' کا سلسلہ جاری ہے۔ اب تک جو نام تحقیق و جستجو کی کسوٹی پر رہے ہیں، ان میں ولی دکنی، امیر خسرو، سلطان محمد قلی قطب شاہ، چندر بھان برہمن، مسعود سعد سلمان، شاہ میراں جی شمس العشاق، بابا فریدالدین شکر گنجؒ اور خواجہ بندہ نواز حضرت گیسو درازؒ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ تحقیق و جستجو کا سلسلہ کہیں جا کر ختم نہیں ہوتا۔ ہر دور میں ماہرین نے اپنی تحقیق کو حرفِ آخر کے طور پر پیش کیا۔ تاہم تحقیق کا چراغ اپنے پیشرو کی تحقیق کی روشنی کو آگے بڑھاتا رہا۔ اور یہ سلسلہ قدم بہ قدم آگے بڑھتا رہا۔

۱) مولانا محمد حسین آزاد نے ولی دکنی کو پہلا شاعر مان کر، اُن کے سر پر اولیت کا تاج رکھا۔ اور صاحب دیوان شاعر بتایا ہے۔

۲) سیّد عبدالحیٔ صاحب 'گل رعنا' گولکنڈہ کے حکمران محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ء تا ۱۶۴۴ء) کو پہلا شاعر مانتے ہیں، جو ابراہیم عادل شاہ اور جہانگیر کا ہم عصر تھا۔ فرماتے ہیں کہ

"...... یہ اُردو کا پہلا شاعر ہے، جس تک ہماری نظریں پہنچی ہیں......"

مولوی عبدالحق بھی کہتے ہیں کہ "سلطان محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ) کی کلیات چھپ چکی ہے۔ اُردو میں اس سے قبل ایسا پاکیزہ کلام دریافت نہیں ہوا ہے۔......" کلیات کا جو نسخہ شاہی کتب خانہ میں تھا، اس پر ۱۰۱۸ھ تحریر ہے۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور لکھتے ہیں "...... محمد قلی قطب شاہ (متوفی ۱۶۱۱ء) پندرہ سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا اور اڑتالیس سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس مختصر عرصے میں اُس نے غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، قطعہ، رباعی، سب اصناف میں شاعری کی اور پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ایک دیوان حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا۔ اور اشعار میں سترہ تخلص استعمال کیئے۔ محمد قلی قطب شاہ کو اُردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تسلیم کیا جاتا ہے......"۔ (تاریخ ادب اُردو۔ علی گڑھ۔ صفحہ ۴۰۸)

۳) مولانا عبدالسلام ندوی فرماتے ہیں "...... عہد جہانگیری میں ملا نوری ایک شاعر تھے جو اگرچہ عام طور پر فارسی زبان میں شعر کہتے تھے لیکن ان کے قلم سے ایک آدھ مصرعے اُردو کے بھی نکل گئے ہیں......" (شعر الہند۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۱۳)

۴) رام بابو سکسینہ نے (تاریخ ادب اُردو) میں واضح طور پر لکھا کہ

"...... زبان اُردو کی ترقی کا ابتدائی زمانہ اتنا دھندلا نظر آتا ہے کہ اس کے خدوخال صاف طور پر نمایاں نہیں، مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ سب سے پہلا شاعر زبان اُردو کے دھندلکے میں جو صاف طور پر نمایاں نظر آتا ہے وہ امیر خسروؒ دہلوی ہیں......"۔

۵) بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے اپنی گرانمایہ تالیف "اُردو زبان کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" میں ایک پرانی بیاض سے امیر خسروؒ سے بھی پہلے ان کے شیخ نظام الدین اولیاؒ کے مرشد حضرت بابا فرید گنج شکرؒ (۱۱۵۶ء/۵۸۳ھ تا ۱۲۶۵ء/۶۶۴ھ) کی ایک نظم اور ریختہ

میں ایک غزل تلاش کر کے شاملِ کتاب کی ہے۔

حافظ محمود شیرانی لکھتے ہیں کہ ''ریختہ کی طرز کی کئی نظموں میں سب سے قدیم ریختہ شیخ فرید الدین گنج شکرؒ (متوفی ۶۶۴ھ) کی طرف منسوب ہے۔ علاوہ برایں ان کے بعض اُردو فقرے بھی ملتے ہیں۔ ان کے بعد شیخ عثمان اور شیخ جنید اور منشی ولی رام کے ریختوں کی باری آتی ہے۔ جو گیارہویں صدی ہجری سے تعلق رکھتے ہیں''۔

روسی محقق سیر پیرایا کوف مصنف 'پنجابی لٹریچر' لکھتا ہے: ''...... پہلے دور کے ہندو مسلمانوں کے تال میل سے پیدا ہونے والے ادب کا بہترین اسلوب بیان شیخ فرید الدین گنج شکرؒ نے پیش کیا''۔

لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ پہلے شاعر جن کا کلام موجود ہے وہ بابا فرید الدین گنج شکرؒ ہیں۔ جن کا انتقال ۱۲۶۵ء میں ہوا۔

۶) ڈاکٹر انور سدید اپنی کتاب 'اُردو ادب کی مختصر تاریخ' میں لکھتے ہیں: ''...... متقدمین اور متاخرین نے متفقہ طور پر لکھا ہے کہ مسعود سعد سلمان (متوفی ۱۱۲۱ء) ھندی میں بھی صاحب دیوان شاعر تھے۔ اس فیصلے کے اساس محمد عوفی مصنف 'لباب الالباب' کا یہ بیان ہے کہ ''......اورسہ دیوان است' یکے بتازی و یکے بپارسی و یکے ہندوی''۔ اس سے قبل امیر خسروؒ نے 'غرۃ الکمال' کے دیباچے میں یہی بات ان الفاظ میں کہی تھی۔

''مسعود سعد سلمان را اگر ھست اماسہ دیوان در عبارت عربی و فارسی و ھندی است''۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے 'تاریخ اردو ادب' (صفحہ ۲۳) پر یہی حوالہ دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''مسعود سعد سلمان ھندوی کے پہلے شاعر لاہور ہی کے رہنے والے ہیں''۔

۷) پروفیسر حامد حسن قادری، کبیر داس کے بارے میں لکھتے ہیں'' ...... کبیر سے چند غزلیں بھی مشہور ہیں لیکن اس کی تاریخی سند مشتبہ ہے۔ اگر یہ غزلیں واقعی کبیر داس کی ہیں تو پھر دکن کی اولیتِ شعر و غزل کے سب نظریے باطل ہیں۔ (داستان تاریخ اُردو۔ صفحہ ۲۳)

۸) سید نصیر الدین ہاشمی نے اپنی کتاب (مقالات ہاشمی۔ جلد اول) میں ''خواجہ بندہ نوازؒ کی

ہندوستانی شاعری" کے عنوان سے ایک مضمون تحریر کیا ہے، جس میں خواجہ صاحب کے نام سے کچھ اُردو اشعار پیش کئے ہیں۔ اگر یہ اشعار واقعی خواجہ صاحب کے ہیں اور بعد میں ان کے کسی معتقد نے کہہ کر ان کے نام سے منسوب نہیں کر دیئے، تو ہمیں دکن میں اُردو شاعری کا آغاز قطب شاہی دور سے تقریباً سو برس پہلے سے کرنا چاہئے"۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا انتقال ۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء میں ہوا۔

۹) ڈاکٹر محمد باقر نے میراں ہاشمی کو ریختی کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر کہا ہے"...... سید میراں میاں خاں ہاشمی (متوفی ۱۶۹۷ء) عادل شاہ ثانی کے زمانے کا نابینا شاعر، جو کہ بے حد قادر الکلام اور خوش گو تھا۔ مثنوی 'احسن القصہ' اس کی الہامی قوت کا مظہر ہے"۔ (اُردوئے قدیم۔ صفحہ ۳۹)

شمالی ہند میں اُردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر:

نواب صدر الدین محمدؐ خاں بہادر دہلی کے ایک امیر تھے جو اورنگ زیب کے آخری عہد سے محمد شاہ کے زمانے تک موجود تھے۔ متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فائزؔ تخلص تھا۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی نے ۱۹۴۶ء میں ان کا دیوان شائع کیا تھا۔ جسے سید مسعود حسن رضوی ادیب ایم اے (صدر شعبۂ فارسی۔ اُردو۔ لکھنؤ یونیورسٹی۔ لکھنؤ) نے مرتب کیا تھا۔ مؤلف نے فائزؔ کو شمالی ہند میں اُردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر قرار دیا ہے۔ اور کتاب کے سرورق، پر لکھ بھی دیا ہے کہ "شمالی ہند میں اُردو کا پہلا صاحب دیوان 'شاعر نواب صدر الدیؔن محمدؐ خاں فائزؔ دہلوی' اور اُس کا دیوان"۔

مؤلف کا کہنا ہے کہ شمالی ہند کے رہنے والے اُردو زبان کے جن شاعروں کا حال اب تک معلوم ہو چکا ہے۔ اور جن کا کلام معتدبہ مقدار میں دستیاب ہو چکا ہے۔ ان میں شاید کوئی بھی اتنا قدیم نہیں، جتنا فائزؔ دہلوی۔ بعض لوگ شاہ حاتم کو دہلی میں اُردو کا پہلا شاعر قرار دیتے ہیں۔ مگر بقول مؤلف یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ فائزؔ اپنا کُلیات، جس میں اُردو دیوان بھی شامل ہے ۱۱۲۷ھ میں مرتب کر چکے تھے۔ جبکہ حاتمؔ نے اس کے پانچ سال بعد اُردو شعر کہنا شروع کیا۔ فائزؔ کے ہمعصروں میں غلام مصطفیٰ یک رنگؔ اور میر جعفر زٹلی بھی تھے۔ تاہم مؤلف نے سبھی کے ذکر کے بعد لکھا ہے کہ

"بہرحال اُردو کے سنجیدہ شاعروں میں قدامت کے اعتبار سے فائز کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے"۔

ریحان فاطمہ بدایونی اپنے مضمون 'اردو ادب کے اولیات' میں لکھتی ہیں:

"......شمالی ہند میں سب سے پہلے شاہ عالم نے ۱۱۶۶ھ میں اپنا دیوان مرتب کیا۔ پہلے شاہ عالم کا دیوان بہت ضخیم تھا۔ اس کے بعد انہوں نے اس کا ایک انتخاب کیا اور اس کا نام 'دیوان زادہ' رکھا۔ اس میں طرحی، فرمائشی اور جوابی غزلیں علیحدہ علیحدہ لکھی ہیں۔ 'دیوان زادہ' ابھی شائع نہیں ہوا۔ لیکن اس کے قلمی نسخے ملتے ہیں، ایک نسخہ مسلم یونیورسٹی کے کتب خانے میں بھی ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے اس انتخاب کا ایک اور انتخاب شائع کیا ہے۔ جوان کے 'انتخاباتِ سخن' کی پہلی جلد میں شامل ہے"۔ (ادبی دنیا۔ جون ۱۹۴۴ء)

کلام شاہ مراد:

لوک ورثہ کے قومی ادارے، اسلام آباد نے ایک کتاب 'کلام شاہ مراد' شائع کی ہے۔ جس کے صفحہ ۹ پر تحریر ہے "شاہ مراد نے فارسی اور پنجابی کے علاوہ اُردو میں بھی شعر کہے اور بعض محقق اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ اُردو غزل کی ابتداء دراصل شاہ مراد سے ہوئی کیونکہ ولی دکنی جنہیں اُردو غزل کا باوا آدم کہا جاتا ہے، شاہ مراد کی وفات کے اکتالیس سال بعد پیدا ہوئے۔

شاہ مراد کی وفات ۱۱۱۴ھ میں ہوئی۔ آپ کا مزار تحصیل خانپور ضلع چکوال میں ہے جو تکیہ شاہ مراد کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں ہر سال عیدالاضحیٰ سے ایک دن پہلے آپ کا عرس ہوتا ہے۔

پہلی صاحب دیوان شاعرہ:

بقول تحسین سروری صاحب (روزنامہ جنگ، کراچی۔ ۲۸ جون ۱۹۶۵ء) "ماہ لقابائی چنداؔ اُردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ ہے۔ جو آصف جاہی امیر بسالت خاں بخشی خاص اور راج کنور بائی کے بطن سے تھی۔ نام چندابی بی تھا۔ جس نے آگے چل کر دربارِ آصفی سے 'ماہ لقابائی' کا خطاب پایا اور شاعری میں چنداؔ تخلص کیا۔ ماہ لقابائی ۲۰۔ ذیقعد ۱۱۸۱ھ (۱۷۶۷ء) کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئی۔ نواب نظام علی خاں نظام الملک آصف جاہ ثانی نے تسخیر پانگل سے کامیاب و کامران واپس ہونے کی خوشی میں ایک جشن منعقد کیا تھا۔ اس موقع پر تمام اُمرائے سلطنت کو مناسب خطابات دئے گئے۔ اس موقع پر چندابی بی کو بھی

'ماہ لقابائی' کے خطاب سے ملقب کیا۔

ماہ لقافنِ موسیقی کی بھی ماہر تھی۔ بعض ماخذ بتاتے ہیں کہ ماہ لقانے اپنے کلام پر میر عالم سے اصلاح پائی تھی۔ ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ کر ۱۲۴۰ھ میں چنؔدا نے انتقال کیا۔ کسی شاعر نے تاریخ کہی جو اس کے مقبرے پر کندہ ہے۔ مادہ تاریخ یہ ہے۔ "راہی جنت شدہ ماہ لقائے دکن"

پہلا نسوانی اُردو دیوان:

۱۱۰۰ھ سے قبل یا بعد میں بعض خواتین کے شعر کہنے کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن بقول نصیر الدین ہاشمی جس خاتون شاعرہ کا دیوان دستیاب ہوا ہے وہ لطف النساء بیگم امتیاؔز ہے۔ اس وقت کی معلومات کے لحاظ سے اس کو پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ کہہ سکتے ہیں۔ لطف النسأ نام اور امتیاؔز تخلص تھا۔ اولاً اپنا تخلص لطف کرتی تھی، اس کے بعد امتیاؔز اختیار کیا۔ ۱۲۱۲ھ میں دیوان مرتب کیا۔ وطن حیدر آباد تھا۔ مشہور شاعر اسد علی خاں تمنا (متوفی ۱۲۰۴ھ) کی بیوہ تھیں۔ امتیاؔز کی ایک ضخیم مثنوی "گلشنِ شعرأ" تقریباً چھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ امتیاؔز کا دیوان تا حال غیر مطبوعہ ہے۔ اس کا قلمی نسخہ نواب سالار جنگ (حیدر آباد) کے کتب خانہ کی زینت ہے۔ نمونہ کلام

آج قاتل بڑا ثواب کیا   مجھ سے بسمل کو ذبح کر تو نے

جاں فدائے ابو تراب کیا   امتیاؔز اب ترا لقب ہم نے

ریختی:

اگر چہ تذکرہ نگاروں نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ ایک زمانے میں اُردو کو ابتدائی مراحل میں ریختی کے نام سے بھی پکارا گیا ہے۔ تاہم شاعری میں ایک خاص صنفِ سخن کو 'ریختی' کہتے تھے۔ لکھنؤ میں خواتین کی زبان میں شاعری کو 'ریختی' کا نام دیا گیا۔

ریختی کو بحثیت صنفِ سخن روشناس کرانے کا سہرا میاں رنگیؔن کے سر ہے، اگر چہ ۱۲۱۸ھ اور ۱۲۴۵ھ تک دو دکنی شعراء لائق اور قیس نے بہت اچھی ریختیاں کہی ہیں اور ان کے دیوان رنگیؔن کے دیوان سے بہت پہلے مکمل ہو چکے تھے۔ شاید رنگیؔن کو اس کا علم نہ تھا۔ رنگیؔن کے بعد انشاء نے بھی اس طرف

توجہ کی اور جلد ہی ریختی کا دیوان مکمل کرلیا۔ اسی زمانے میں صاحبقراں بھی ریختی میں اشعار کہنے لگے مگر دیوان مکمل نہ کر سکے۔ بعض حضرات انشاء کو ریختی کا موجد کہتے ہیں۔ لیکن انشاء نے 'دریائے لطافت' میں خود رنگین کو اس کا موجد مانا ہے۔ رنگین نے بھی اپنے دیوان کے دیباچہ میں 'ہرچندہ گندہ مگر ایجادِ بندہ' کہہ کر ریختی کا موجد ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ رنگین نے اشعار میں بھی اپنے اس دعویٰ کو دہرایا ہے:

زبس ہے ریختی ایجادِ رنگیں موا انشا بھی اب کہنے لگا ہے

چند تذکرہ نویسوں کا کہنا ہے کہ 'ریختی' کی ابتداء دکن سے ہوئی ہے۔ رحیم (جو ولی کا ہم عصر تھا) اسے ریختی کا موجد مانا ہے اور بعض اس سے بھی پہلے ہاشمی کو ریختی کا موجد قرار دیتے ہیں۔ لیکن اکثر ادباء کا خیال ہے کہ رحیم وغیرہ کے اشعار اصلی معنوں میں ریختی نہیں کہلا سکتے۔ وہ اشعار اس قسم کے ہیں، جیسے بھاشا کے اکثر شعراء کہا کرتے تھے۔ البتہ ۱۲۱۸ھ سے ۱۲۴۵ھ تک دکنی شعراء لائق اور قیس نے بہت اچھی ریختیاں کہی ہیں۔

مثنوی کا آغاز:

اُردو کی دیگر اصناف سخن کی طرح مثنوی کا آغاز بھی دکن میں ہوا۔ نصیر الدین ہاشمی 'دکن میں اُردو' میں رقمطراز ہیں کہ ''اُردو کا جس قدر ابتدائی کلام دستیاب ہوا ہے، اس میں مثنوی کا حصہ زیادہ ہے۔ جس سے قیاس کیا جاتا ہے کہ اصنافِ شاعری میں اولاً مثنوی کا رواج ہوا''۔

تحقیق کے مطابق عادل شاہی دور سے اُردو شاعری کا ارتقاء شروع ہوا۔ اس دور میں سب سے مقبول ترین صنفِ سخن 'مثنوی' تھی۔ جس میں زیادہ تر قصہ کہانیوں کو منظوم کیا جاتا تھا۔ شاعری پر چونکہ مذہبی اثرات زیادہ تھے، لہٰذا اس دور میں تبلیغ کے لئے بھی 'مثنوی' کو ذریعہ بنایا گیا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیق کے مطابق مثنوی کی ابتداء بھی دکن سے ہوئی، انہوں نے اپنے ایک مضمون 'اُردو کی پہلی تصنیف' میں لکھا ہے۔

''مولانا آزاد نے آب حیات میں اُردو زبان کا پہلا شاعر ولی دکنی کو مانا تھا۔ یہ بارھویں صدی ہجری کا دور تھا۔ اس کے بعد جب کلیات قلی قطب شاہ دریافت ہوا تو اُردو زبان کی تاریخ

بارھویں صدی ہجری سے نکل کر گیارھویں صدی ہجری کے دائرہ میں آ گئی اور اب فخر دین نظامی کی مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' جسے انجمن ترقی اُردو پاکستان نے شائع کیا ہے' کی اشاعت کے بعد اُردو زبان کی تاریخ گیارھویں صدی ہجری سے نکل کر نویں صدی ہجری کے دائرہ میں آجاتی ہے۔ فخر دین نظامی نے اس مثنوی کو ۸۲۵ھ/۱۴۲۱ء تا ۸۳۹ھ/۱۴۳۵ء کے درمیانی عرصے میں تصنیف کیا تھا۔ اس وقت دکن میں بہمنی سلطنت قائم تھی''۔

(نیا دور۔ شمارہ ۶۳۔ ۶۴۔ صفحہ ۱۱)

اسی بات کی تصدیق ریحان فاطمہ بدایونی کی تحریر سے بھی ہوتی ہے۔ انہوں نے دکن میں اُردو کے سلسلہ میں لکھا ہے ''بہمنیہ سلاطین کے آخر زمانہ کے ایک شاعر نظامی نے 'رتن پدم کدم راؤ' کے نام سے ایک مثنوی لکھی تھی۔ اس کی زبان بہت پرانی ہے اور بالکل سمجھ میں نہیں آتی۔ لیکن سب سے پہلی مثنوی ہے جو اب شائع ہو گئی ہے''۔ (ادبی دنیا۔ جون ۱۹۴۴ء)

ڈاکٹر سید عبداللہ دکن کی اولین کامیاب کوشش وجہی کی مثنوی 'قطب مشتری' بتاتے ہیں۔ لیکن بعض کے نزدیک یہ درست نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وجہی کی 'قطب مشتری' نظامی کی مثنوی کے پچاس سال بعد لکھی گئی۔ خواجہ نیک عالم ہاشمی اپنے ایک مضمون 'مثنوی اور اس کا ارتقاء' میں لکھتے ہیں ''......کافی عرصہ تک اُردو مثنوی کی تاریخ میں ملا وجہی کی 'قطب مشتری' کو اولیات کا شرف حاصل تھا۔ اس مثنوی کی تکمیل ۱۰۱۸ھ میں ہوئی۔ لیکن مزید تحقیقات نے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح کر دی کہ سب سے قدیم مثنوی جو کہ دکن میں ملتی ہے وہ نظامی کی 'کدم راؤ اور پدم راؤ' ہے۔ جس کا سنِ تصنیف ۸۶۵ھ اور ۸۶۷ھ کے درمیان ہے۔ 'نظامی' سلطان احمد شاہ ثالث بہمنی کا درباری شاعر تھا۔ اور نصیر الدین ہاشمی نے 'دکن میں اُردو' میں تاریخی دلائل سے اس کی اولیت کو ثابت کیا ہے۔'' (نگار پاکستان۔ اکتوبر ۱۹۴۹ء۔ صفحہ ۵۷)

مرثیہ آغاز وارتقاء:

اُردو میں رزمیہ شاعری کی کمی کو بڑی حد تک مرثیہ نگاری نے پورا کیا۔ دکن کے عادل شاہی اور قطب شاہی حکمران چونکہ شیعہ مسلک رکھتے تھے' اس لئے مرثیہ گوئی کی ابتدا ان کے درباروں میں ہوئی۔

ریاست گولکنڈہ کے مرثیہ گوشعرا میں محمد قلی قطب شاہ، وجہی اور غواصی نمایاں نام ہیں۔ بیجاپور کے مرثیہ گوشعرا میں نصرتی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ فتح دکن کے بعد دور مغلیہ کے مرثیہ گوشعرا میں شاہ حسین ذوقی، غلامی گجراتی، ندیم بیجاپوری اور ولی اورنگ آبادی نے مرثیے کے ارتقاء میں نمایاں حصّہ لیا۔

شمالی ہند میں فضلی کو اردو کا سب سے پہلا مرثیہ گو تسلیم کیا گیا ہے۔ مسعود حسن رضوی کی تحقیق کے مطابق فائز دہلوی شمالی ہند کے پہلے مرثیہ گو ہیں۔

بقول مولانا حامد حسن قادری ''دکن کا قدیم ترین مرثیہ نگار، محمد قلی قطب شاہ ہے''۔ اس کی تقلید میں دیگر بہت سے شاعروں نے مرثیے لکھے، جن میں شاہانِ بیجاپوری، ابراہیم عادل شاہ اور علی عادل شاہی کے زمانے کے شعرا شامل ہیں۔ دکن میں مرثیے کے سب سے مشہور شعرا ہاشم، اور نوری ہیں۔ یہ دکن میں اورنگ زیب کے زمانے میں ہوئے۔

اُردو کا پہلا قصیدہ گو:

قصیدہ گوئی کا آغاز اگرچہ ابتداء ہی میں ہو چکا تھا، تاہم اس کی ترقی متوسطین کے دورِ اوّل میں ہوئی۔ قصیدہ کا رواج فارسی سے اُردو میں آیا، ایران میں قصیدہ گوئی میں انوری، صائب، کلیم اور سلیم وغیرہ نے بہت نام پیدا کیا۔ اُردو میں دیگر اصنافِ شاعری کی طرح قصیدے کا آغاز بھی دکن سے ہوا۔ سلطان محمد علی قطب شاہ، قطبی اور نصرتی ابتدائی دور کے قابلِ ذکر قصیدہ گو ہیں۔ ان میں نصرتی کو اعلیٰ درجے کا قصیدہ گو تسلیم کیا گیا ہے۔ اس دور کے شعرا میں ولی بھی اچھے قصیدہ گو ہیں۔ ولی نے کل چھ قصیدے لکھے۔ بعد ازاں ولی کا شہرہ جب شمالی ہند پہنچا تو حاتم، سودا، میر تقی میر، میر حسن، محمد حسین کلیم، قائم چاند پوری، جعفر علی حسرت، قمر الدین منت، محمد باقر حزیں اور بقاء اللہ بقا وغیرہ نے قصیدے میں نام پیدا کیا۔

ریحان فاطمہ بدایوانی اپنے ایک مضمون 'اُردو ادب کے اولیات' میں قصیدہ گوئی کے بارے میں لکھتی ہیں۔ ''......اُردو میں سب سے پہلے ملا وجہی کے قصیدے ملتے ہیں۔ لیکن وہ تعداد میں بہت کم ہیں۔ ان میں قصیدوں کی اصلی شان نہیں پائی جاتی۔ نصرتی پہلا قصیدہ گو شاعر ہے، جسے اورنگ زیب نے ''ملک الشعرا'' کا خطاب دیا تھا۔ اس کے قصائد جو علی عادل شاہ کی تعریف میں ہیں، اعلیٰ درجہ کے ہیں۔

نصرتی پر مولوی عبدالحق صاحب ایک مستقل تصنیف فرما چکے ہیں......" (ادبی دنیا۔ جون ۱۹۴۴ء)

اس سلسلہ میں پروفیسر تعظیم رسول انجم (مسلم کالج، حیدرآباد) اپنی تحقیق کو اِن الفاظ میں بیان کرتے ہیں "......اُردو قصیدہ گو شاعریوں تو نظامی بیدری ہیں لیکن چونکہ انہوں نے صرف ایک ہی قصیدہ لکھا تھا، اس لئے قصیدہ گو شاعر ہونے کا شرف مشتاق کو ہی حاصل ہے جو سلطان محمد شاہ لشکری کے دور میں ہوئے تھے۔ (روزنامہ حریت، کراچی۔ ۱۳ مئی ۱۹۶۹ء)

آزاد شاعری کی تحریک:

نظم کی یہ قسم انگریزی سے اُردو میں آئی۔ کہتے ہیں کہ ۱۵۴۷ء میں انگریزی میں پہلی بار اس نظم کا رواج ہوا۔ جب شیکسپیئر نے یہ اسلوب اختیار کیا تو نظمِ معریٰ انگریزی ادب میں ایک نمایاں مقام حاصل کر چکی تھی۔ عام خیال یہ ہے کہ نظم بے قافیہ کی یہ قسم ملٹن (Milton) کی مشہور نظم 'جنتِ گم گشتہ' (Paradise Lost) میں اپنے کمال کو پہنچی۔

اُردو شاعری میں نظم معریٰ کو رواج دینے والوں میں اسماعیل میرٹھی، عبدالحلیم شرر اور نظم طباطبائی کے نام آتے ہیں۔ شرر نے ۱۹۰۰ء میں 'دلگداز' کے پرچوں میں باقاعدہ اس تحریک کا آغاز کیا۔ اس مہم میں نظم طباطبائی بھی شرر کے ساتھ تھے۔ نظم طباطبائی کی غیر مقفیٰ نظمیں 'دلگداز' میں شائع ہوئی ہیں۔

اس سے بہت پہلے ۱۸۶۷ء کے قریب اسماعیل میرٹھی نے چند انگریزی نظموں کے ترجمے کئے تھے۔ اُردو میں غیر ملکی شاعری کے ترجموں کی یہ سب سے پہلی کوشش تھی۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں (آج کا اُردو ادب):

"۔۔۔مولانا اسمٰعیل میرٹھی کا تعلق اُردو میں ان چند نئے تجربات سے بھی ہے جو اُردو میں شعر کی ہئیت کے سلسلے میں شروع ہوئے تھے۔ ان میں ایک تجربہ بے قافیہ نظموں کا بھی تھا۔ ان نظموں میں ترنم اور روانی کے ساتھ شعر کا آہنگ پوری طرح موجود تھا اور نئے ہونے کے باوجود اس میں اجنبیت یا مغائرت کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ سلسلہ مولانا عبدالحلیم شرر اور مولانا اسماعیل میرٹھی سے شروع ہوا، اس کو باقاعدہ تحریک ترقی پسند مصنفین نے بنایا۔ جن میں علی سردار جعفری، فیض، ن۔م راشد، تصدق حسین خالد

اور میراجی کے نام خاص طور پر مشہور ہیں۔اُردو شاعری کے قدیم اور رسمی اسلوب، موضوعات اور تیکنک کے خلاف بغاوت کی یہ تحریک اپنے مقاصد کے اعتبار سے ترقی پسند ضرور تھی۔اس تحریک کے اثرات اب تک محسوس کئے جارہے ہیں۔۔۔‘‘

بعد ازاں جن شاعروں نے اُردو میں اس نئی ہیئت اور اسلوب کو رواج دیا، ان میں ڈاکٹر تصدق حسین خالد، ن۔م راشد، میراجی اور یوسف ظفر کے نام نمایاں ہیں۔ویسے آزاد نظم کی ابتداء کے دو دعویدار ہیں ایک تصدق حسین خالد اور دوسرے ن۔م راشد۔ ان کا دعویٰ حقیقت پر مبنی معلوم نہیں ہوتا۔ جبکہ اسی دور کے م۔حسن لطیفی کے نام کو گوشہ ءگمنامی کی نذر کر دیا گیا۔م حسن لطیفی کا مجموعہ کلام ’لطیفیات‘ جلد اوّل ۱۹۲۸ء میں اور جلد دوم ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا۔جس کا خاصہ حصہ نظم معرّیٰ پر مشمل ہے۔جناب صادق الخیری اپنی کتاب ’’میری زندگی ہے فسانہ‘‘ میں تحریر کرتے ہیں: ’’۔۔۔جدید آزاد نظم کے پیش روؤں میں ڈاکٹر تصدق حسین خالد اور نٓ م راشد کا نام آتا ہے۔مگر م حسن لطیفی نے بہت پہلے اور بڑے اہتمام سے اس صنف کو روشناس کرایا تھا۔ان کے مجموعہ کلام کا نام ’لطیفیات‘ ہے۔اس کی اکثر نظمیں انہی کے اخبار میں شائع ہوئی تھیں۔‘‘

صادق الخیری کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے سراج منیر فرماتے ہیں (لطیفی ۔۔۔ایک مطالعے کی ضرورت) ’’۔۔۔جدید اُردو شاعری اور اس سے منسلک شعور کی مختلف جہتوں کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ م حسن لطیفی کا غور سے مطالعہ کیا جائے۔کیونکہ ان کی زندگی، شاعری، سیاسی تصورات اور فکری ساخت میں وہ عناصر پہلی مرتبہ پوری قوت سے ظاہر ہوئے جو بعد میں اُردو نظم کے پھیلتے ہوئے آفاق پر مختلف انداز میں نمایاں ہوتے چلے گئے۔‘‘

ڈاکٹر جمیل جالبی ’آزاد نظم‘ میں ن م راشد اور روایت سے انحراف کے سلسلہ میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں: ’’۔۔۔ن م راشد کی بنیادی حیثیت ایک ایسے شاعر کی ہے، جس نے نہ صرف اپنے دور کی رُوح کی سچی ترجمانی کی ہے بلکہ نئی نسل میں نیا شعور پیدا کر کے تخلیقی سطح پر نئے رویوں کو متعین کرنے کا کام بھی کیا ہے۔’’آزاد نظم‘‘ کو عام کرنے میں ان کا نام سرفہرست ہے۔ن م راشد نے

روایت سے انحراف کیا ہے لیکن ساتھ ساتھ انحراف کو روایت سے ملایا بھی ہے۔ یہی ان کے فن کی انفرادیت ہے۔"

محمد سہیل بھٹی اپنی کتاب 'تاریخ ادب اُردو' میں 'آزاد شاعری' کی تحریک کے عنوان سے لکھتے ہیں: "۔۔۔اُردو کی ادبی تحریکوں کے ضمن میں آزاد شاعری کے رجحان کو بھی نظر انداز کرنا مناسب نہیں۔ اُردو میں سب سے پہلے ڈاکٹر تصدق حسین خالد اور ڈاکٹر تاثیر نے آزاد نظمیں لکھیں۔ آزاد شاعری کی اس تحریک نے ہماری شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اگرچہ حالی نے ردیف و قافیہ سے چھٹکارا حاصل کرنے کا درس دیا تھا۔ مگر اب بحروں میں بھی تبدیلی ہونے لگی اور شاعر اپنی پسند کا وزن نظم میں اختیار کرنے لگے۔"

آزاد شاعری کی تحریک پر لکھے گئے مضامین میں استاد یوسف ظفر کا نام ہر جگہ نظر تو آتا ہے۔ لیکن نظم معرّیٰ کے سلسلہ میں ان کی کاوش کو کما حقہ، سراہا نہیں گیا۔ میراجی کی تالیف 'اس نظم میں' ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی۔ اِسی برس یوسف ظفر کا اولین مجموعہ شاعری 'زنداں' شائع ہوا تو اُس کے پیش لفظ میں اس شعری مجموعہ کے ناشر ظہیر الدین (مالک اُردو بکسٹال) نے یہ وضاحتی جملہ شامل کیا" ۔۔۔اب ایک آخری بات، جناب یوسف ظفر وہ پہلے اُردو شاعر ہیں، جنہوں نے بلینک ورس (Blank verse) کو باقاعدہ آلہ اظہار بنایا۔۔۔"

چنانچہ اس حقیقت کی مزید تائید ڈاکٹر محمد صادق نے 'A History of Urdu Literature' (صفحہ ۵۹) ان الفاظ میں کی ہے۔" ۔۔۔یوسف ظفر کی تمام صلاحیتیں تکنیک کی جانب تھیں۔ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اُردو ادب میں غیر مقفیٰ شاعری کو سہل اور روانی کے ساتھ آگے بڑھایا۔۔۔" سید ضمیری جعفری فرماتے ہیں۔۔۔" آزاد شاعری کے تو وہ معماروں میں شمار ہوتے ہیں۔ اگر یوسف ظفر نہ ہوتا تو یہ صنف آج شاید اتنی معتبر نہ ہوتی۔۔۔"

استاد یوسف ظفر کے ہم عصروں میں ایک معتبر نام میراجی کا ہے۔ میراجی کے حوالے سے ڈاکٹر تصدق حسین (مرتب کلیاتِ یوسف ظفر) میراجی کے یوسف ظفر کے غیر مقفیٰ کلام پر تاثرات بیان

کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''۔۔۔نظم میں قافیوں کے فقدان کے حوالے سے میراجی کی وضاحت غور طلب ہے۔ قافیوں کی غیر موجودگی کی وضاحت یقیناً میراجی کو اس لئے پیش آئی کہ اس سے قبل اُردو شاعری میں قافیوں کے بغیر نظم کا تصوّر موجود نہیں تھا۔''

آزاد شاعری کی تحریک سے شعوری طور پر متاثر شعرائے کرام نے آزاد نظم اور نظم معرّیٰ دونوں اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اب آزاد نظم اور نظم معریٰ کہنے والوں کو الگ الگ کر کے کسی ایک صنف میں ان کا مقام متعین کرنا دشوار نظر آتا ہے۔

اُردو ڈرامہ کا آغاز وارتقاء:

اُردو ڈرامے کے آغاز وارتقاء کے بارے میں بھی ماہرین نے اپنے اپنے انداز سے اختلافِ رائے کا اظہار کیا ہے اور ثبوت میں تاریخی کتب اور اساتذہ کی تحریروں کے حوالہ جات دیئے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ انگریزوں کی ہندوستان میں آمد تک تھیٹر اور ڈرامہ نگاری کا کوئی خاص رواج نہ تھا۔ جدید تھیٹر یورپی اقوام کے ساتھ ہندوستان آیا۔ سنسکرت ڈراموں کے بعد، پرتگیزیوں نے اس فن کو سب سے پہلے ۱۵۳۳ء میں تبلیغی سرگرمیوں کے لئے استعمال کیا۔ انگریزوں کے ذوق کی تسکین کے لئے ۱۷۵۰ء میں بمبئی تھیٹر قائم کیا گیا۔ جس میں انگریزی ڈرامے دکھائے جاتے تھے۔ بعد ازاں بنگال اور بمبئی میں بنگالی اور مرہٹی ڈرامے سٹیج کئے گئے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب امانت لکھنوی نے 'اندرسبھا' لکھی، واجد علی شاہ کے شاہی اسٹیج کی روایت موجود تھی۔ واجد علی شاہ نے قیصر باغ میں ایک عمارت 'رہس منزل' کے نام سے تعمیر کروائی تھی۔ جہاں ڈراموں کا سلسلہ واجد علی شاہ کی معزولی تک قائم رہا۔ چنانچہ انہی شواہد کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ واجد علی شاہ کا رہس دھاری ناچ 'رادھا کنہیا' اُردو کا پہلا ڈرامہ اور رہس منزل پہلا تھیٹر تھا۔

بعض ماہرین کا خیال ہے کہ ہندوستان میں ڈرامے کا وجود ناٹک کی صورت میں زمانہ قدیم سے موجود تھا۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نامی، اُردو میں ڈرامے کے آغاز کے سلسلہ میں کہتے ہیں ''......اندرسبھا سے تقریباً تین سو سال قبل اُردو ڈرامے سٹیج کئے جاتے تھے''۔ ڈاکٹر موصوف نے اپنے اس دعوے کے ثبوت

میں چونکہ کوئی سند پیش نہیں کی۔ لہٰذا ان کا یہ انکشاف قابلِ قبول نہیں۔ ویسے بھی اُس عہد کے کسی ڈرامے کا کوئی نمونہ تا حال دستیاب نہیں ہوا ہے۔

پروفیسر سیّد مسعود حسن رضوی کی تحقیق کے مطابق ''اردو کے پہلے ڈرامہ نگار واجد علی شاہ تھے۔ ان کا پہلا ڈرامہ ''رادھا کنہیا'' کا قصہ ہے، جو ۱۸۴۲ء اور ۱۸۴۶ء کے درمیان لکھا گیا۔ بارہ صفحات کے اس مختصر ڈرامے میں وہ تمام اجزائے ظاہری موجود ہیں، جنہیں ڈرامے کا لازمی حصہ کہا جا سکتا ہے۔ یعنی قصہ، کردار، مکالمہ اور سٹیج پر عمل کی تفصیلی ہدایات وغیرہ۔ لیکن اس ڈرامہ نما رہس کا اصل مقصد رقص و نغمہ کی پیشکش تھا۔ 'اندر سبھا' ڈرامہ آغا حسن امانت لکھنوی نے بعد میں تحریر کیا''۔

(لکھنؤ کا شاہی اسٹیج۔ مرتبہ سیّد مسعود حسن رضوی ادیب)

اس کی تصدیق ڈاکٹر سلام سندیلوی کی کتاب ''ادب کا تنقیدی مطالعہ'' کے اِس پیراگراف سے ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں ''...... واجد علی شاہ نے پہلی بار اُردو میں ڈرامہ لکھا۔ جس کا نام 'رادھا کنہیا کا قصہ'' ہے۔ یہ ڈرامہ ۱۲۵۸ھ اور ۱۲۶۲ھ کے درمیان لکھا گیا۔ چنانچہ امانت لکھنوی نے اس ڈرامے سے متاثر ہو کر 'اندر سبھا' لکھا۔ یہ ڈرامہ ۱۲۷۰ھ میں لکھا گیا۔ لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ امانت نے نواب واجد علی شاہ کے حکم سے یہ ڈراما لکھا، بلکہ امانت نے حاجی مرزا عابد عبادت، جو ان کے شاگردِ اوّل تھے، کی فرمائش سے اس ڈرامے کی تخلیق کی......''۔

اُردو کا پہلا ڈرامہ نگار سلطان واجد علی شاہ کو مانتے ہوئے، پروفیسر تعظیم رسول انجم (مسلم کالج۔ حیدر آباد) اپنے ایک مضمون 'اُردو کا پہلا ڈرامہ نگار' کے عنوان سے لکھتے ہیں ''...... اُردو کا سب سے پہلا ڈرامہ نگار ہونے کا شرف سلطان واجد علی شاہ کو حاصل ہے اور انہوں نے ہی اُردو کا سب سے پہلا ڈرامہ 'افسانۂ عشق' تحریر کیا تھا۔ یہ اور بھی دلچسپ بات ہے کہ انہوں نے ہی اپنے اس ڈرامے کو اسٹیج بھی کرایا تھا۔ جو رہس یا اوپیرا کی شکل میں اسٹیج ہوا۔ اسٹیج ہونے والا سب سے پہلا ڈرامہ بھی 'افسانۂ عشق' ہی تھا''۔

(روزنامہ حریت، کراچی۔ ۱۳ مئی ۱۹۶۹ء)

سید امتیاز علی تاج لکھتے ہیں کہ ''...... پہلے پہل جو اُردو میں ناٹک کھیلا گیا وہ خالص اوپیرا تھا، اس کا نام 'اندر سبھا' ہے اور اسے سید آغا حسن امانت لکھنوی نے لکھا تھا۔ (کارواں، لاہور ۱۹۳۴ء)

یوں تو سنسکرت میں ناٹک کا پتہ زمانہ قدیم سے چلتا ہے۔ جیسا کہ کالی داس کے ڈرامہ 'شکنتلا' کا بڑا چرچا تھا۔ لیکن اردو میں سب سے پہلے لکھنؤ کے شاعر حسن امانت نے 'اندر سبھا' لکھی۔ اس کی تاریخ تصنیف ۱۲۶۵ھ یا ۱۲۶۸ھ ہے۔ یہ منظوم ڈرامہ مافوق الفطرت عناصر پر مبنی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ڈراما واجد علی شاہ کی تحریک پر لکھا گیا تھا۔ بعض روایتوں کے مطابق واجد علی شاہ نے خود اس میں پارٹ ادا کیا تھا' یہ پہلا باقاعدہ اردو ڈراما ہے' جو سٹیج پر کھیلا گیا۔ اس کے بعد بمبئی کی پارسی کمپنیوں نے اور ڈرامے لکھوائے۔ اس طرح اردو میں اس نئی صنف کا آغاز ہوا۔

پروفیسر سید سراج الاسلام اپنی کتاب 'تذکرے اور تبصرے' میں لکھتے ہیں۔ "۔۔۔ اردو ڈرامے کا آغاز واجد علی شاہ کے عہد سے ہوتا ہے۔ انہوں نے ایک عشقیہ مثنوی 'افسانہء عشق' رہس کے انداز میں لکھی' جس کو ڈرامہ کا نقش اول کہہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد 'راس لیلا' اور 'کرشن لیلا' کے طرز پر رہس لکھ کر اسٹیج پر پیش کیے۔ گو واجد علی شاہ سے قبل فرخ سیئر کی فرمائش پر سنسکرٹ ڈرامے 'شکنتلا' کا ترجمہ ہو چکا تھا۔ لیکن یہ اُردو کا دور نہ تھا۔ اس لے اردو کا پہلا ڈرامہ نگار واجد علی شاہ ہی کو کہا جا سکتا ہے۔ اس زمانے میں سیدؔ آغا حسن امانت لکھنوی نے احباب کی فرمائش پر ۱۸۵۳ء میں 'اندر سبھا' لکھی، جس سے اُردو ڈرامہ کی ابتدا ہوئی"۔

پروفیسر سراج الاسلام نے یہاں احتیاط کی راہ اپنائی۔ انہوں نے کھل کر اور واضح طور پر اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ ایک طرف تو وہ واجد علی شاہ کو پہلا ڈرامہ نگار قرار دیتے ہیں اور ساتھ ہی 'اندر سبھا' سے اُردو ڈرامے کی ابتدا کی بات کرتے ہیں۔

قاضی مشتاق احمد کی تحقیق کے مطابق کیشو رام بھٹ کا لکھا ہوا 'سجاد سنبل' جدید طرز کا پہلا اردو ڈرامہ ہے۔ یہ ۱۸۷۴ء میں تحریر ہوا۔ کیشو رام بھٹ کو ہندی اور اُردو دونوں کا ڈرامہ نگار سمجھا جاتا ہے۔ 'سجاد سنبل' چونکہ اسٹیج کے اداکاروں کی سہولت کے پیشِ نظر دیوناگری رسم الخط میں لکھا گیا تھا، اس لیے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی۔ حالانکہ زبان و بیان اور لفظیات کے اعتبار سے پورا ڈراما اُردو میں ہے۔ 'سجاد سنبل' کا ایک نسخہ 'بہار راشٹر بھاشا پریشد' کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ کیشو رام بھٹ کے آباؤ اجداد مہاراشٹر سے آ کر بہار شریف میں آباد ہو گئے تھے۔ ان کا انتقال پٹنہ میں ہوا...... (اُردو نثر، ایک مطالعہ۔ صفحہ ۱۱۴)

نواب سیّد محمد آزاد کے لکھے ہوئے ڈرامے 'نوابی دربار' کو بھی اُردو کا پہلا نثری ادبی ڈراما کہا جاتا ہے۔ 'نوابی دربار' ۱۶۔ اپریل ۱۸۷۸ء سے ۱۶۔ جولائی ۱۸۷۸ء تک 'اودھ پنچ' میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔ جس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۰۱ء میں طبع ہوا۔ 'تاریخ ادب اُردو' میں رام بابو سکسینہ نے 'نوابی دربار' کے بارے میں لکھا ہے کہ ۱۸۷۸ء میں ان کا (سیّد محمد آزاد) ناول 'نوابی دربار' نکلا، جس میں مذاق کے پیرایہ میں پرانے رنگ کے فاقہ مستوں کا خوب خاکہ اڑایا گیا تھا۔ اور بہت مقبول عام ہوا''۔ لیکن ممتاز منگلوری مرتب 'نوابی دربار' (طبع شدہ۔ نومبر ۱۹۶۶ء) یہ اسے کوئی مزاحیہ ناول نہیں بلکہ ''اُردو کا پہلا نثری ادبی ڈرامہ'' قرار دیتے ہیں۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ ''فنی اعتبار سے یہ ناول نہیں بلکہ ڈرامہ ہے اور کتاب کے مقدمہ میں بڑی تفصیل سے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں شواہد پیش کیے ہیں کہ 'نوابی دربار' حالات و واقعات، مکالمے اور کردار کے لحاظ سے واقعی ناول کی بجائے ڈرامہ ہے۔ ممتاز صاحب نے سیّد محمد عبدالغفور شہباز (پروفیسر سائنس اورنگ آباد کالج)، کی رائے کو بھی دلیل کے طور پر اپنے اس مقدمہ میں شامل کیا ہے۔ چنانچہ پروفیسر شہباز نے بھی تائید کی ہے کہ ''اُردو زبان میں نوابی دربار سب سے پہلا فسانہ مکالمت کا ہے۔ فسانہ مکالمت سے میری مراد ڈرامہ ہے، جس کو ہندی میں ناٹک کہتے ہیں''۔

ناول:

ناول انگریزی کا لفظ ہے، انگریزی کے اثر سے اُردو میں آیا۔ ہمارے بعض نقادوں کا خیال ہے کہ اُردو ناول، ہماری ابتدائی داستانوں کی ترقی یافتہ صورت ہے، لیکن یہ بات کسی حد تک درست ہوسکتی ہے، فنی اعتبار سے داستانوں اور ناولوں میں بہت فرق ہے، ناول میں زبان و بیان اور کردار نگاری حقیقی زندگی کے قریب تر ہوتی ہے جبکہ داستانوں میں زیادہ تر مافوق الفطرت کرداروں اور ماحول پر انحصار کیا جاتا تھا۔ ماہرین کے نزدیک ناول کا آغاز ڈپٹی نذیر احمد سے منسوب ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر محمد صادق اپنی کتاب 'تاریخ ادب اُردو' میں لکھتے ہیں کہ ''نذیر احمد سے پہلے اُردو ناول موجود نہیں تھا، لہٰذا چند فنی خامیوں کے باوجود اُردو کے پہلے ناول نگار نذیر احمد ہیں اور ان کا پہلا ناول 'مراۃ العروس' ہے''۔ لیکن بعض نقادوں نے ڈپٹی نذیر احمد کو پہلے ناول نگار کا درجہ دینے سے احتراز کیا ہے۔ ایک عرصہ بعد ڈاکٹر

محبوب الٰہی (ریڈر و صدر شعبۂ اُردو، گورکھپور یونیورسٹی) نے 'خط تقدیر' مصنفہ کریم الدّین (اشاعت اوّل ۱۸۶۲ء) نامی کتاب کا جدید ایڈیشن مرتب کر کے، اسے اُردو کا پہلا ناول قرار دیا ہے اور اپنے مقدمے میں مندرجہ ذیل انکشافات کیے ہیں۔

الف:...... 'خط تقدیر' میں ناول کے پلاٹ کی جھلک ملتی ہے۔

ب:...... 'خط تقدیر' ایک اصلاحی ناول ہے۔

ج:...... 'خط تقدیر' سے اُردو میں قصہ گوئی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔

د:...... کریم الدّین نے اُردو قصے کو بعض ایسی قدریں دیں، جہاں تک نذیر احمد کی رسائی نہیں ہو سکی۔

بہر حال 'خط تقدیر' کو اولیت کا درجہ دینے پر بھی بعض نقادوں نے اپنے تحفظات کا اظہار کیا ہے۔ اسی سلسلہ میں ڈاکٹر افتخار محمد صدیقی نے اپنے ایک مضمون ''خطِ تقدیر...... اُردو کا پہلا ناول یا تمثیلی کہانی؟'' (نگار پاکستان۔ اکتوبر ۱۹۶۷ء) اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

''۔۔۔ اردو کہانیوں میں واقعیت اور مقصدیت کے عناصر انیسویں صدی کے وسط سے نمودار ہوئے۔ شعبہ تعلیم کے انگریز حکام کی رہنمائی میں نئے مدارس کے طلبہ کیلئے ایسی کہانیاں لکھی جانے لگیں جن میں اصلاحی اور اخلاقی نقطۂ نظر کے علاوہ واقعیت کا پہلو بھی موجود تھا۔ محمد عتیق صدیقی نے اپنی تصنیف ''صوبہ شمال مغربی کے اخبارات و مطبوعات'' میں ایسے چند قصوں کے نام گنائے ہیں جو محکمہ تعلیم کی فرمائش سے شائع ہوئے تھے۔ مثلاً ۱۸۵۱ء میں 'مطبع مصدر النوادر' آگرہ نے 'دھرم سنگھ کا قصہ' چھاپا تھا۔ بعد ازاں 'سورج پور کی کہانی' بھی اسی مطبع نے شائع کی تھی۔ اسی سال 'مطبع اسعد الاخبار' آگرہ میں ایک اخلاقی قصہ 'سبودھی کبودھی' کے نام سے محکمہ تعلیم کے لیے چھاپا گیا۔ گارساں دتاسی نے ۱۸۵۴ء کے خطبے میں تراجم کتب اردو کے سلسلے میں اول الذکر دونوں قصوں کے فارسی تراجم کا ذکر کیا ہے۔ ۱۸۵۶ء کے خطبے میں 'سبدھی کبدی' کے اُردو سے ہندی میں ترجمہ کیا جانے کا ذکر ہے۔ گارساں دتاسی نے محکمہ تعلیم کی بعض اور مفید کوششوں کا ذکر بھی کیا۔ مثلاً ۱۸۶۴ء میں محمد اسماعیل نے لڑکیوں کے مدارس کے لیے ایک کتاب 'نیرنگ نظر' لکھی۔ اسی سال مسٹر ایم۔ کیمپ سن 'ڈائریکٹر سررشتۂ تعلیمات نے ایک سبق آموز قصہ ''داستاں جمیلہ خاتون'' کے نام سے

تصنیف کیا۔ گارساں دتاسی نے ۱۸۶۵ء کے خطبے میں اس داستاں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔۔۔‘‘

اسی مضمون میں افتخار احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ ’’خط تقدیر‘‘ کی پوری تمثیل میں اول تا آخر ملاّ وجہی کی ’سب رس‘ کے اسلوب کی پیروی کی گئی ہے۔ دوسرے اگر بغرضِ محال ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر محمود الٰہی مرتب ’خط تقدیر‘) کے دعوے درست ہیں، تو ’سب رس‘ سے ’خط تقدیر‘ تک جتنی تمثیلین اور داستانیں لکھی گئیں ’ان میں سے ہر ایک کو ’اردو کا پہلا ناول‘ ثابت کیا جاسکتا ہے۔‘‘

قاضی مشتاق احمد کہتے ہیں کہ ’’ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ’مراۃ العروس‘ (۱۸۶۹ء) کو عام طور پر اردو کا پہلا ناول قرار دیا گیا ہے۔ بعد کی تحقیق کی رو سے مولوی کریم الدین کے ناول ’’خط تقدیر‘‘ (۱۸۶۲ء) کو اولیت دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ مشہور افسانہ نگار غلام عباس نے ایک انٹرویو (مشمولہ غلام عباس: ایک مطالعہ) میں فرمایا کہ شاد عظیم آبادی کے ناول ’’صورۃ الخیال‘‘ سے پہلے اردو میں کسی اور ناول کا سراغ نہیں ملتا۔ ’صورۃ الخیال‘ عرف ’ولایتی کی آپ بیتی‘ کی اشاعت ۱۸۷۶ء میں ہوئی تھی۔ ہر چند نذیر احمد کے ’مراۃ العروس‘ اور ’بنات النعش‘ کی اشاعت اس سے پہلے ہو چکی تھی۔ لیکن اکثر ناقدین کا خیال ہے کہ فنی نقطۂ نظر سے یہ ناول ’ناول‘ نہیں کہے جاسکتے۔ اس سلسلہ مں پرنسپل مدرسہ عالیہ‘ کلکتہ نے ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن کو اس ناول کے بارے میں ایک رپورٹ ۲۱ فروری ۱۸۸۱ء کو بھیجی تھی، جس میں یہ بھی لکھا تھا کہ ’’ہماری رائے میں یہ ناول ’مراۃ العروس‘ اور ’بنات النعش‘ سے بہ اعتبار ادب و انشاء کے کہیں بڑھی ہوئی ہے۔‘‘ (اردو نثر: ایک مطالعہ۔ صفحہ ۱۱۴)

اُردو کی پہلی ناول نگار خاتون:

اردو ادب کی تخلیقی سرگرمیوں میں خواتین کا نام بہت بعد میں آتا ہے، اس کی بڑی وجہ ہمارا سماجی اور عمرانی ڈھانچہ رہا ہے۔ جو خواتین کو کوئی ایسا قدم اٹھانے سے روکتا رہا‘ جس سے شریف گھرانوں کی طرف کسی کو انگلی اٹھانے کا موقع ملے‘ مگر جونہی انہیں مناسب تعلیم و تربیت کی فضا میسر آئی تو خواتین کو بھی علم و ادب کے میدان میں اپنی استعداد دکھانے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ خصوصاً فنون مفیدہ اور ادب لطیف کے میدان میں اپنی فطری صلاحیتوں کے اظہار کے لیے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

سیدہ افضال حسین نقوی نے "اردو کی پہلی خاتون ناول نگار" (روزنامہ حریت' کراچی۔ ۱۸۔اگست ۱۹۸۰ء) کے عنوان سے ایک مضمون سپرد قلم کیا تھا جس میں انہوں نے محمدی بیگم کو خواتین ناول نگاروں کی اس صدی کی سرخیل قرار دیا۔ محمدی بیگم کو اُردو میں خواتین کے پہلے اخبار کی مدیرہ ہونے کا بھی شرف حاصل ہے۔ اس خاتون نے آٹھ یا دس کتابیں بھی تصنیف کی ہیں، جو زیادہ تر خانہ داری کی تعلیم پر مبنی ہیں۔ ان میں صرف تین کتابیں 'شریف بیٹی' آجکل' اور 'صفیہ بیگم' ناول ہیں۔ ان ناولوں کی اشاعت کا زمانہ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۸ء پر محیط ہے۔

نقوی صاحب مزید لکھتے ہیں "۔۔۔اس میں کوئی کلام نہیں کہ محمدی بیگم کا فن اپنے تمام و کمال پر نہ پہنچ سکا' جس منزل پر اس راہ پر چلنے والی دیگر خواتین راہرو پہنچ گئیں۔ لیکن فی الواقع یہی کیا کم ہے کہ محمدی بیگم جو خواتین ناول نگاروں کی حد تک اس فن کی امام ہیں۔ انہیں اردو کی پہلی ناول نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔"

کہتے ہیں کہ تحقیق کے میدان میں کوئی دعویٰ بھی حرف آخر نہیں۔ چنانچہ پروفیسر قاضی مشتاق احمد اپنی کتاب 'اردو نثر: ایک مطالعہ' (صفحہ ۱۱۵) میں لکھتے ہیں کہ "۔۔۔رشید النساء بیگم اردو کی پہلی خاتون ناول نگار ہیں، جن کا ناول "اصلاح النساء ۱۸۸۱ء میں لکھا گیا ہے اور ۱۸۹۴ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ ناول پر نذیر احمد کے 'مراۃ العروس' کے اثرات ہیں۔ 'اصلاح النساء' کے قصے میں 'مراۃ العروس' کے کرداروں 'اصغری' اور 'اکبری' کا ذکر آیا ہے۔ لیکن فنی اعتبار سے یہ 'مراۃ العروس' سے آگے ہے۔ 'اصلاح النساء' سے پہلے اردو میں کسی خاتون ناول نگار کا اتا پتا نہیں ملتا۔۔۔"

سیدہ وقار عظیم نے بھی اپنے ایک مضمون (صحیفہ ۴۳۔اپریل ۱۹۶۸ء) میں قاضی مشتاق احمد کے دعویٰ کی تائید کرتے ہوئے لکھا "۔۔۔رشید النساء بیگم (متوفی ۱۹۳۱) شمس العلماء سیدہ وحید الدین کی تعلیم یافتہ اور روشن خیال بیٹی تھیں۔ انہوں نے ۱۸۸۱ء میں 'اصلاح النساء' کے نام سے ایک اصلاحی اور سماجی ناول لکھا۔ اس میں ہندوستانی خواتین کی ایسی رسموں اور جھگڑوں کو موضوع بنایا' جو شریف خاندانوں کی تباہی کا باعث بن رہے تھے۔۔۔"

پروفیسر سید وقار عظیم صاحب نے اسے خواتین کا لکھا ہوا پہلا ناول شمار کیا ہے۔ حالیہ دنوں میں مشہور رائٹر اور کالم نگار زاہدہ حنا کا ایک کالم '۹۹ برس پہلے' (اردو روزنامہ ایکسپریس۔ ۱۷ اکتوبر ۲۰۰۷ء) نظر سے گزرا۔ جس میں ناول نگاری کے باب میں موصوفہ نے ایک نیا نام متعارف کرایا ہے۔ لکھتی ہیں کہ انہیں پبلشنگ ادارہ کی جانب سے ایک ناول کا مسودہ ان کی رائے جاننے کیلئے ملا جو بقول پبلشر اب سے ۹۹ برس قبل لکھا گیا تھا۔ ناول نگار خاتون کا نام عالیہ خاتون المعروف بنت فاطمہ نقویہ ہے اور ناول کا عنوان 'نشیب وفراز' ہے۔ بتایا گیا کہ بنت فاطمہ مرحومہ نے یہ ناول اس وقت لکھا، جب ان کی عمر صرف بیس برس تھی۔

ہر چند زاہدہ حنا صاحبہ نے اس ناول پر طویل کالم لکھا، تاہم چند ضروری اور بنیادی معلومات نہ مل سکیں کہ یہ ناول کب لکھا گیا، یہ مسودہ جوں کا توں اپنی اصلی حالت میں کہاں دستیاب ہوا۔ اس پر پہلے بھی کسی نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے یا نہیں۔ زاہدہ حنا صاحبہ کی تو ساری عمر علمی و ادبی ماحول میں گزری ہے۔ انہیں تو اس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ تحقیق کا تعلق خیالی باتوں اور مفروضوں سے نہیں بلکہ حقائق سے ہوتا ہے۔ بہر حال اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ بنت فاطمہ کا تحریر کردہ یہ ناول ۹۹ برس قبل لکھا گیا تھا، تو تقریباً اس کا سن تحریر ۱۹۰۸ء کے لگ بھگ بنتا ہے۔ اور ماہرین اسے 'پرکھ پرچول' کے بعد صحیح مان لیں' تو یقیناً اسے ناول نگاری کے باب میں نقش اوّل قرار دیا جاسکتا ہے۔

پہلا افسانہ نگار:

شارٹ سٹوری کا رواج انگریزی سے اردو ادب میں آیا۔ شروع شروع میں مختصر افسانے لکھنے والوں میں سجاد حیدر یلدرم، منشی پریم چند، سدرشن، سلطان حیدر جوش، اعظم کریوی اور علی عباس حسینی وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جب کسی ایک کو 'اولیت' کا مقام دینے کی باری آئی تو قیاس کی بجائے تحقیق سے کام لینا پڑا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر فردوس انور قاضی اپنی کتاب 'افسانہ نگاری کے رجحانات' (صفحہ ۶۹) پر لکھتی ہیں:

"۔۔۔اردو افسانہ نگاری کے ابتدا ہی میں دو نام ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک پریم چند اور دوسرا سجاد حیدر یلدرم۔ دونوں نے ایک ہی زمانہ میں افسانہ نگاری شروع کی۔ چونکہ سجاد حیدر یلدرم کے

افسانے انشائیہ کے قریب ہیں' ان میں افسانے کی فنی خصوصیات بھی نسبتاً کم نظر آتی ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے زیادہ تر ترجمہ کیے ہیں۔اس لیے اردو کا پہلا افسانہ نگار پریم چند کو ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔۔۔''

ویسے کہنے والے تو یہی کہتے ہیں کہ یلدرم اردو ادب میں ادب لطیف اور رومانی تحریک کے پیشرو ہیں۔جبکہ پریم چند پہلے شخص ہیں' جنہوں نے اُردو میں باقاعدہ افسانہ نگاری کی بنیاد رکھی۔پریم چند کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۰۱ء میں ہوا اور ان کا پہلا افسانہ 'انمول رتن' ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا' جو حکومت نے ضبط کر لیا۔ڈاکٹر انور سدید کا اس سلسلہ میں کہنا ہے کہ ''۔۔۔دستیاب شواہد کی بناء پر سجاد حیدر یلدرم کا افسانہ 'غربت و وطن' جسے خود یلدرم نے طبعزار قرار دیا ہے۔یہ افسانہ چونکہ پریم چند کے پہلے افسانے سے قریباً ایک سال پہلے چھپ چکا تھا۔اسی لیے اس افسانے کو اردو کا پہلا طبع زاد افسانہ اور سجاد حیدر یلدرم کو پہلا افسانہ نگار تسلیم کرنا مناسب ہوگا۔۔۔'' (اردو ادب کی مختصر تاریخ۔صفحہ ۳۴۹)

قاضی مشتاق احمد کے نظریے کے مطابق ''۔۔۔اُردو کے اولین افسانہ نگاروں میں بالعموم سجاد حیدر یلدرم اور پریم چند کے نام آتے ہیں۔ایک وقت تھا جب پریم چند کو اردو کا پہلا افسانہ نگار تسلیم کیا جاتا تھا۔ان کا اولین افسانہ 'دنیا کا سب سے انمول رتن' خود ان کے بیان کے مطابق ۱۹۰۷ء میں (رسالہ زمانہ، کانپور) میں چھپا تھا۔(بحوالہ ہندی رسالہ 'ہنس' بنارس۔آتم کتھا نمبر۔فروری ۱۹۳۲ء)۔مانک ٹالہ کی تحقیق ہے کہ پریم چند کا کوئی افسانہ ۱۹۰۷ء میں زمانہ' میں نہیں چھپا۔ان کی پہلی کہانی ۱۹۰۸ء کے 'زمانہ' میں 'عشق دنیا' اور 'حب وطن' کے نام سے چھپی (ہماری زبان' دہلی ۱۸۔اگست ۱۹۸۲ء)۔نئی تحقیق نے سجاد حیدر یلدرم کی تحریر' نشے کی پہلی ترنگ' (مطبوعہ معارف، علی گڑھ۔اکتوبر ۱۹۰۰ء) کو ان کا پہلا افسانہ قرار دیا ہے۔یلدرم کے مجموعے 'خیالستان' (لاہور ایڈیشن ۱۹۷۶ء) کے مرتب ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے اپنے مقدمے میں داد تحقیق دی ہے۔اور اس کی تائید ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنی کتاب 'اُردو افسانہ اور افسانہ نگار' میں کی ہے۔معروف نقاد پروفیسر عتیق احمد (کراچی) علی محمود کو باضابطہ افسانہ نگار تسلیم کرتے ہیں۔لہٰذا اُردو کے اوّلین افسانہ نگاروں کی تثلیث سجاد حیدر یلدرم' علی محمود اور پریم چند سے بنتی ہے۔۔۔''
(اردو نثر: ایک مطالعہ۔ از قاضی مشتاق احمد۔صفحہ ۱۱۵)

انشائیہ کی ابتداء

ایک روایت کے مطابق 'انشائیہ' فرانس اور انگلستان سے ہوتا ہوا اردو ادب میں آیا۔ انشائیہ کو انگریزی کے Light Essay سے متاثرہ صنف کہا جا سکتا ہے۔ یوں تو مضامین نویسی کا سلسلہ اُردو ادب کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ فروغ پاتا رہا۔ سرسیّد احمد خاں اور خواجہ حسن نظامی، مہدی افادی، فرحت اللہ بیگ اور سجاد حیدر یلدرم وغیرہ کے مضامین میں ادبِ لطیف اور انشائیہ کی جھلک تو ملتی ہے، مگر ان کے مضامین انشائیے کے زمرے میں نہیں آتے۔

انور جمال صاحب اپنی کتاب 'ادبی اصطلاحات' (صفحہ ۱۵) میں لکھتے ہیں: "۔۔۔اُردو میں انشائیے کا لفظ غالباً سب سے پہلے اختر اورینوی نے استعمال کیا ہے۔ لیکن اس لفظ کو صنفِ نثر اور اصطلاح کی حیثیت سے فروغ دینے میں ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید نے پہل کی۔"

اس سلسلہ میں پروفیسر ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ (صدر شعبہء اُردو گورنمنٹ کالج، جڑانوالہ) اپنی کتاب "اردو ادب بیسویں صدی میں" میں لکھتے ہیں:

"۔۔۔بیسویں صدی میں تقسیم کے بعد جس صنف نے تیزی سے ترقی کی وہ انشائیہ کی صنف ہے۔ بیسویں صدی سے قبل سرسید احمد خاں، محمد حسین آزاد، مولوی نذیر احمد، عبدالحلیم شرر کے بعض مضامین میں انشائیہ کی بعض صفات ملتی ہیں۔ بیسویں صدی میں فرحت اللہ بیگ، آغا شاعر قزلباش، ناصر علی دہلوی، شیخ عبدالقادر، نیاز فتح پوری، مہدی افادی، عبدالعزیز فلک پیما، سجاد حیدر یلدرم، ابوالکلام آزاد، خواجہ حسن نظامی، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، کرشن چندر ایسے لکھنے والے ہیں جنہوں نے لکھنے کو مضامین ہی لکھے لیکن ان میں انشائیہ کے خدوخال واضح نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید کے نزدیک انشائیہ کا لفظ ڈاکٹر وزیر آغا کی ایجاد ہے۔ قیام پاکستان کے بعد 'ادبِ لطیف' کے صفحات پر یہ بحث چلی کہ انگریزی زبان کے لفظ Light Essay کے لئے کون سی اصطلاح استعمال کی جائے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اس پر ایک تحقیقی مقالہ بھی تحریر کیا پھر دوسرے ادیبوں، شاعروں کے مضامین بھی اس سلسلے میں شائع ہوئے۔ اس کے لئے مضمونِ لطیف، انشائے لطیف، لطیف

پارہ، ادب پارہ، خیال پارہ، فلک پارہ کی تراکیب 'ادب لطیف' کے صفحات کی زینت بنتی رہیں۔ اختر اورنیوی نے پہلی مرتبہ ۱۹۴۴ء میں علی اکبر قاصد کے مضامین کے لئے انشائیہ کا لفظ استعمال کیا تھا۔ ۱۹۵۹ء کے لگ بھگ ڈاکٹر وزیر آغا نے یہ اصطلاح ایسے (Essay) کے لئے استعمال کی۔

مرزا ادیب کے اس بیان سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ مرزا صاحب کہتے ہیں: ''شاید ہمارے قارئین یہ بات بھولے نہیں ہونگے کہ انشائیہ بطور ایک اصطلاح کے ڈاکٹر وزیر آغا نے رائج کی تھی۔''

اسی سلسلے میں احمد جمال پاشا اپنے ایک مضمون 'انشائیہ کی اصطلاح' (کتاب نما، دہلی نومبر ۱۹۸۳ء، ص ۴۰) میں تحریر کرتے ہیں۔ ''۔۔۔ انشائیہ کی اصطلاح ڈاکٹر وزیر آغا نے مضامین کے لئے نہیں بلکہ شخصی مضامین کے لئے نہ صرف استعمال کی بلکہ اسے فنی طور پر برتا بھی۔ اس لئے انشائیہ کی تحریک کا انہیں سے آغاز ہوتا ہے، وہی اس کے باوا آدم ہیں۔''

پروفیسر جمیل آذر ''اردو کے بہترین انشائیے'' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''۔۔۔ ڈاکٹر وزیر آغا پہلے ادیب ہیں جنہوں نے انشائیہ کے عناصر ترکیبی اور اس کی روح کو دریافت کیا۔ ۱۹۶۱ء میں اُردو انشائیوں کا پہلا مجموعہ ''خیال پارے'' شائع ہوا تو اس کی اشاعت کے ساتھ ہی اردو ادب میں جدید انشائیہ کی باقاعدہ تحریک کا آغاز ہو گیا۔۔''

ڈاکٹر انور سدید صاحب کی تحقیق اس سلسلہ میں گویا حرفِ آخر ہے۔ فرماتے ہیں:

''۔۔۔ وزیر آغا کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف اس صنف کا نام تلاش کرنے میں سرگرم حصہ لیا بلکہ ایک تخلیق کار کی حیثیت میں اس صنف کا دامن گلہائے تازہ سے بھرنے کی کوشش کی۔ بحیثیت نقاد انہوں نے اس صنف کے تخصیصی نقوش ابھانے اور اس کی فنی بوطیقا مرتب کی۔ (انشائیہ اُردو ادب میں۔ صفحہ ۲۲۵)

ڈاکٹر وزیر آغا کے ہم عصروں میں ڈاکٹر انور سدید، پروفیسر مشتاق قمر، مشکور حسین یاد، احمد جمال پاشا، رام لعل، غلام جیلانی اصغر، کے اسمائے گرامی لئے جا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر نوازش علی اپنی مرتب کردہ کتاب ''پاکستان میں اُردو ادب کے پچاس سال'' میں انشائیہ کی ابتداء کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر وزیر آغا نے اردو میں انشائیہ نگاری کا باقاعدہ آغاز کرنے، انشائیہ نگاری کو ایک تحریک بنانے اور اس صنف کے خدوخال واضح کرنے کا سلسلہ میں جو خدمات انجام دیں ہیں، ان کے پیشِ نظر انہیں جدید اُردو انشائیہ کا سرخیل کہنا بے جا نہ ہوگا۔۔''

کتابیات

۱۔ تحسین اُردو — از پروفیسر آسی ضیائی رامپوری ودیگر

۲۔ تاریخ ادب اردو — از پروفیسر یوسف زاہد

۳۔ کلام شاہ مراد — شائع کردہ لوک ورثہ کا قومی ادارہ۔ اسلام آباد

۴۔ نقوشِ سلیمانی — سیّد سلیمان ندوی

۵۔ اُردو شاعری پر ایک نظر — از محمد جمیل احمد

۶۔ آبِ حیات — مولانا محمد حسین آزاد

۷۔ دکن میں اُردو — نصیرالدین ہاشمی

۸۔ داستاں تاریخ اُردو — حامد حسن قادری

۹۔ تاریخ ادب اردو — رام بابو سکسینہ

۱۰۔ اُردو کا افسانوی ادب — سید اصغر علی شاہ جعفری

۱۱۔ کاروانِ صحافت — ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

۱۲۔ اُردو ادب — پروفیسر جمیل احمد انجم

۱۳۔ اُردو افسانے میں رومانی رجحانات — ڈاکٹر محمد عالم خاں

۱۴۔ تذکرے وتبصرے — پروفیسر سید سراج الاسلام

۱۵۔ اُردو نثر: ایک مطالعہ — قاضی مشتاق احمد (دہلی)

۱۶۔ پنجاب میں اُردو — حافظ محمود شیرانی

۱۷۔ مضمون 'اُردو زبان کی پہلی تصنیف' — از ڈاکٹر جمیل جالبی

(رسالہ نیا دور۔ کراچی۔ شمارہ ۶۴۔ ۶۳۔ صفحہ ۱۵)

مسلم شمیم

ادب اور نظریات

عہد جدید کی خصوصیات میں جس کا آغاز یورپ میں نشاۃِ ثانیہ سے ہوتا ہے، مختلف نوعیت اور جہت کی دریافتیں، سائنسی ایجادات اور انقلابات شامل ہیں۔ دریافتوں اور ایجادات کی ایک طویل فہرست ہے جس نے حالاتِ زیست کے ساتھ سوچ اور اقدار دنیا کو بڑی بنیادی تبدیلیوں سے روشناس کرایا۔ اٹھارویں صدی میں برطانیہ میں برپا ہونے والے صنعتی انقلاب انقلابِ فرانس (۱۷۸۹ء) اور روس کے اشتراکی انقلاب (۱۹۱۷ء) نے نئے عہد کی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کیا اور معاشی، سماجی اور سیاسی زندگی میں دور رس انقلابی تبدیلیوں اور امکانات کے لیے راہیں ہموار کیں۔ ان انقلابات کے بطن سے متعدد منفی اور مثبت نظریات کا عالمی منظرنامے پر ظہور ہوا۔ ان نظریات کے دائرے میں فسطائیت اور اشتراکیت بیسویں صدی میں رونما ہونے والے وہ نظریات ہیں جن سے کرۂ ارض کا چپا چپا متاثر ہوا اور فکر و شعور کی دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ مذکورہ نظریات کے علاوہ جہانِ فکر و دانش میں متعدد کئی متنازعہ نظریات اور رجحانات ابھرے اور اپنے اثرات مرتب کیے جن میں نراجیت اور وجودیت کے نظریات خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر اور قابلِ توجہ رہے ہیں۔ وجودیت کے فلسفے کا اظہار ادب و فن میں جدیدیت کے نام سے ہوا، وجودی فلسفے کے مطابق انسان صرف فردِ واحد ہے، نہ فردِ واحد سے کم اور نہ فردِ واحد سے زیادہ اور اس کائنات میں وہ تنہا ہے۔ اس کے اطراف خوف، دہشت اور اندیشوں کے گھرے سائے پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے وجود یا ہونے کا کرب تنہا برداشت کرتا ہے۔ وجودیت کا یہی رویہ اور تصور مختلف انداز میں گوگول، دوستوفسکی، کافکا، نطشے اور سارتر کے یہاں پایا گیا وجودی مفکروں کے نزدیک انسان کا ہونا اور مرنا جبر ہیں۔ اس رویے نے ادب میں فردیت ابہام، احساسِ تنہائی اور مسلمہ ادبی قدروں سے انحراف کی صورت پیدا کی معاشرے میں اس سے نراجیت کا رجحان پیدا ہوا، سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت میں فرد کی آزادی کے نام پر فرد پرستی اور معاشرہ بیزاری کے رجحانات کا فروغ ہوا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ فرد اور معاشرہ

دو متضاد چیزیں ہیں بلکہ سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت اس منفی رجحان کا اصل سرچشمہ ہے اور یہ فکر کہ فرد ہی سب کچھ ہے اور معاشرہ اس پر ایک جبر ہے، اسی نظریہ کا تنہا شاخسانہ ہے۔ تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ فرد اور معاشرہ کوئی دو الگ الگ اور باہم متضاد حقیقتیں نہیں ہیں بلکہ افراد کے باہمی رشتوں کی کلی عملی صورت کو معاشرہ کہتے ہیں جو بہتر زندگی کے حصول کی جدوجہد میں استوار ہوتا ہے۔ فردیت کے نظریے کے مدِ مقابل اجتماعیت میں مذکورہ فسطائیت کا منفی نظریہ اور اشتراکیت کا مثبت نظریہ غالب موضوعات کے طور پر بیسویں صدی میں زیرِ بحث رہے۔

بیسویں صدی خاص طور پر عہدِ جدید کی وہ صدی ہے جس میں دریافتوں اور ایجادات یعنی سائنسی معجزوں نے انسانی معاشرے میں ایسی تیز رفتار تبدیلیاں پیدا کیں کہ اس صدی میں نئے نظریات کی نشو و نما اور ان کے زیرِ اثر انقلابات کا برپا ہونے کا ایک لامتناہی سلسلہ ملتا ہے۔ مذکورہ نظریات میں اشتراکیت اور فسطائیت نے خصوصیت کے ساتھ دنیائے ادب کو کثیر الجہت عمل اور ردِ عمل کے عوامل سے دو چار کیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران ۱۹۱۷ء میں انقلابِ اکتوبر کا ظہور پذیر ہونا اور پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد ۱۹۳۰ء کے عشرے میں فسطائیت کا بھیانک جن جرمنی، اٹلی اور جاپان کی سرزمین پر نمودار ہوا اور اس نے دنیا کو دوسری عالمی جنگ کی ہولناکیوں سے دو چار کیا۔ فسطائیت نے جہاں قوموں کی آزادی کو سلب کرنے کی مہم کو اپنی منزلِ مقصود قرار دیا، وہیں ادب و ثقافت پر شب خون مارنے کی منظم حکمتِ عملی اپنائی اور اس طرح انسانی تہذیب و تمدن کو سنگین خطرات سے دو چار کیا۔ چنانچہ دنیا کے ادیبوں، دانش وروں اور شاعروں نے پیرس میں منعقدہ عالمی کانگرس برائے تحفظِ ثقافت میں فسطائی نظریے سے نبرد آزما ہونے کی ٹھانی۔ ایک اعلان نامہ جاری ہوا اور فسطائیت کی تھوپی ہوئی جنگ کے خلاف آواز بلند کی گئی اور 'امن' ادب کا ایک اہم موضوع بنا۔ اس جنگ میں اشتراکی اور سرمایہ دارانہ جمہوری قوتوں نے متحد ہو کر فسطائیت کا مقابلہ کیا اور اسے شکستِ فاش ہوئی۔ اس معرکہ آرائی میں جمہوریت، اشتراکیت اور فسطائیت کے نظریات کے درمیان ہونے والے تصادم میں دنیا کے ادیبوں نے اپنے کردار متعین کیے، ان میں کچھ فسطائی کیمپ کے حامی ٹھہرے اور قلم کاروں کی بھاری اکثریت نے جمہوریت اور اشتراکیت

کے اتحاد کا ساتھ دیا۔ دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد یعنی ۱۹۴۵ء کے بعد جلد ہی ایک نئی جنگ سرمایہ دارانہ دنیا اور اشتراکی دنیا میں چھڑ گئی یعنی سرد جنگ جو اشتراکی دنیا کی شکست و ریخت پر ۱۹۹۱ء میں منتج ہوئی۔ تاریخ کے اس موڑ پر بیسویں صدی میں جو نظریات کی نشو و نما اور فروغ کی صدی قرار پائی تھی، نظریات کی شکست و ریخت کی بات کی گئی، بعد ازاں End of History کا شوشہ چھوڑا گیا اور پھر تہذیبوں کے تصادم کے نام پر سرمایہ دارانہ دنیا کے قائد ریاست ہائے متحدہ امریکا کو اپنے جارحانہ عزائم کی تکمیل کی راہیں ہموار کرنے کا جواز فراہم کیا گیا۔

نظریات کا ادراک و تفہیم سماج میں عہد بعہد تبدیلیوں کے ادراک و تفہیم کے لیے کتنی اہمیت کی حامل ہے، اس پر گفتگو کو طول دینا میرے نزدیک غیر ضروری ہے۔ ادب کا مرکزی موضوع انسان اور انسانی سماج ہے۔ انسان کے مسائل اور مشکلات عہد بعہد پیچیدہ تر ہوتے رہے ہیں۔ انسان کا شعور تاریخ کے ارتقائی سفر میں وسیع سے وسیع تر دائرے میں پھیلتا رہا ہے۔ انسان تسخیرِ کائنات کی مہمات میں آج جن بلندیوں پر ہے اور سماجی زندگی ان کے زیرِ اثر جن حالات اور امکانات سے دوچار ہے، یہ سب کچھ ہمارے شعور کا حصہ ہونا چاہیے اور اس شعور کا اظہار جمالیاتی تقاضوں اور معیارات کے مطابق ادب میں ہونا زندگی آموز اور زندگی آمیز ادب کا خاصہ ہے۔ مذکورہ بیشتر جدید نظریات مغرب سے ہم تک پہنچے ہیں اردو شعر و ادب میں مغربی فکر اور سماجی نظریات کا سب سے پہلے خیر مقدم ہمیں مرزا غالب کے ہاں ملتا ہے۔ ''آئینِ اکبری'' کی منظوم تقریظ میں خصوصیت کے ساتھ مرزا غالب نے مغرب میں رونما ہونے والے تغیرات و ایجادات کی روشنی میں نئے عہد کی نوید سنائی تھی اور سرسید کو مشورہ دیا تھا کہ ماضی کے کھنڈروں سے نکلیں اور نئے عہد کا ادراک حاصل کریں اور اس کے فیوض و برکات سے اپنے سماج کو ترقی کی راہ پر گامزن کریں۔ تقریظ کی تمہید میں مرزا غالب سرسید کی تعریف کرتے ہیں کہ ایک دیدۂ بینا نے کہنگی کو نیا لباس پہنایا ہے لیکن ''آئینِ اکبری'' کی تصحیح ان کی ہمتِ والا کے لیے باعثِ ننگ و عار ہے۔ مرزا نے نئے عہد کی نوید اور نئے نظامِ حیات یعنی نئے نظریۂ حیات کی وضاحت کرتے ہوئے مذکورہ تقریظ میں کہا کہ ''انگریزوں نے ایسے قوانین اور آئین کا اجرا کیا ہے جو پہلے سننے میں نہ آیا تھا۔ فنون میں فن

کاروں نے وہ کمال حاصل کیا کہ اپنے بزرگوں کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ آئین کی پاس داری اسی قوم کا حق ہے۔ ان سے زیادہ انتظام و انصرام کو کوئی نہیں جانتا۔ انہوں نے حکومت اور انصاف کے بل بوتے پر ہندوستان میں قانون کی عمل داری کو سو گنا بڑھا دیا ہے۔ لوگ پتھر سے آگ جلاتے ہیں جبکہ انگریز تنکے (دیا سلائی) سے آگ پیدا کرتے ہیں۔ انہوں نے پانی کو رام کرلیا ہے اور اس میں کشتیاں اور جہاز چلتے ہیں۔ ان کے آگے پانی اور طوفان بے بس نظر آتے ہیں۔ وہ ہوا (گیس) کو آگ لگا دیتے ہیں جو کوئلوں کی طرح جلتی ہے۔ ان کے دستور میں سینکڑوں دساتیر سموئے ہوئے ہیں۔ میرے دوست! کیا تمہارے دستور میں بھی ایسی عمدہ باتیں ہیں؟ مردہ لوگوں کی پوجا کرنا وقت گزاری کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔ کیا تمہیں نظر نہیں آتا کہ تمہارا دستور محض لفاظی ہے؟'' اس طرح مرزا غالب نے سرسید کی رہنمائی کی۔ سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی اور علی گڑھ تحریک اسی فکر کی عملی شکل ہے، اس طرح مرزا غالب اور سرسید کے بعد مغربی نظریات اردو ادب میں حالی اور اقبال کی وساطت سے واضح خطوط کے ساتھ نظر آئے، خاص طور پر اردو شاعری میں جدید نظریات کی کارفرمائی اقبال کی شاعری میں پہلی مرتبہ پورے سیاق و سباق کے ساتھ جلوہ گر ہوئی۔ علامہ اقبال کی شاعری کا وقیع حصہ ان نظریات سے مزین ہے جو انہوں نے مغرب سے سیکھے تھے۔ اس تناظر میں ادب اور نظریے کے باہمی روابط اور رشتے ڈھونڈنا سراب کا نظارہ کرنا نہیں ہے۔

اس موضوع پر آگے بڑھنے سے پہلے انتظار حسین کی ایک تحریر کا ذکر ناگزیر ہے۔ یہ تحریر ان کا ایک کالم ہے جو ایک معروف انگریزی روزنامے میں شائع ہوا تھا جس کا عنوان 'Creativity Versus Ideology' تھا، جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ ہم لوگ نظریہ زدہ وقت میں جی رہے ہیں، ادیب خصوصیت کے ساتھ اس صورتِ حال کا شکار ہے، لیکن یہ دیکھا گیا ہے کہ ادیب کا تخلیقی تجربہ اس کی نظریاتی سوچ کے تابع نہیں ہوتا اور نہ اس کے نظریاتی تصور کے سامنے سپر انداز ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے دعوے کی دلیل میں یہ فرمایا ہے کہ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ فیض کی شاعری سے وہ لوگ بھی محفوظ اور مستفید ہوتے ہیں جو ان کے نظریات سے اتفاق نہیں کرتے۔ آخری فقرے ان کے الفاظ میں یہ ہیں:

"IN FACT THE IDEOLOGICAL THINKING OF THE WRITER COMES

TO A STOP THE MOMENT HIS CREATIVE EXPERIENCE COMES INTO OPERATION. CREATIVITY IS A FIT REPLY TO IDEOLOGY"

گویا انتظار حسین کے نزدیک نظریہ اور تخلیقیت میں تضاد ہے اور ادب اور نظریہ ایک دوسرے کے مدِ مقابل ہیں۔ انتظار حسین نے فیض کی فکر کو رد کرتے ہوئے فیض کی ثنا خوانی کی ہے۔ وہ دراصل ترقی پسند نظریے سے اپنے دیرینہ اختلاف کا اظہار کرنے کے لیے موقع اور محل ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ حال میں ایک ٹیلیوژن کے پروگرام میں جو مشہور و معروف افسانہ نگار قرۃ العین حیدر کے حوالے سے نشر ہوا تھا، اپنے اظہار میں انہوں نے قرۃ العین حیدر کو غیر ترقی پسند تخلیق کاروں میں شمار کیا۔ جہاں تک دیگر نظریات کا تعلق ہے، ان کی سوچ کے دھارے وجودیت کے نظریے سے ملتے ہیں جو زندگی بیزار رویوں کا علم بردار اور انسان کے تنہا ہونے کے المیے کا ترجمان نظریہ ہے۔ ان کی روایت پسندی دراصل ماضی پرستی سے عبارت ہے۔ وہ زندگی جس دور میں گزار رہے ہیں اور یہ زندگی جس سماجی ارتقائی سفر کا نتیجہ ہے، اس کی طرف سے انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ تخلیقیت کا سر چشمہ کسی اور دنیا میں دیکھتے اور کسی اور زندگی میں ڈھونڈتے ہیں۔ فیض کا آدرش انہیں ناپسند ہے، کیونکہ فیض کا آدرش زندگی کو تاریخی ارتقائی سفر کے تناظر میں دیکھنے کی بصیرت عطا کرتا ہے۔ سماج سے باہر فرد کی حسیت اور تصور ایک طرف قنوطیت کی سمت سفر کرتا ہے اور دوسری طرف دروں بینی کے مرض میں مبتلا کرتا ہے۔ انتظار حسین جس تخلیقیت کی بات کرتے ہیں، وہ اسی دروں بینی او وجدان سے مستعار ہے۔ اس مکتبۂ فکر کے مطابق شاعری صناعی نہیں بلکہ خلاقی ہے اور خلاقی کو خالص شعوری عمل سمجھنا قرینِ قیاس نہیں۔ ہنری جیمز کہتا ہے کہ "ہم تاریکی میں کام کرتے ہیں"۔ نظریے کو تخلیقیت کی ضد قرار دینا دراصل شعور اور عقل دشمنی کی وکالت کرنا ہے۔ ادب اور نظریے کا تضاد بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ یہاں میں ایک غیر ترقی پسند ناقد کلیم الدین احمد کی رائے پیش کر رہا ہوں جو موضوع زیرِ بحث کے حوالے سے معنویت کی حامل ہے "شاعر اپنے عہد میں ادراک کے بلند ترین مقام پر ہوتا ہے۔ وہ بلبل کی طرح عالمِ بے اختیاری میں گاتا نہیں، وہ جو کچھ کہتا ہے سوچ سمجھ کر کہتا ہے۔ میں اس وقت آرٹ اور تحت الشعور کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا، صرف یہ

بتا دینا چاہتا ہوں کہ آرٹسٹ جو کچھ کرتا ہے، شعوری طور پر کرتا ہے اور فنی کارنامہ ایک شعوری عمل ہے"۔

کلیم الدین احمد کی مذکورہ بالا رائے کی روشنی میں عالمی ادب پر نظر ڈالتے ہیں تو خواہ وہ شعری ادب ہو یا افسانوی ادب، اس میں شعور کی کارفرمائی بدرجۂ اتم نظر آتی ہے بلکہ شعور کی بلندیوں کو چھوتی نظر آتی ہے۔ قدیم کلاسیکی ادب میں ہومر اور ورجل کی تخلیقات ہوں یا ڈانٹے کی تخلیق، ولیم شیکسپیئر کی شاہکار تخلیقات ہوں یا گوئٹے کی معجز بیانی، ٹالسٹائی کے ناول ہوں یا چیخوف، گورکی اور شولوخوف کی عالمی شہرت کے حامل تخلیقی جواہر پارے، ہر جگہ سماجی شعور کی بلندیاں نظر آتی ہیں اور سماجی شعور کا ان تخلیقات میں اظہار عالمِ جذب وکیف میں سرشاری کا بیان نہیں بلکہ زندگی اور سماج کے حوالے سے ظہور پذیر ہونے والے نظریات کا ادب میں پرتو نظر آتا ہے۔ فارسی شاعری کی شاہکار تخلیقات فردوسی کا شاہ نامۂ ایران اور مولانا رومی کی مثنویاں، یہ سب کچھ فکر وشعور کا ہی کرشمہ ہے۔، جس کا منبع نظریات ہوتے ہیں۔ اردو شاعری میں مسدسِ حالی اور علامہ اقبالؒ کی شاہکار نظمیں، یہ سب کچھ اعلیٰ شعور کے تحت عملِ تخلیق کی کار پردازی ہے۔ تخلیق وظیفۂ حیات نہیں بلکہ سلیقۂ حیات ہے، وہ سلیقہ جو فطرت اور جبلت دونوں پر قابو پا کر زندگی کو مجموعی حیثیت سے حسین تر بناتا ہے۔ تہذیب کے تمام مظاہر، آرٹ اور فن کے تمام نمونے اور علم وآگہی کے تمام کرشمے انسان کی تخلیق ہیں جناب احمد ہمدانی کے نزدیک کارِ تخلیق میں ذہنِ انسانی دو متوازن پگ ڈنڈیوں پر سفر کرتا ہے، ان میں سے ایک پگڈنڈی فطرت سے ذات کی طرف آتی ہے اور دوسری اس کی ذات سے نکلتی ہے اور خارج میں پھیل جاتی ہے۔ پہلی پگڈنڈی کا سفر اس کو قوانینِ فطرت کا شعور بخشتا ہے جس سے وہ تسخیرِ فطرت کرتا ہے اور خارج کے ماحول کو اپنے لیے سازگار بنانے کے گر سیکھتا ہے اور دوسری پگڈنڈی پر وہ جبلتوں اور خواہشوں پر غلبہ حاصل کر کے ان کو خارجی ماحول سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ سب کچھ کارِ تخلیق میں شعور اور سماجی عمل کی دین ہے۔

تخلیقیت اور نظریے میں تضاد کی نشان دہی کرنے والا مکتبۂ فکر اور ادب اور نظریے کو متصادم قرار دینے والے اربابِ فکر ونظر فردیت کو اجتماعیت پر فوقیت دیتے ہیں اور ان کے نزدیک فرد کا انفرادی تجرباتی سفر فن کا سرچشمہ قرار پاتا ہے۔ فرد کا انفرادی تجرباتی سفر بھی سماج سے باہر نہیں ہوتا بلکہ سماج کے

اندر رہ کر ہوتا ہے۔اس نکتے کے وضاحت کے لیے میں رابندر ناتھ ٹیگور کا ایک اقتباس پیش کر رہا ہوں، ملاحظہ ہو: ''سماج سے الگ تھلگ رہنے والا ادیب بنی نوع انسان سے آشنا نہیں ہو سکتا۔ بہت سے لوگوں سے مل کر جو تجربہ حاصل ہوتا ہے، الگ رہ کر ادیب اس سے محروم رہ جاتا ہے۔سماج کی نبض پر ہاتھ رکھیں اور اس کے دل کی دھڑکنوں کو سنیں۔یاد رکھو! تخلیقِ ادب بڑے جوکھوں کا کام ہے۔حق اور حسن کی تلاش کرنا ہے تو پہلے انا کی کینچلی اتارو، کلی کی طرح سخت ڈنٹھل سے باہر نکلنے کی منزل طے کرو، پھر دیکھو کہ ہوا کتنی صاف ہے، روشنی کتنی سیانی ہے اور پانی کتنا لطیف ہے''۔

سماجی زندگی میں حاصل ہونے والے تجربات اور ان سے پیدا ہونے والے جذبات، احساسات اور خیالات کا فن کارانہ اظہار 'ادب' کہلاتا ہے۔ادب کا مواد کہاں سے حاصل ہوتا ہے، وہ جذبات، احساسات، نظریات، مشاہدات اور تجربات جو ادبی تخلیق کے مواد کا کام دیتے ہیں، کہاں تک مستقل اور ابدی حیثیت رکھتے ہیں، موضوعات کیسے بنتے ہیں اور ان کا انتخاب کیسے ہوتا ہے، موضوعات کو استعمال کرنے کے طریقے اور مخصوص موضوع کی طرف ادیب کا مخصوص ردِ عمل کیسے بنتا ہے اور پھر یہ کہ اظہار کے پیمانے ادب کی خارجی صورتیں اور ہیئت قائم بالذات ہیں یا عہد بعہد بدلتی ہیں، یہ سب سوالات اور استفسارات شعور و ادراک کے مراحل کے معاملات ہیں۔انسانی جذبات ہوں یا خیالات اور نظریات ان کا تعلق ان رشتوں سے آزاد نہیں ہوتا جو کسی مخصوص زمانے میں انسان اور مادی زندگی کے درمیان بنیادی رشتوں کی صورت میں موجود ہوتے ہیں، لہٰذا ان بنیادی رشتوں کی تفہیم کے لیے فکر و شعور کی رہبری ناگزیر ہے اور نظریات سے بے گانگی اور لاتعلقی گویا اس سمت میں اندھیرے کا سفر ہوگا۔

نظریۂ ادب کے درمیان تضادات اور تخلیقیت سے متصادم ہونے کی بات دراصل ادب کو اس عظیم منصب سے محروم کرنے کے مترادف ہے جو ادب کا سماجی منصب ہے۔ادب کا سماج کو بدلنے کے کردار کا نظریہ دراصل ان کے نزدیک محلِ نظر ہے جو تخلیقیت کی راہ میں نظریے کو حائل یا ضرر رساں سمجھتے ہیں اور ادب کو سماجی زندگی کی ترجمانی کرنے سے محروم رکھنے کے قائل ہیں اور ادب کو محض تفننِ طبع و تسکینِ ذوق کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔اس کے برعکس ادب کو سماجی عمل قرار دینے والے ادب کو منصبِ پیغمبری پر فائز

جانتے ہیں اور شاعری جزویست از پیغمبری کے نقطۂ نظر کے قائل ہیں۔ اس کے مخالف نقطۂ نظر کے نزدیک شاعری کو پیغمبری کہنا ایسا ہی ہے جیسے کہ شعر کے فکری عنصر کو علیحدہ کر کے جانچنا اور کسی خاص نظامِ فکر سے اس کو مربوط کر کے شاعری کو فلسفے کے پہلو میں جگہ دینا۔ شعر میں خواہ خطابت کی روح ہو، خواہ فکر کا عنصر، جذبے کی آمیزش ہو کہ احساسِ جمال کا رچاؤ، شعر اول و آخر شعر رہتا ہے اور اس کو شعر کے طور پر دیکھنا ہی صحیح ترین عمل ہے۔ یہ نقطۂ نظر دراصل ادب کی خود مختاری کا نظریہ ہے۔ جس کا لب لباب یہ ہے کہ ادب کو کسی خاص مقصد، مشن اور آدرش سے دور رکھنا چاہیے اور بالفاظِ دیگر ادب برائے ادب ہونا چاہیے۔ اس گروہ کے نزدیک ادب کو کسی سماجی ذمہ داری اور منصب سے تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے مدِ مقابل ادب کا وہ نظریہ اور کردار ہے۔ جس کے نزدیک ادب برائے ادب کی اساس لایعنیت پر استوار ہے۔ جس کو دنیائے شعروادب مدتوں پہلے رد کر چکی ہے اور اس کی جگہ زندگی آموز اور زندگی آمیز ادب کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ جس کو ترقی پسند ادب کا نظریہ کہا جاتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ترقی پسند تحریک اپنی ابتداء سے ایک نظریاتی تحریک رہی ہے اور یہی اس کا سب سے بڑا مثبت پہلو ہے۔ یہی وہ پہلو ہے جس کے باوصف وہ تحریک آج بھی زندہ و توانا ہے اور ایک وقیع ادبی سرمایہ اور ورثہ اس سے منسوب ہے۔
یہ بات ذہن نشین رہے کہ ترقی پسندی کسی فرد کی ایجاد نہیں ہے اور نہ ترقی پسندی کے آغاز کو کسی مخصوص عہد سے منسوب کیا جاسکتا ہے۔ انسانی تہذیب کی سرگزشت کا بابِ اولین ترقی پسندی سے شروع ہوتا ہے، کیونکہ ترقی پسندی تبدیلی اور ارتقاء پر مبنی نظامِ فکر یعنی نظریہ ہے۔ ادب کا نظام سماجی زندگی کے حصار میں فکر و احساس اور حسن و صداقت کی قدروں پر قائم ہے دردمندی اور انسان دوستی کا شدید جذبہ، معاشرتی مسائل سے گہری دلچسپی، یہ خیال کہ غلامی ظلم اور ناانصافی کے خلاف جہاد ادیبوں کا فرضِ منصبی ہے اور یہ تصور کہ غمِ ذات اور غمِ زمانہ ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں ترقی پسند ادب کی امتیازی خصوصیتیں ہیں۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ مگر یہ کہ ادب کو ادب رہنا چاہیے اور یہ کہ جمالیات سے محروم کوئی ادب نہیں ہوتا۔ ادب کے منصب میں سماج میں پائی جانے والی بدصورتیوں اور اندھیروں کے خلاف آرٹ اور فن کو صف آراء کرنا شامل ہے، مگر فن کے معیار کی پاس داری شرطِ اول ہے۔

موضوعِ زیرِ بحث کے حوالے سے میرا واضح نقطۂ نظر یہ ہے کہ نظریے کی قدر و قیمت سے انکار اور ادب کو نظریے سے بے گانہ رکھنے کی بات کے نتیجے میں بیشتر ادبِ عالیہ ادب کے زمرے سے نکل جائے گا۔ اردو شاعری میں علامہ اقبال کی شاہکار تخلیق 'مسجدِ قرطبہ' علامہ کے نظریاتی تبحر اور شاعرانہ عظمت کی ترجمان ہے۔ یہ نظم نظریے سے وابستگی اور اس کا جمالیاتی اظہار، ادب اور نظریے کے بارے میں تضاد کی بات کو رد کرنے کے لیے سب سے بڑا حوالہ ہے اور تخلیقیت کی ''مسجدِ قرطبہ'' سے بہتر مثال پیش کرنا شاید ممکن نہیں جو نظریے سے وابستگی اور نظریے سے بالیدگی حاصل کرنے کا نتیجہ ہے۔ علامہ اقبال کی فکر و نظر میں اسلامی نظریے کی کلیدی اہمیت ہے اور اس نظم کی تفہیم کے لیے اسلامی نظریے سے آشنا ہونا میرے نزدیک ناگزیر ہے۔ واضح رہے کہ علامہ اقبال نے سجاد ظہیر سے ملاقات کے دوران ترقی پسند تحریک کے لیے نیک تمناؤں اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ اسی طرح رابندر ناتھ ٹیگور نے اس تحریک کے لیے پُر جوش حمایت کا اظہار اپنے اس خطبے میں کیا تھا جو کلکتہ کانفرنس میں پڑھ کر سنایا گیا تھا، کیونکہ وہ اپنی ناسازیِ طبع کے سبب کانفرنس میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ یاد رہے کہ ترقی پسند تحریک کے اعلان نامے پر دستخط کرنے والوں میں رابندر ناتھ ٹیگور شامل تھے ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر تمام بڑی نظموں میں نظریے کی تپش نے ادبی جمالیات کو ابھارنے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ آخر میں اس باب میں آلِ احمد سرور کا ایک جملہ موضوع کے حوالے سے معنویت کا حامل ہے، ملاحظہ ہو: ''ادب میں نظریے کی وہی اہمیت ہے جو زندگی میں نظر کی ہے۔ ادب فکر و فن دونوں کا مجموعہ ہے''۔

نوید ظفر

ایمن آباد تا لاہور

ایمن آباد سے لاہور روانہ ہونے سے پہلے وزیر آباد اور گوجرانوالہ کے اردگرد چند اہم مقامات قابل ذکر ہیں، ان میں فیصل آباد کے راستے میں وزیر آباد سے ۵۰ کلومیٹر کے فاصلے پر علی پور چٹھہ ہے جسے اٹھارہویں صدی میں علی محمد چٹھہ نے آباد کیا تھا۔ سکھ عہد میں سکھوں نے اس پر قبضہ کر کے شہر کا نام اکال گڑھ رکھ دیا، جو برطانوی عہد میں برقرار رہا۔ آزادی کے بعد شہر کے لوگوں نے پرانا نام بحال کر لیا۔ یہ شہر لوئر چناب نہر کے کنارے نہایت پرفضا مقام پر واقع ہے۔

علی پور چٹھہ کے ریلوے سٹیشن سے منسلک رسول نگر کا تاریخی شہر بھی ہے جسکا نام مہاراجہ رنجیت سنگھ نے تبدیل کر کے رام نگر رکھا تھا، رنجیت سنگھ عہد کی ایک خوبصورت بارہ دری اور باغ شہر کی زینت ہیں۔ لاہور کے عجائب گھر کے سامنے رکھی گئی زمزمہ توپ کی ایک نسبت رسول نگر سے بھی رہی جو سوہدرہ کے راستے لاہور جانے سے پہلے کچھ عرصہ تک رسول نگر میں رہی۔ شہر کا ایک دروازہ آج بھی اس نسبت سے توپ والا دروازہ کہلاتا ہے۔

وزیر آباد، فیصل آباد سڑک پر رسول نگر سے ۲۰ کلومیٹر کے فاصلے پر کالیکے اور ۳۲ کلومیٹر پر سکھیکے نام کے دو شہر چاولوں کی کاشت اور فروخت کیلئے بہت مشہور ہیں وزیر آباد کے قریب لوئر چناب نہر پر خانکی کے مقام پر ہیڈ ورکس بنایا گیا ہے، جس کے ذریعے پانی ۱۱۰۰۰ کیوسک بہاؤ کے ساتھ گزرتا ہے جو لندن کے دریائے ٹیمز سے چھ گنا زاید ہے۔ لوئر چناب پنجاب کی طویل ترین نہر ہے۔ جس کی لمبائی ۶۶۰ کلومیٹر سے زاید ہے اور جس کے ذریعہ ۳۶۰۰ کلومیٹر دیگر شاخوں میں پانی کی گذرگاہیں بنا کر ۲۰ لاکھ ایکڑ رقبہ سیراب کیا جاتا ہے۔ خانکی کا واٹر ہیڈ ورکس ایک اہم تفریحی مقام ہے۔ جہاں لوگ چھٹی کے دنوں میں دور دور سے اکٹھے ہوتے ہیں، خانکی کے علاوہ ۳۰ کلومیٹر کے فاصلے پر قادر آباد کے مقام پر دریائے چناب

پر ایک بیراج تعمیر کر کے پانی کا رخ قادر آباد بلوکی کی جانب موڑ دیا گیا ہے۔ بیراج کی لمبائی ۳۳۷۰ فٹ ہے، سیلاب کے دوران یہاں سے ۹ لاکھ کیوسک پانی گذرتا ہے۔

گوجرانوالہ سے ۵۶ کلومیٹر کے فاصلے پر حافظ آباد اہم صنعتی مرکز ہے، جہاں چاول، کپڑے، صابن، چینی اور لکڑی بنانے کے متعدد کارخانے ہیں، شہر کی تعمیر اکبری دور میں ہوئی۔ چھٹے سکھ گرو ہر گوبند سنگھ کے حوالے سے یہاں ایک گوردوارہ قائم ہے۔ گوجرانوالہ اور حافظ آباد کے درمیان قلعہ دیدار سنگھ اور پاپ نا کے نام سے دو شہر آباد ہیں، قلعہ دیدار سنگھ، چڑاٹ سنگھ کے عہد میں دیدار سنگھ نے شہر پناہ کے طور پر تعمیر کروایا۔ پاپ نا کے قلعہ دیدار سنگھ سے چھ کلومیٹر کے فاصلے پر قدیم تاریخ کا حامل شہر ہے۔ سیالکوٹ کے قدیم بادشاہ راجہ سال واہن کی رانی لونا کا تعلق پاپ نا سے تھا۔ گوجرانوالہ سے ۱۲ کلومیٹر کے فاصلے پر نندی پور سیالکوٹ کے راستے میں ایک خوبصورت شہر ہے، یہاں بجلی پیدا کرنے کے لئے ایک ہائیڈل سٹیشن قائم ہے۔ راہوالی گوجرانوالہ سے آٹھ کلومیٹر دور کہا جاتا تھا۔ تاہم اب راہوالی اور گوجرانولہ کی آبادی آپس میں مدغم ہوگئی ہے، یہاں چاول، چینی اور لکڑی کا کام اعلیٰ پیانے پر کیا جاتا ہے۔ گوجرانوالہ سے ۱۲ کلومیٹر کے فاصلے پر ایمن آباد کا تاریخی شہر آباد ہے مغل دور تک ایمن آباد کا شہر بنیادی اہمیت کا حامل تھا اور گوجرانوالہ کی حیثیت ثانوی تھی، لیکن سکھ دور میں جب رنجیت سنگھ اور اس کے باپ مہمان سنگھ کے حوالے سے گوجرانوالہ کو اہمیت ملنا شروع ہوئی تو ایمن آباد گوشۂ گمنامی کا شکار ہوگیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایمن آباد کا شہر بارھویں صدی میں قائم ہوا۔ ابتداء میں اس کا نام سید پور تھا۔ سکھ مذہب کے بانی گورونانک ایک عرصے تک یہاں سے کے روڑوں یعنی پتھروں کو بستر بنا کر سوتے رہے، چنانچہ اس واقعہ کی یاد میں سکھوں کا ایک گردوارہ روہڑی صاحب کے نام سے آج بھی قائم ہے۔ بابر نے گورونانک سے ملاقات ایمن آباد میں کی تھی۔ شیر شاہ سوری نے مغل اثر کو کم کرنے کے لئے ایمن آباد پر حملہ کر کے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور اپنی دھاک بٹھانے کے لئے شہر گڑھ کے نام سے نئی آبادی کی بنیاد رکھی۔ مغلوں نے دوبارہ حکومت پانے پر شہر گڑھ کو تباہ کر کے محمد امین کو علاقہ کا حاکم بنایا کہ وہ پرانے شہر کو دوبارہ آباد کرے۔ محمد امین کے حوالے سے شہر پہلے امین آباد اور پھر ایمن آباد کہلایا۔

آئین اکبری کے مطابق شہر ۵ لاکھ سے زیادہ بیگھوں پر پھیلا ہوا تھا اور اس سے سالانہ ۲ کروڑ ۵۰ لاکھ کے قریب آمدنی حاصل ہوتی تھی۔ شہر کی حفاظت کے لئے ۵۰۰ سوار اور ۵۰۰۰ پیادہ فوج متعین تھی۔ سکھ عہد میں جموں اور کشمیر کے دو وزیروں دیوان لچھمن داس اور دیوان بہادر امرناتھ نے شہر میں باغات اور حویلیاں تعمیر کر کے شہر کی خوبصورتی میں اضافہ کیا۔ ایمن آباد میں ایک سرائے اور ہندوؤں کے مندروں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔ ایمن آباد میں ہندو اور مسلمان آبادی کی رہائش ایک دوسرے سے الگ تھی۔ مسلمان زیادہ تر محلہ ککے زیاں، محلہ شیخاں، محلہ رحمن، محملہ کھڈیاں اور گڑھی لوہاراں میں رہتے تھے۔ ہر محلے میں ایک مسجد تھی جو مقامی ضرورتوں کا مرکز اور مداوا تھی۔ اہم عمارتوں میں پکا باغ کے آثار بتاتے ہیں کہ باغ کس قدر وسیع اور خوبصورت تعمیر کروایا گیا تھا۔ ایمن آباد میں سولہویں صدی کی تعمیر کردہ شاہی مسجد اپنی قدیم شان وشوکت کے بھولے بسرے رنگوں کے ساتھ قائم ہے، تاہم اس کی زبوں حالی کے سبب یہاں باقاعدہ عبادت کا سلسلہ متروک ہوگیا ہے۔ بیگم کا مقبرہ شہر کی ایک اہم عمارت ہے جو فرخ سیرؔ بادشاہ کے عہد میں میر احمد خان کی بیگم سے منسوب ہے۔ بیگم کا مقبرہ کھلے میدان میں چہار باغ کی طرز پر تعمیر کردہ باغ کے وسط میں تعمیر ہے۔ ایمن آباد سے آٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر کاموںکے کا شہر چاولوں کی منڈی کے طور پر مشہور ہے۔ کاموںکے سے ہم شاہدرہ پہنچتے ہیں جہاں مغل بادشاہ جہانگیر اور اسکی ملکہ نور جہاں کے مزارات کے علاوہ نور جہاں کے بھائی آصف جاہ کا مقبرہ ہے۔ ان مقبروں کی خوبصورت عمارت عہدِ اکبر کے تعمیر کردہ دلکشا باغ میں تعمیر کی گئی۔ راوی کے کنارے دلکشا باغ مغل شہزادوں کے قیام کا خصوصی مرکز تھا اور جہانگیر بادشاہ نے اسی حوالے سے یہاں دفن ہونے کی وصیت کی تھی۔ ملکہ نور جہاں نے اپنی زندگی میں اپنے مزار کے حوالے سے ایک شعر کہا تھا،

برمزارِ غریباں نے چراغے، نے گلے ‏ ‏ ‏ ‏ نے پر پروانہ سوزد، نے صدائے بلبلے

شاہدرہ اور لاہور کے درمیان راوی کا دریا بہتا ہے۔ جس کے درمیان لاہور شہر کی قدیم ترین بارہ دری کامران کی بارہ دری کے نام سے ایک جزیرہ پر ایستادہ ہے۔ چند سال قبل حکومتِ پاکستان نے اس عمارت کو دوبارہ مرمت کے بعد اصل حالت میں بحال کیا ہے۔ راوی کا پل عبور کریں تو ساتھ ہی

لاہور کا تاریخی شہر شروع ہو جاتا ہے، مغل دور میں یہاں پر بادامی باغ تعمیر کیا گیا تھا جس کا اب کہیں پتہ نہیں چلتا، تاہم ریل گاڑی کے بادامی باغ سٹیشن سے اس باغ کا ذکر تازہ ہو جاتا ہے۔ بادامی باغ کی جگہ شاید انگریز دور میں منٹو پارک بن گیا تھا۔ ۲۳، مارچ ۱۹۴۰ء کو اسی باغ میں مسلمانوں نے قائدِ اعظم محمد علی جناح کی سربراہی میں ایک علیحدہ مملکت کی قرارداد منظور کی تھی۔ پاکستان کے قیام کے بعد حکومت نے یہاں ایک بلند مینار تعمیر کیا۔ مینار کے پہلو میں قومی ترانے کے خالق حفیظ جالندھری کا مقبرہ ہے۔ مینار سے آگے بڑھیں تو لاہور کا تاریخی قلعہ اور اورنگ زیب بادشاہ کے عہد کی بادشاہی مسجد نظر آتی ہے۔ لاہور اکبری دور میں ۱۵۸۵ء سے ۱۵۹۹ء تک ہندوستان کا دارالسلطنت رہا ہے، اور اکبر بادشاہ نے لاہور سے تمام ہندوستان پر حکومت کی تھی۔ جہانگیر اور نور جہان کو لاہور شہر اور راوی کے کنارے دلکشا باغ سے خصوصی لگاؤ تھا۔ لاہور کے حوالے سے نور جہاں کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔

لاہور را بجان برابر خریدہ ایم   جان دادہ ایم وجنتِ دیگر خریدہ ایم

لاہور میں حکومت کے دفاتر قائم کرنے کے لئے اکبر بادشاہ نے قلعہ تعمیر کیا تھا۔ اس قلعہ میں دیوانِ عام اور دیوانِ خاص تھے۔ بعد میں جہانگیر کے عہد میں اس میں مزید اضافہ ہوا۔ تاج محل کا خالق شاہ جہان اسی قلعہ میں پیدا ہوا۔ بعد میں اس نے قلعہ میں شیش محل کا اضافہ کیا۔ اورنگ زیب نے لاہور شہر کو تاریخی بادشاہی مسجد دی، جہاں فروری ۱۹۷۴ء میں اسلامی سربراہی کانفرنس کے دوران ۵۵ سربراہانِ مملکت نے نمازِ جمعہ ادا کی تھی۔ وسعت کے اعتبار سے بادشاہی مسجد کا شمار دنیا کی دس بڑی مساجد میں ہوتا ہے۔ سکھ دور میں مسجد ابتلا کا شکار ہوئی، یہاں مسلمانوں کو نماز پڑھنے سے روک دیا گیا اور مسجد گھوڑوں کے اصطبل کے طور پر استعمال ہونے لگی۔ ۱۸۴۹ء میں انگریز لاہور شہر پر قابض ہوئے اور دس برس بعد انگریز حکومت نے مسلمانوں کے لئے بادشاہی مسجد میں اذان اور نماز قائم کرنے کی اجازت دے دی۔ تاہم لاہور کا قلعہ عوام الناس کے داخلے کے لئے علاقہ ممنوعہ رہا۔ لاہور کے ایک مورخ مختار مسعود نے اپنی تصنیف ''آوازِ دوست'' میں قلعہ بادشاہی مسجد اور مینارِ قراردادِ پاکستان کے حوالے سے تحریر کیا ہے۔

''اس برصغیر میں عالمگیری مسجد کے میناروں کے بعد جو پہلا اہم مینار مکمل ہوا ہے،

وہ مینارِ قراردادِ پاکستان ہے، یوں تو مسجد اور مینار آمنے سامنے ہیں مگر ان کے درمیان یہ ذرا سی مسافت جس میں سکھوں کا گردوارہ اور فرنگیوں کا پڑاؤ شامل ہیں، تین صدیوں پر محیط ہے۔ میں مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھا ان تین گمشدہ صدیوں کا ماتم کر رہا تھا کہ مسجد کے مینار نے جھک کر میرے کان میں راز کی بات کہہ دی۔ جب مسجدیں بے رونق اور مدرسے بے چراغ ہو جائیں، جہاد کی جگہ جمود اور حق کی جگہ حکایت کو مل جائے ملک کے بجائے مفاد اور ملت کے بجائے مصلحت عزیز ہو اور جب مسلمانوں کو موت سے خوف آئے اور زندگی سے محبت ہو جائے تو صدیاں یوں ہی گم ہو جاتی ہیں''۔

لاہور شہر کی تاریخ بہت قدیم بتائی جاتی ہے بعض ہندو مؤرخین نے اس کا تعلق رام چند کے بیٹے لوہ سے منسوب کیا ہے کہ لاہور آباد کرنے کا اعزاز اس کے سر جائے۔ تاہم جدید تحقیق میں یہ خیال ناقص ثابت ہوا۔ ڈاکٹر احمد رانی کی تحقیق کے مطابق عہد محمود غزنوی میں صوبہ سرحد میں تحصیل صوابی کے ایک شہر کا نام لاہور تھا اور محمود غزنوی کے مورخ البیرونی نے اپنی تصنیف ''کتاب الہند'' میں اسی لاہور کا ذکر کیا ہے موجودہ شہر کے بارے میں ایک حوالہ یہ ہے کہ محمود غزنوی نے راوی کے کنارے ایک شہر کی بنیاد رکھی جس کا نام محمود پور رکھا اور ایاز کو یہاں گورنر متعین کیا۔ ایاز کی قبر آج بھی انارکلی بازار لاہور میں موجود ہے، اس حوالے سے یہ قطعۂ تاریخ مشہور ہوا۔

محمود بنا کرد چوں لاہور لہانور　　　　در ہند یکے کعبۂ مقصود بنا کرو

اندیشہ چو کردم پئ تاریخ بنائش　　　　فی الفور خرد گفت کہ محمود بنا کرو

''کہ محمود بنا کرو'' سے ۴۰۰ ہجری کی تاریخ ظاہر ہوتی ہے۔ جو عیسوی اعتبار سے ۱۰۱۰ عیسوی اور محمود کے تخت نشین ہونے کے تیرہ برس اور وفات سے بیس برس قبل کی ہے۔

لاہور سے محمود غزنوی کا تعلق مفکر پاکستان علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے حوالے سے اور بھی مضبوط کر دیا ہے، علامہ اگرچہ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے لیکن انہوں نے اپنی زیادہ تر تعلیم اور زندگی کا بیشتر

حصہ لاہور میں گذارا، اقبال کی شاعری میں محمود کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔

محمد غزنوی کے حوالے سے اقبال کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔

کیا نہیں اور غزنوی کارگہِ حیات میں بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہلِ حرم کے سومنات

انتقال کے بعد شاعرِ مشرق علامہ اقبال کا مزار بادشاہی مسجد کے پہلو میں بنا، جس نے مسجد کے ساتھ ایک مفکر اور شاعر کا تعلق مستحکم کر دیا، فارسی اور اردو شاعری میں بیسویں صدی میں اقبال کا مقام بہت بلند ہے اور پاکستان کے علاوہ ایران، وسطی ایشیاء اور دنیا کے دیگر ممالک نے اقبال کی سوچ اور فکر پر تحقیق کا تفصیلی کام کیا ہے۔

محمود غزنوی کی سرپرستی سے لاہور شہر کو سر بلندی حاصل ہوئی، اس کے سبب یہاں اہلِ دانش اور مستقبل کے حکمرانوں کا ایک سلسلہ اس شہر پر قائم ہو گیا۔ ان شخصیات میں سب سے اہم اور اولین شخصیت شیخ علی ھجویریؒ کی ہے جو داتا گنج بخشؒ کے نام سے مشہور ہیں اور شہر کے سب سے مشہور اور قابلِ احترام بزرگ ہیں، لاہور میں آپ کے دور کا محمود غزنوی کے آخری دور میں ہوا، اور آپ کا انتقال محمود غزنوی کے انتقال سے ۴۵ برس بعد ۹۶۵ھ میں ہوا۔ آپ کا مزار بھاٹی گیٹ کے باہر مرجع خلائق ہے، جہاں ہر دور میں نامور صوفیا نے چلہ کشی کی ہے، ان میں حضرت معین الدین چشتیؒ، خواجہ فرید گنج بخشؒ کئی اور ممالک کے صدور اور وزرائے اعظم شامل ہیں، حضرت معین الدین چشتی سے منسوب یہ شعر زبان زدِ عام ہے:

گنج بخش فیض عالم مظہرِ نورِ خدا راہِ پرِ کامل، کاملاں را رہنما

آپ کی تصانیف میں ''کشف المحجوب'' بہت مشہور ہے، جو اہلِ تصوف کے لئے بنیادی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ لاہور میں حضرت علی ھجویری کے علاوہ کئی ہزار مزار اور بزرگوں کی چلہ گاہیں آج بھی اہلِ تصوف کے لئے سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں ان میں ہر ایک کا ذکر یہاں ممکن نہیں، تاہم اہم ترین صوفیا میں حضرت میاں میرؒ کا ذکر بہت ضروری ہے، جو عہدِ شاہجہاں میں وہی مقام رکھتے تھے، جو دورِ اکبر میں شیخ سلیم چشتی کا تھا۔ بادشاہ شاہ جہاں اور اس کا صوفی بیٹا دارا شکوہ ننگے پاؤں لاہور کے قلعہ سے حضرت میاں میر کی درگاہ میں حاضری دیتے۔ دارا شکوہ نے حضرت میاں میر کے حوالے سے ایک تصنیف

''سفینۃ الاولیاء'' یادگار چھوڑی ہے۔ ایک اور تصنیف ''سکینۃ الاولیاء'' میں دارا شکوہ رقم کرتا ہے کہ ایک دفعہ وہ ایسا بیمار ہوا کہ اطباء نے لاعلاج قرار دیا۔ اس موقع پر بادشاہ شاہ جہاں اپنے بیمار بیٹے کو پالکی میں ساتھ لے کر حضرت میاں میر کی خدمت میں پا پیادہ حاضر ہوا۔ اور درویش کے ہاتھ سے ایک کٹورے میں سادہ پانی پینے کے بعد دارا شکوہ اپنے پاؤں پر چل کر صحت مند انسان کی طرح واپس آیا۔ حضرت میاں میر کی یادگار لاہور شہر کی اہم مسجد وزیر خاں بھی ہے، جس کا سنگِ بنیاد حضرت میاں میر نے رکھا تھا۔ اسی طرح امرتسر میں سکھوں کے گولڈن ٹمپل کو بھی یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس کا سنگِ بنیاد حضرت میاں میر کے ہاتھوں رکھا گیا۔ وزیر خاں مسجد اندرون شہر دہلی دروازے کے قریب واقع ہے، اور اورنگ زیب کی تعمیر کردہ بادشاہی مسجد سے پہلے لاہور کی سب سے بڑی مسجد تھی جو اورنگ زیب کے والد شاہجہان کے عہد میں اس کے گورنر وزیر خان نے تعمیر کروائی تھی۔ وزیر خاں کا تعلق چنیوٹ سے تھا۔ قدیم لاہور شہر کے چاروں طرف دیوار تھی، جس میں تیرہ دروازے تھے، جن میں آج بھی اچھی حالت میں موجود ہیں، ان کے نام ہیں، دہلی دروازہ، اکبری دروازہ، موتی دروازہ یا موچی دروازہ، شاہ عالمی دروازہ، لوہاری دروازہ، بھاٹی دروازہ، ٹکسالی دروازہ، روشنائی دروازہ، مستی دروازہ، کشمیری دروازہ، شیرانوالہ یا خضری دروازہ اور ذکی یا دتی دروازہ۔ لاہور کا تیرھواں دروازہ موری دروازہ کہلاتا ہے، لاہور کے بعض مورخین نے لاہور کے دروازوں کے بارہ نام لکھے ہیں، جن میں موری دروازہ شامل نہیں، چونکہ یہ باقی دروازوں سے چھوٹا تھا، اس لئے ہاتھی کی سواری کے لئے استعمال نہیں ہو سکتا تھا۔ اب یہ دروازہ ختم ہو چکا ہے۔

ہندوستان کے پہلے مسلمان بادشاہ قطب الدین ایبک کی رسم تاجپوشی ۱۲۰۶ء میں لاہور میں منعقد ہوئی۔ چار برس بعد ۱۲۱۰ء میں قطب الدن ایبک چوگان کھیلتے ہوئے لاہور میں گھوڑے سے گر کر فوت ہو گیا تو اس کی قبر پر شاندار مقبرہ بنایا گیا، تاہم وقت کے ساتھ ساتھ یہ مقبرہ معدوم ہو گیا۔ پاکستان بننے کے بعد صدر ایوب خان کے دور میں قطب الدین ایبک کے مزار پر شایانِ شان مقبرہ تعمیر ہوا، جو انارکلی بازار میں مرجع خلائق ہے۔

لاہور کی قدیم عمارات میں سب سے زیادہ اتار چڑھاؤ جس عمارت نے دیکھے وہ انارکلی کا

مقبرہ ہے۔ تاریخی حوالوں کے مطابق انارکلی کے مقبرے میں جہانگیر بادشاہ کی بیوی ملکہ صاحب جمال دفن ہے، سنگِ مرمر کی قبر پر اسمائے الٰہی کے ساتھ جہانگیر بادشاہ کا ایک شعر درج ہے

تا قیامت شکر گردم کردگارِ خویش را　　　آہ گر من باز بینم روئے یارِ خویش را

شعر کے نیچے شاعر کا نام مجنون سلیم اکبر درج ہے، جو جہانگیر بادشاہ کے عشق اور اپنی ملکہ کی جدائی کی دکھ بھری عکاسی کرتا ہے۔ تاہم مختلف ادوار میں اس مقبرے سے مختلف کہانیاں منسوب ہوئیں اور لاہور کے ایک ڈرامہ نویس امتیاز علی تاج نے انارکلی کے حوالے سے ایک معرکۃ الآرا ڈرامے میں انارکلی کا ایک کردار تخلیق کیا جو جہانگیر کی ایک کنیز تھی اور اس کے مبینہ عشق کی پاداش میں دیوار میں زندہ چنوادی گئی۔ انارکلی کے حوالے سے پاکستان اور ہندوستان میں متعدد سٹیج ڈرامے اور فلمیں بنائی جاچکی ہیں، سکھ دور میں مقبرہ میں سے قبر کا تعویذ منتقل کر کے عمارت دو فرانسیسی جرنیلوں ونٹورا اور الارڈ کی رہائش کے لئے استعمال کی گئی۔ انگریزوں نے مقبرے کے اردگرد دفاتر تعمیر کروا کر مقبرے کو ریکارڈ آفس اور دفاتر چیف سیکرٹری، چیف منسٹر یا گورنر کے لئے استعمال کیا۔ انارکلی کا مقبرہ لاہور میں انگریزوں کی اولین عبادت گاہ کے طور پر گرجا بھی بنا۔ انارکلی کے مقبرے کے علاوہ اکبر بادشاہ کا ایک کوکہ مہدی قاسم خان کا مقبرہ سکھ عہد میں راجہ تیج سنگھ کے چچا جمعدار خوشحال سنگھ کی رہائش کے طور پر استعمال ہوا اور پھر انگریزی عہد میں گورنر کی سرکاری رہائش کے طور پر استعمال ہونے لگا، یہ روایت آج بھی قائم ہے۔

لاہور کی تاریخی عمارات ناقابلِ شمار ہیں، ان میں شاہجہانی عہد کا شالیمار باغ، اورنگ زیب عہد کا خوبصورت باغ جو اس کی بیٹی زیب النساء نے تعمیر کروایا تھا، اب اس کا صدر دروازہ چوبرجی کے نام سے موجود ہے، شہزادی زیب النساء کا مقبرہ ملتان روڈ پر زبوں حالی کا شکار ہے، اسی طرح کوٹ خواجہ سعید میں ایک متنازعہ مقبرہ گنبد داراشکوہ کے نام سے مشہور ہے۔ حالانکہ داراشکوہ کو اس کے بھائی اورنگ زیب نے قتل کر کے دہلی میں ہمایوں کے مقبرہ میں دفن کیا تھا۔ بعض محققین اسے بادشاہ جہانگیر اور ملکہ صاحب جمال کے بیٹے خسرو پرویز کی قبر قرار دیتے ہیں۔ خسرو پرویز کی بیٹی نادرہ بیگم کی شادی داراشکوہ سے ہوئی تھی۔ نادرہ بیگم کا خوبصورت مقبرہ حضرت میاں میر کے مقبرے کے قریب موجود ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد لاہور میں عمارات کی تعمیر کا سلسلہ جاری رہا۔فروری ۱۹۷۷ء میں لاہور کا سب سے اہم تاریخی حوالہ اسلامی سربراہی کانفرنس ہے۔جب ۵۵ اسلامی ممالک کے سربراہ لاہور کے اسمبلی ہال میں اکھٹے ہوئے، اس حوالے سے اسمبلی ہال کے باہر اسلامی سربراہی مینار کی عمارت تعمیر کی گئی۔

آزادی کے بعد لاہور شہر کی اہمیت کے پیشِ نظر ۱۹۹۳ء میں موٹروے کا منصوبہ عمل میں آیا، جس کے ذریعہ لاہور کو اسلام آباد سے جدید ترین سڑک کے ذریعہ متبادل راستہ مہیا ہوا۔موٹروے کے ذریعہ پنجاب کے بہت سے قدیم علاقے منظرِ عام پر آ گئے۔

لاہور صنعتی، مالیاتی، صحافتی، تعلیمی، ثقافتی، نیز فلم، کھیلوں اور آرٹ کے حوالے سے پاکستان کا اہم ترین شہر ہے، پاکستان کی ہزاروں اہم ترین شخصیات نے لاہور کو اپنے مسکن کے طور پر منتخب کیا، ان سب کے نام گنوانا ممکن نہیں، ملکۂ ترنم نور جہاں، علامہ مشرقی، شورش کاشمیری، مصورِ مشرق عبدالرحمٰن چغتائی، فضل محمود، افسانہ نگار سعادت حسن منٹو، غازی علم دین شہید، دائی اشرف النساء بیگم، حضرت ایشانؒ اور حضرت شاہ جمالؒ کے حوالے سے لاہور مختلف حوالوں میں ہمیشہ یادگار ہے۔

محمد اسماعیل قریشی

علامہ اقبال بہ حیثیت مفسرِ قرآن

علامہ اقبال کی ہمہ گیر شخصیت ان کی شاعری، ان کے فلسفہ، آرٹ، تہذیبی اور تمدنی ارتقاء خودی اور بیخودی کے اسرار و رموز، زندگی کے مسائل اور حقائق کے بارے میں ان کے افکار عالیہ پر گراں قدر تصانیف موجود ہیں جن کا ماخذ ان کی شاعری، ان کے خطبات اور ان کے سفر اور حضر کی مجالس کی نکتہ رس گفتگو ہے۔

راقم کے حلقہ بگوشان اقبال کی ممتاز شخصیتوں میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، ابوالاثر حفیظ جالندھری، جسٹس ایس اے رحمان، ممتاز شفیع (م۔ش) اور سید نذیر نیازی کے ساتھ نیاز مندانہ تعلقات رہے ہیں۔ ان بزرگوں میں نذیر نیازی، ڈاکٹر چغتائی اور م۔ش مرحومین کے سوا دیگر حضرات سے علامہ کا شاعرانہ مسلک ہی موضوع گفتگو رہا ہے۔ ارادہ تھا کہ ان سب کی گفتگو کو ریکارڈ کر لیا جائے لیکن قانون کی پیشہ ورانہ بلکہ سفاکانہ مصروفیتوں نے اس کی مہلت ہی نہیں دی۔ لیکن دل میں ایک کھٹک سی رہی کہ علامہ کی زندگی کا ایک اہم پہلو جس کا تعلق قرآن حکیم سے ہے دنیا کے سامنے کم کم نمایاں ہوا خاص طور پر ان کا یہ گوشۂ حیات کا وہ عصر حاضر کے مفسرِ قرآن بھی ہیں نظر انداز ہوا ہے۔ اس کی کئی وجوہات میں ایک وجہ تو بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ شاعری ان کی فکر و نظر کے تمام شعبوں پر چھائی ہوئی ہے لیکن وہ شاعری سے برأت کا اظہار کرتے رہے۔ اس کے باوجود ان کے ہم عصر ان سے آب و رنگ شاعری اور حدیث دلبری کا تقاضا کرتے رہے اس لیے وہ حضور رسالت مآبؐ میں فریاد گناں ہیں:

من اے میر امم داد از تو خواہم — مرا یاراں غزل خوانے شمردند

کم نظر بیتابیٔ جانم ندید — آشکارم دید و پنہانم ندید

اگر چہ ان کے اس طرز عمل میں ان کے تنقید نگاروں کو تضاد نظر آتا ہے لیکن در حقیقت شاعری کو

انہوں نے مقاصد آفرینی کا ذریعہ بنایا۔ جس کا انہوں نے برملا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے:

نغمہ کجا و من کجا، ساز سخن بہانہ ایست　　　سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

ساز سخن یا شاعری سے وہ مسلمانوں کے ہجوم آوارہ کو قرآن کی پکار پر پوری قوت کے ساتھ متحد کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے جس کے دل میں قرآن اپنے جمال و جلال کے ساتھ اتر گیا ہو۔ اس کا پس منظر نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے جو علامہ کے سفر افغانستان میں ان کے ہمراہ تھے ان سے علامہ نے دوران سفر اپنی طالب علمی کے زمانے کا ایک ایسا واقعہ بیان کیا جو ان کی زندگی کا سنگ میل بن گیا۔ یہ واقعہ خود علامہ کی زبانی سنئے۔ فرماتے ہیں: ''جب میں سیالکوٹ میں پڑھتا تھا تو میرا یہ معمول تھا کہ صبح اٹھ کر روزانہ قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتا تھا۔ والد صاحب اپنے وظائف سے فرصت پا کر آتے اور مجھے دیکھ کر گزر جاتے۔ ایک دن صبح کو میرے پاس سے گزرے تو مسکرا کر فرمایا کبھی فرصت ملی تو تم کو ایک بات بتاؤں گا۔ میں نے دو چار دفعہ بتانے کا تقاضہ کیا تو فرمایا جب امتحان دے لو گے۔ جب امتحان دے چکا اور لاہور سے گھر آیا تو فرمایا جب پاس ہو جاؤ گے۔ جب پاس ہو گیا اور پوچھا تو فرمایا بتا دوں گا۔ ایک صبح جب حسب دستور قرآن کریم کی تلاوت کر رہا تھا تو میرے پاس آ گئے اور کہنے لگے: ''بیٹا کہنا یہ تھا کہ جب قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ قرآن تم پر ہی اتر رہا ہے''

بزرگ باپ کی یہ بات سعادت مند بیٹے کے دل میں اس طرح اتر گئی کہ اسرار کتاب کھلتے گئے۔ اور اسے انشراح صدر ہوتا گیا۔ علامہ کے بیان کے مطابق انہیں محسوس ہونے لگا کہ خدائے بزرگ و برتر ان سے ہم کلام ہے اور وہ بھی اس سے ہم کلام ہیں۔ اس حقیقت کے زیر اثر علامہ نے کہا ہے

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب　　　گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

قرآن سے اسی ربط و تعلق کی وجہ سے ان پر حقیقت آشکار ہوئی کہ قرآن انسانی زندگی کو اس کائنات میں اور اس سے بھی آگے کی دنیا میں کن بلندیوں تک لے جاتا ہے۔ اس کے لیے اس کے پاس ایک مکمل، پاکیزہ اور ناقابل تغیر نظام عقیدہ و عمل موجود ہے۔ اس کے حقائق اور معارف کی روشنی میں

علامہ نے کلام الٰہی کی تعبیر وتفسیر پیش کی ہے۔ نثر میں خطبات، انگریزی میں اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید کی صورت میں اور نظم میں مثنوی اسرار ورموز کے علاوہ اردو اور فارسی کلام میں موجود ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ خطبات میں جو خیالات اور توجیہات علامہ نے پیش کی ہیں ان کا تعلق عقلیت پسندی سے ہے جو پڑھنے والے سے غور وفکر کا مطالبہ کرتے ہیں مگر وہی خیالات جو شعر کی زبان میں بیان کیے گئے ہیں براہ راست قاری کو متاثر کرتے ہیں۔ غالباً اسی لیے علامہ نے جاوید نامہ میں خطبات کو 'حرف پیچا پیچ ونیش دار' کہا ہے۔

مجھے یہ احساس ہے کہ علما کا ایک گروہ جس کا تعلق صرف درس نظامی کی حد تک محدود ہے اُسے علامہ کو مفسر قرآن بتلانے پر اعتراض ہوگا اور ایسا کرنے کا انہیں حق حاصل ہے کیونکہ بیضاوی اور جلالین کی تفاسیر ان کے پیش نظر رہی ہیں۔ ان مفسرین کی دینی علوم پر دسترس سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن بڑے ادب سے میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ ان کی تفسیروں میں مجتہدانہ سعی وکاوش کی بجائے اپنے پیش رو مفسرین کی تقلید کا رنگ غالب ہے۔ اکثر وبیشتر اصل مہمات قرآن کی بجائے مسائل نظری میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ ان کے علاوہ امام فخر الدین رازی کی تفسیر کبیر کو تفاسیر میں بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ مگر اس میں صاحب تفسیر نے متکلمانہ منطق اور علم کلام کے استدلال سے آیات الٰہی کی تفسیر میں جا بجا کام لیا ہے۔ جس پر مولانا رومؒ نے سخت تنقید کرتے ہوئے کہا:

پاے استدلالیاں چوبیں بود   پاے چوبیں سخت بے تمکیں بود

مولانا ابوالکلام آزاد نے اصول تفسیر وترجمہ میں امام رازی کے بارے میں لکھا ہے کہ شکوک و شبہات کے بے شمار دروازوں کو کھولنے میں امام رازی کا ہاتھ بہت تیز نکلا لیکن بند کرنے میں وہ تیزی نہ دکھلا سکے۔ علامہ نے تو کھل کر ان کی تفسیر کو زوال عشق ومستی کہا ہے کہ اس میں زندگی کی وہ توانائی اور حرارت موجود نہیں جو قرآن دلوں کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے علامہ کا قرآن کے فہم وبصیرت اور اس کی شرح وتفسیر کا انداز بالکل جداگانہ ہے۔ اس کے لیے ایسی شاعری کو ذریعہ اظہار بنایا جس میں روح القدس کا آہنگ شامل ہوگیا ہے۔ 'بہ جبریل امیں ہم داستانم' پیرایہ اظہار کے لیے مثنوی مولانا رومؒ

ان کے پیش نظر رہی ہے جس کو 'ہست قرآں در زبان پہلوی' کہا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی اولین تصنیف 'اسرار و رموز' سے رجوع کرنا پڑے گا۔ خاص طور سے رموز بیخودی میں اس حصہ سے جو خلاصہ مطالب مثنوی سے متعلق ہے۔ جس کا آغاز خود علامہ نے ''تفسیر سورۃ اخلاص'' بتلا کر کیا ہے، اس سورۃ کا انتخاب اس لیے کیا گیا ہے کہ اس میں اہل ایمان کے لیے عقیدہ اور عمل کا مکمل اور مربوط نظام موجود ہے۔ جس کا براہ راست تعلق ذات، احدیت اور توحید سے اور بالواسطہ امت مسلمہ سے ہے۔ اس سورۃ کی تفسیر حدیث پاک ''تخلقو اباخلاق اللہ'' کی روشنی میں کی گئی ہے۔ اس حدیث میں زندگی کو صفات الٰہی کا مظہر بنانے کی تاکید کی گئی ہے۔ ''قل ھو اللہ'' کی تفسیر کرتے ہوئے علامہ جناب ابوبکر صدیقؓ کی زبانی بتلا رہے ہیں:

رنگ بر خود کن مثال او شوی   در جہاں عکس جمال او شوی

آنکہ نام تو مسلماں کردہ است   از دوئی سوے یکی آوردہ است

مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ ترک و افغان یا دیگر قومیتوں میں تقسیم ہو جائے۔ اس کو یہ دوئی توڑ کر ان عصبیتوں سے آزاد ہونا پڑے گا۔ اس کے لیے ضروری ہے:

یک شو و توحید را مشہور کن   غائبش را از عمل موجود کن

اسی طرح علامہ اس آیت کی رو سے مسلمانوں کو اپنے عمل سے یک رنگ اور یک جان ہو کر توحید کی قوت کو دنیا میں برپا کرنے کی تعلیم دے رہے ہیں۔ احدیت کا تصور وجودی فلسفی محی الدین ابن العربی نے اپنی کتاب ''فصوص الحکیم'' میں پیش کیا ہے لیکن وہ تصور تخیلاتی اور اختلافی ہے۔ اس فلسفہ کی تردید مجد الف ثانیؒ نے نظریہ وحدت الشہود سے کی ہے۔ اس کے بعد دوسری آیت ''اللہ الصمد'' کی تفسیر کرتے ہوئے علامہ مسلمانوں کو بتلاتے ہیں اگر تم نے اپنے اندر بے نیازی کی شان جو صفت الٰہی ہے پیدا کر لی تو تم کو تمام دنیاوی اسباب سے بلند مقام حاصل ہوگا۔

گر بہ اللہ الصمد دل بستۂ   از حد اسباب بیروں جستۂ

بندۂ حق، بندہ اسباب نہیں ہوتا۔ اس کا رشتہ مسبب الاسباب کے ساتھ ہو جاتا ہے اور وہ ساری دنیا کے

لیے خیر بن جاتا ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو ماسوائے اللہ کے بے نیاز ہونا چاہیے۔

مسلم استی بے نیاز از غیر شو　　　اہل عالم را سراپا خیر شو

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے علامہ نے مولانا روم کی طرح ایک تاریخی واقعہ کا ذکر کیا ہے جو بڑا ایمان افروز ہے۔ عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے جو اپنے دور کا جلیل القدر حکمران تھا اور جس نے رومی شہنشاہ نقفور کو شکست فاش دی تھی۔ امام مالکؒ سے درخواست کی کہ وہ شاہی محل آ کر اسے درس حدیث دیں۔ جس پر امام مالک نے نہایت بے نیازی سے جواب دیا کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ایک بندہ آزاد تمہاری چاکری کرے۔ اگر علم دین کا ایسا ہی شوق ہے تو میرے حلقہ درس میں آ کر بیٹھا کرو:

بے نیازی رنگ حق پوشیدن است　　　رنگ غیر از پیرہن شوئیدن است

پھر مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

علمِ غیر آموختی اندوختی　　　روئے خویش از غازہ اش افروختی

یہاں علم غیر سے مراد وہ علم ہے جو مسلمان کو اپنے دین و مذہب سے بیگانہ کر دے۔ بہ ایں وجہ عقل و دانش افکار غیر کے غلام بن جاتے ہیں:

عقلِ تو زنجیریٔ افکار غیر　　　در گلوئے تو زانفس تار غیر

تم خود آفتاب عالم تاب ہو غیروں کے ستاروں سے چمک لینے کی تمہیں کیا ضرورت ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو پیغام دیا ہے۔

از پیام مصطفیٰؐ آگاہ شو　　　فارغ از ارباب دون اللہ شو

"لم یلد ولم یولد" کی تفسیر میں بتلاتے ہیں کہ مسلمان کی رنگ و خون اور پیدائشی حسب و نسب سے نسبت نہیں کیونکہ وہ فرد یا قوم جو نور حق سے روشن ضمیر ہو جائے اسے "زاد و بود" اور "تار و پود" کی حاجت نہیں رہتی مگر جو انسان خود کو ان مصنوعی آلائشوں سے وابستہ کر لے اس کے بارے میں فرماتے ہیں

کہ وہ ''لم یلد ولم یولد'' کے معنی و مفہوم سے آگاہ نہیں۔

ہر کہ پا در بند اقلیم وجد است　　　　بے خبر از لم یلد لم یولد است

آخر میں ''ولم یکن لہ کفواً احد'' کی تفسیر کرتے ہوئے بتلاتے ہیں کہ جب ''لم یکن'' سے رشتہ پیوست اور قوی ہو جائے تو وہ اقوام عالم میں ذات الٰہی کی طرح بے ہمتا ہو جاتا ہے۔ مومن کے ہر بلندی سے بلندتر ہونے کی وجہ سے اس کا کوئی ہمسر اور شریک نہیں ہو سکتا۔

آج مسلمان قرآن سے دور ہو کر زبوں حال اور خوار ہو گیا ہے اور گردش دوراں کا شکوہ سنج ہے۔ حالانکہ قرآن حکیم جیسی زندہ کتاب اس کی رہنمائی کے لیے اس کے پاس موجود ہے۔

آں کتاب زندہ قرآنِ حکیم　　　　حکمت او لازوال است و قدیم

مگر اس سے دور ہو کر وہ کب تک خاک وطن میں سرنگوں رہے گا۔ وقت ہے کہ وہ اٹھے۔ بارگاہ رسالت میں یہ ہدیۂ مثنوی لے کر بچشم تر پیش ہوتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ میرے باپ نے مجھے آپؐ کے نام و ناموس سے آشنا کیا۔ آپؐ میرے ماں باپ سے محبوب تر ہو گئے ہیں۔ مسلمانوں کا حال زار دیکھ کر اب میرے لیے اپنے غم پنہاں کو ضبط کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ وائے کم نصیبی کہ مسلمان آپ سے بیگانہ ہو گیا ہے اور وہ اپنی بغل کے اندر لات و منات عزیٰ و ہبل کے بتوں کو لیے بیٹھا ہے۔ آہ! ہمارا شیخ طریقت برہمن سے بڑھ کر کافر ہو گیا ہے اور اس کے سر کے اندر سومنات سمایا ہوا ہے۔ اس کے سینہ میں دل زندہ موجود نہیں۔ موت کے خواب گراں سے بیدار کرنے کے لیے میں نے اسرار قرآں سے اس کور مزحیات سے آگاہ کیا ہے۔

مردہ بود از آب حیواں گفتمش　　　　سرّے از اسرار قراں گفتمش

قوم کی بے حسی پر اپنے بارے میں بے اختیار فریاد کرتے ہوئے کہتے ہیں: اے مولائے کائنات آپ کی نگاہ حق شناس تو دلوں کے اندر کی حقیقت و کیفیت کو بے حجابانہ دیکھ لیتی ہے۔ اگر میرا دل نور ایمان سے روشن نہیں اور میرے کسی لفظ و بیان میں قرآن کے ماسوا کوئی اور بات موجود ہو تو آپ

میرے ناموسِ فکر کے پردے کو چاک کر دیجئے۔ میری رگ جاں سے تار نفس کو منقطع فرما کر میری مئے حیات کو زہرناک کر دیجئے۔ میرے کشتِ سرسبز پر ابر بہار کو برسنے سے روک دیجئے۔ آخر میں اپنے لیے انتہائی دردناک سزا تجویز کرتے ہیں اے میرے مولائے کریم اگر میری زبان سے غیر قرآن کوئی لفظ نکل گیا ہو تو روز محشر اپنے بوسۂ قدم سے محروم کر کے مجھے امتِ خیر البشر کے سامنے ذلیل و رسوا کر دیجئے۔

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

یہ شعر لکھتے ہوئے ہم جیسے گناہ گاروں کے دل لرز جاتے ہیں مگر علامہ پر کیا قیامت گزر گئی ہوگی اس کا اندازہ کرنا ممکن نہیں۔ لیکن ان کا قلب مطمئن معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کلام الٰہی کی جو تفسیر اور تعبیر کی ہے وہ سراسر قرآن ہی کے اسرار و معارف ہیں جو براہ راست اس کتاب زندہ سے رجوع کرنے کی بدولت ان پر منکشف ہوئے ہیں۔ علامہ کے اسی حال و قال کو دیکھ کر ان کے ہمراز و ہم نشیں استاد گرامی نے کہا تھا۔

در دیدۂ معنی نگراں حضرتِ اقبال پیغامبری کرد و پیمبر نتواں گفت

'اقبال بہ حیثیت مفسر قرآن' کے وسیع تر موضوع کے لیے دراصل ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ اس مضمون میں ہم نے علامہ کی تفسیر کے بارے میں ان کی مثنوی بیخودی سے صرف چند اشعار کا حوالہ دیا ہے حالانکہ تمام اشعار جو اس سے متعلق ہیں وہ ایسے روشنی کے مینار ہیں جو ہر دور ہر زمانہ اور ہر جہت میں مسلمانوں کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔

پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی

اقبال اور نوجوان

نوجوان جنہیں ہم نسل نو بھی کہتے ہیں ملت اسلام کا بیش بہا سرمایہ اور سرزمین پاکستان کی متاع عزیز ہیں۔ نسل نو ہمارے خوابوں کی تعبیر ہمارے حال کی تصویر اور ہمارے مستقبل کی تقدیر ہے۔ تشکیل پاکستان میں اُس وقت کی نسل نو نے بھی بزرگوں کے دوش بہ دوش اور قدم بہ قدم حصہ لیا اور تعمیر پاکستان میں عہد رواں کے نوجوان بھی شریک عمل ہیں ان ستاروں سے ہمارے ماضی کا افق بھی روشن تھا اور ان اجالوں سے ہمارے عہد کی فضائیں بھی روشن ہیں۔

علامہ اقبال کی شاعری اور پیغام میں نوجوانوں کا بھی حصہ ہے اور اس کی دو صورتیں ہیں۔ پہلی صورت تو یہ ہے کہ فکر اقبال سب کے لئے عام ہے اور لائق مطالعہ و استفادہ ہے۔ ہر شخص خواہ وہ عمر کے کسی درجے میں ہو اقبال کے خطاب عام میں شامل ہے مثلاً

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا ۔۔۔ لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اس شعر کا روئے سخن سبھی کی طرف ہے۔ جس میں نوجوان بھی شامل ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اقبال کا خاص تخاطب نوجوانوں سے ہے۔ ان کی غزلوں میں بعض اشعار یا ان کی بعض نظمیں جن کا عنوان نوجوانوں سے متعلق ہے اس صورت میں شامل ہیں مثلاً غزل کا ایک شعر:

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی ۔۔۔ سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فرزندی؟

یا بعض نظموں کے یہ عنوانات: ''مثلاً طلبہ علی گڑھ کے نام''۔ ''جاوید کے نام''۔ ''خطاب بہ جوانان اسلام''۔ ''بڈھے بلوچ کی نصیحت'' وغیرہ۔ الغرض نوجوانوں یا نسل نو سے تخاطب کے ٹکڑے ہر جگہ پہچانے جاتے ہیں۔ اقبال اس رمز سے آشنا تھے کہ نوجوان ہی ملت اسلام کے وہ افراد ہیں جو اس کی قسمت کے تابناک ستارے اور اس کے مستقبل کے نگہبان ہیں، اس لئے ان کی ذہنی اور فکری تربیت

بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ اس تربیت کیلئے صحیح خطوط مرتب اور مقرر ہونے چاہئیں۔ اس تربیت کا سرچشمہ قرآن وسنت کی تعلیمات اور اپنے دین وتہذیب کی روشن قدریں ہی ہوسکتی ہیں۔ نوجوانوں کے ذہن وفکر میں ان تعلیمات اور قدروں کی کاشت ہونی چاہیے، تاکہ وہ شروع ہی سے مثبت کردار کے سانچے میں ڈھل سکیں اور کوئی منفی قدر، کوئی غیر اسلامی نظریہ، کوئی لادینی فکر اُن کے دل ودماغ اور ارادہ و عمل کو نہ چھو سکے۔ اقبال نے نوجوانوں کے لئے چاہا کہ وہ صحیح تعلیم وتربیت حاصل کریں اور عمدہ اخلاق و صفات کے حامل ہوں۔ چنانچہ اقبال جب نوجوانوں سے خطاب فرماتے ہیں تو اُن کے پیغام کے دو بنیادی عناصر تعلیم اور نظام اخلاق ہیں۔ باقی تمام نصائح انہی دو محوروں کے گرگھومتی ہیں۔

یہ بات سب جانتے ہیں کہ اقبال کی شاعری کو عہد غلامی کی فضا میسر آئی اور وہ مسلمانوں میں حریت وآزادی کے شعلے بیدار کرکے ۱۹۳۸ء میں یعنی پاکستان بننے سے نو سال پہلے انتقال فرما گئے، اس لئے اُن کے کلام کو بہت حد تک اُسی خاص فضا میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ انگریز نے جو نظامِ تعلیم اور نصاب تعلیم ہمیں دیا اُس سے اُس کا مقصود یہ تھا کہ ہم اسلامی فکر ونظر سے کٹ جائیں، ہم مغربی تہذیب کے سیلاب میں بہہ جائیں اور ہم میں خوئے غلامی پختہ ہوجائے اقبال کے یہاں عہد غلامی کی اس طرز تعلیم کے خلاف ایک مسلسل احتجاج پایا جاتا ہے۔

یہ بتان عصر حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں	نہ ادائے کافرانہ، نہ تراش آذرانہ
گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا	کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ

اقبال کی شاعری اور نظام فکر کی یہ خوبی ہے کہ وہ کسی غلط بات پر صرف تنقید یا نکتہ چینی ہی نہیں کرتے بلکہ متبادل صورت تجویز کرتے ہیں، ان کے نزدیک وہی تعلیم درست ہے جو نوجوانوں کو خدا اور رسولؐ سے وابستہ رکھے جو قرآن کی روشنی اُن کے قلب میں اُتارے، جو اُن کو اعلیٰ مقاصد کے لئے تیار کرے، جو اُن کے ذہن کو سطحی گھٹیا اور مادی خواہشوں سے بلند کرکے بلندتر اخلاقی اور روحانی صفات سے وابستہ کرے، جو اُن میں ذوق تخلیق اور جذبۂ تحقیق کو ابھارے، جس تعلیم میں محض کتب خوانی کی بجائے فیضان نظر شامل ہو، جو نوجوانوں کو علم وہنر سے آراستہ کرکے انہیں ایسے افراد بنادے جن میں ماضی کے

اسلام سے رابطے کی شان بھی ہو اور جو انہیں جدید علوم مثلاً فلسفہ سائنس اور ٹیکنالوجی سے آشنا کر کے انہیں عظیم مستقبل کا معمار بھی بنا سکے۔ طالبعلم کے عنوان سے دو اشعار:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فروغ کہ تو کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

بہ پور خویش دین و دانش آموز کہ تابد چوں مہ و انجم نگینش

بدست او اگر دادی ہنر را ید بیضاست اندر آستینش

اپنے بیٹے کو دین و دانش سکھا تا کہ اُس کا نگینۂ قسمت چاند ستاروں کی طرح چمکے، اگر تو نے اس کے دست طلب میں ہنر رکھ دیا تو گویا اُس کی آستین میں ید بیضا ہے، یعنی حصول کمال کا وسیلہ اُسے عطا کر دیا۔ ایک نظم کا عنوان ہے مدرسہ، جس کا آخری شعر ہے:

مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جس کو خلوت کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

اسی انداز کا ایک اور شعر دیکھئے:

علم کے حیرت کدے میں ہے کہاں اس کی نمود گل کی پتی میں نظر آتا ہے راز ہست و بود

یہ خلوت کوہ و بیاباں کی ترغیب، یہ گل کی پتی میں راز ہست و بود کا سراغ لگانے کی دعوت اقبال کے ایک مخصوص طرزِ فکر کو ہمارے سامنے لاتی ہے، وہ نوجوانوں کو مدرسے کی چار دیواری میں محدود نہیں دیکھنا چاہتے، بلکہ اُن کے مشاہدے کو وسعت بخشنے کے لئے انہیں وسیع کائنات میں کھلے آسماں اور پھیلی ہوئی زمین کی غیر محدود فضاؤں میں لانا چاہتے ہیں۔ کوہ و بیاباں کی دعوت اس لئے ہے کہ نوجوانوں میں جفا کوشی پیدا ہو۔ جد و جہد اور سعی و عمل کی پر خار وادیوں سے گزرنے کا حوصلہ پیدا ہو۔ مخالف حالات سے ٹکرانے اور اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کا عزم بیدار ہو۔ اقبال نوجوانوں کی عیش کوشی، راحت پسندی اور بے عملی کو سخت ناپسند کرتے ہیں اور اس کے خلاف سخت احتجاج کرتے ہیں:

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ہیں ایرانی لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

یہ تاحد نظر بچھے ہوئے میدان، یہ دور تک کشادہ دامان صحرا، بیکراں سمندر، یہ سر بفلک کہسار، یہ آسمان کی تصور میں نہ آنے والی بلندیاں، یہ فضا، یہ خلا، یہ ساری کائنات اپنے بے شمار اسرار کے خزانے چھپائے نوجوانوں کے جوش عمل اور ذوق پرواز کو دعوت جستجو دے رہی ہے اور تسخیر کا اشارہ کر رہی ہے۔ اقبال کے یہاں عقاب اور شاہین کے علامتی الفاظ نوجوانوں ہی کو تحریک دینے کیلئے صرف ہوئے ہیں۔

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر　　تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا　　ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

نصیحت:

بچۂ شاہیں سے کہتا تھا عقاب سالخورد　　اے ترے شہپر پہ آساں رفعت خلد بریں
ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام　　سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں
جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر　　وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

کائنات کی وسعتوں میں قدم رکھنے کے لئے اور تعلیم کے ساتھ اپنی تربیت کرنے کے لئے اپنی خودی کے استحکام کے لئے اور اپنے اندر جفا کوشی کی خو پیدا کرنے کے لئے اقبال اظہار کے نئے نئے پیرائے اختیار کرتے ہیں: مثلاً بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو:

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا　　اس دشت سے بہتر ہے نہ دلی نہ بخارا
جس سمت میں چاہے صفت سیل رواں چل　　وادی یہ ہماری ہے وہ صحرا بھی ہمارا

یا محراب گل کے افکار:

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا　　شباب جسکا ہے بے داغ ضرب ہے کاری
اگر ہو جنگ تو شیران غاب سے بڑھ کر　　اگر ہو صلح تو رعنا غزال تاتاری

اصل میں اقبال نوجوانوں میں ذوق عمل اور جوش عمل کا جوہر دیکھنا چاہتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک عمل زندگی ہے اور بے عملی موت۔ خوشحال خاں کی وصیت:

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

نظم طلبہ علی گڑھ کے نام کا ایک شعر:

آتی تھی کوہ سے صدا راز حیات ہے سکوں کہتا تھا مور ناتواں لطف خرام اور ہے

''خطاب بہ جوانان اسلام'' میں ایک شعر میں بزرگوں اور نسل نو کے درمیان تقابل اسی عمل اور بے عملی کی بنیاد پر کیا

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی کہ تو گفتار وہ کردار تو ثابت وہ سیارا

اقبال اس مادی دور کے بہاؤ میں جبکہ مغربی اور لادینی افکار کا سیلاب سب کچھ بہائے لئے جا رہا ہے، نسل نو کو دینی اقدار اور اسلامی اخلاق سے آراستہ دیکھنے کے آرزومند ہیں۔ نظم ''جاوید کے نام'' سے ایک شعر:

حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ

ایک اور نظم کا ایک شعر جو لندن سے جاوید کے نام بھیجی گئی:

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

جاوید کے پردے میں اقبال تمام نسل نو کو اپنا بیٹا سمجھتے ہیں اور ان کے اس خاص تخاطب میں تمام نوجوانان ملت شامل ہیں۔ اقبال نے جاوید نامہ کے آخر میں ۱۳۶ اشعار کہے ہیں جن کا عنوان ہے ''خطاب بہ جاوید'' اور اس کا ذیلی عنوان ہے (سخنے بہ نژاد نو) نسل نو سے کچھ باتیں۔ یہ نظم اقبال کے ان افکار کا خلاصہ پیش کرتی ہے جو وہ نوجوانوں کی فکری تربیت اور کردار سازی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ اردو میں ان اشعار کا مقصد و منشا پیش کیا جاتا ہے:

بیٹا تو نے اپنی ماں سے لا الہٰ سیکھا مجھ سے ذوق نظر حاصل کر اور لا الہٰ کے سوز میں جلنا سیکھ لا الہٰ کے یہ دو حرف محض گفتار نہیں ہیں، بلکہ یہ شمشیر برہنہ ہیں اور ضرب کاری ہیں۔ آج نوجوان تشنہ لب ہیں تہی جام ہیں ان کے دماغ روشن سہی لیکن روحیں تاریک ہیں کم نگاہ بے یقین اور ناامید ہیں، غیروں کی قوت پر ایمان لاتے ہیں اپنی صلاحیتوں سے منکر ہیں۔ مکتب بھی اپنے مقاصد سے ناآشنا ہیں کیونکہ ان

سے روحانی جذب پیدا نہیں ہوتا۔ تو اہل ہنر سے سو کتابیں پڑھتا ہے۔ ان سے وہ درس بہتر ہے جو فیضان نظر سے حاصل ہو۔ بیٹا! کم کھا، کم سو، کم باتیں کر، پرکار کی طرح اپنی ذات کے گرد گھوم، اپنے اندر اخلاص پیدا کر، سلطان و امیر کا خوف دل سے نکال دے۔ دین کا بھید دو باتوں میں ہے۔ سچ بولنا اور رزق حلال کھانا۔ دین کے معاملے میں الماس کی طرح سخت ہو جا یعنی اصول دین کی سختی سے پابندی کر۔ جب میں کسی نوجوان کو بے ادب دیکھتا ہوں تو میرا روشن دن تاریک رات میں بدل جاتا ہے۔ حرف بد کسی کے لئے زبان پر نہ لا۔ آدمیت کیا ہے آدمی کا احترام کرنا، مقام آدمی سے باخبر رہ۔ تو کتنا ہی دولت مند ہو جائے۔ جاگیروں کا مالک بن جائے لیکن فقر اور سادگی کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ بعض لوگ دولت و نعمت کی کثرت سے دل کے گداز سے محروم ہو جاتے ہیں، پیر رومی کو اپنا رفیق راہ بنا تا کہ خدا تجھے سوز و گداز کی دولت بخشے، لوگوں نے ان کے کلام سے رقص تن اختیار کر لیا، یعنی رومی کے اشعار پر جھومنے لگے حالانکہ وہ رقص جاں کی تعلیم دیتے ہیں یعنی روحانی وجد کی جس سے عشق الٰہی کی لذت مراد ہے اور اخلاقی صفات کی مسرت۔ اے میرے بیٹے جاوید، اے میری جان بے قرار کی راحت، اگر تو یہ رقص جاں حاصل کر لے تو میں تجھے دین مصطفیؐ کے تمام بھید بتا دوں گا اور میں تجھ سے اتنا خوش ہوں گا کہ قبر میں بھی تجھے دعا دوں گا۔ اقبال کے اس سارے تخاطب میں دل کا خلوص، نوجوانوں کی خیر خواہی کا جذبہ، اور افراد کی تہذیب کے پردے میں معاشرے کی تشکیل کا احساس کارفرما ہے۔ وہ نسل نو کے ہر فرد کو حسن، خیر اور صداقت کا حامل دیکھنا چاہتے ہیں تا کہ اسلامی معاشرہ بھی انہی ستاروں سے منور اور انہی پھولوں سے معطر ہو۔ وہ بڑی دردمندی کے ساتھ خدائے کارساز کی بارگاہ میں نوجوانوں کی اصلاح کے لئے دعا گو ہیں:

جوانوں کو سوز جگر بخش دے ۔۔۔ مرا عشق میری نظر بخش دے

مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں ۔۔۔ مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں

امنگیں مری آرزوئیں مری ۔۔۔ امیدیں مری جستجوئیں مری

یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر ۔۔۔ اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

مرے قافلے میں لٹا دے اسے ۔۔۔ لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

علامہ اقبال کا دردمند اور خیر خواہ دل چاہتا ہے کہ نوجوانوں کی ظاہری آنکھ کے علاوہ ان کی باطنی آنکھ بھی کشادہ ہو، ان میں شعور اور وجدان پیدا ہو، جس کے وسیلے سے حال کی تہوں میں پوشیدہ اسرار اور پردہ مستقبل میں چھپے ہوئے بھید ان پر آشکار ہو سکیں۔ وہ اپنے آپ کو ہر چیلنج کے لئے تیار کر سکیں اور اپنی خوئے انقلاب اور ذوق ایجاد کی قوتوں سے دوبارہ تاریخ پر چھا سکیں۔ ان کی ایک اور دردمند دعا پر بات تمام کرتا ہوں:

جوانوں کو مری آہ سحر دے　　تو ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے　　مرا نور بصیرت عام کر دے

ڈاکٹر شاہد اقبال کامران

اقبال، اجتہاد اور اسلامی جمہوری ریاست

اقبال اسلام کو مذہب کی روایتی تعریف سے ہٹ کر ایک ایسی تمدنی تحریک خیال کرتے ہیں جس کا اساسی مقصد عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایسا تدریجی انقلاب لانا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطہ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔(۱) اقبال کے نزدیک ''یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے، نہ نسلی ہے، نہ ہی انفرادی ہے نہ پرائیویٹ بلکہ خالصاً انسانی ہے اور اس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالم بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔''(۲) اقبال اسلام کو ایک ایسی تحریک خیال کرتے ہیں کہ جس کا مقصد نوع انسانی کو ہر قسم کے مادی امتیازات سے ماورا کر کے یکجا کرنا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اقبال دیکھتے ہیں کہ عالم اسلام میں سیاسی تنزل کے آغاز کے ساتھ ہی اسلام میں حرکی روح کو حفظ و بقا کے حد سے بڑھے ہوئے احساس کے تحت تقلید کے دائرے میں مقید کر دیا گیا اور یوں عملاً ایک انتہائی متحرک اور تغیر کیش عمرانی تحریک کو روایتی مذہب بنا کر رکھ دیا گیا۔ لفظ مذہب ہماری محتاط توجہ کا مستحق ہے۔ مذہب، خدا کے بارے میں ایک خاص تصور، اس تصور کے حدود یعنی عقائد اور انہی پر استوار بعض اعمال کے تواتر کو تسلیم کر لینے کا نام ہے۔ کسی بھی مذہب میں ہستی باری تعالیٰ اور انسان کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کچھ بھی ہو، امر واقعہ یہ ہے کہ اسی تعلق کی نوعیت کے حوالے سے اس مذہب کو ماننے والے اپنی عملی زندگی کا رخ اور رویہ طے کرتے ہیں اس کے برعکس وہ لوگ، جو مذہب اور اس کے معتقدات کو فکر انسانی کی اساس نہیں مانتے، وہی خود اپنے تصورات کی روشنی میں عملی زندگی کا رخ اور رویہ طے کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ گویا یہ فکر، تصور یا نظریہ ہی ہے جو ہمارے انفرادی و اجتماعی اعمال کی اساس بنتا ہے۔ روایتی مذاہب کے برعکس قرآن کا رجحان، جیسا کہ اقبال کہتے ہیں، زیادہ تر اس طرف ہے کہ فکر کی بجائے عمل پر زور دیا جائے۔(۳) خود عمل کی اساس تحرک اور تغیر پذیری پر ہے، چنانچہ یہ کہنا درست ہوگا کہ تحرک اور تغیر زمان و مکان کی قیود میں رہتے ہوئے

حیات کے تسلسل اور توسیع کے بنیادی اجزاء ہیں۔ اگر ہمارے ذہنی تحرک کی بنیاد کسی خاص مذہب پر ہے تو پھر اس مذہبی تفکر اور اس کے پیدا کردہ رویوں کی جدید علوم، عمرانی ومعاشی تغیرات اور مستقبل کے امکانات کی روشنی میں تشکیل جدید لازم قرار پاتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں ''فرد کی حیثیت اس کی دماغی نجات وآزادی اور طبعی علوم کی غیر متناہی ترقی، ان چیزوں میں جو تبدیلی واقع ہوئی ہے، اس نے جدید زندگی کے اساس کو یکسر متغیر کر دیا ہے۔ چنانچہ جس قسم کا علم کلام اور علم دین ازمنہ متوسطہ کے مسلمان کی تسکین قلب کے لیے کافی ہوتا تھا۔ وہ آج تسکین بخش نہیں ہے۔ اس سے مذہب کی روح کو صدمہ پہنچانا مقصود نہیں ہے۔ اجتہادی گہرائیوں کو دوبارہ حاصل کرنا مقصود ہے تو فکر دینی کو از سرنو تعمیر کرنا قطعاً لازمی ہے۔'' (۴)

اقبال کے ہاں فکر اسلامی کی تشکیل جدید کے احساس کی اپنی ایک تاریخ ہے لیکن اس احساس کا پہلا باقاعدہ ابلاغ ہمیں ۱۹۰۴ء والے مضمون ''قومی زندگی'' میں ملتا ہے اقبال اس مضمون کے پہلے حصے میں لکھتے ہیں کہ ''سینکڑوں مذاہب دنیا میں پیدا ہوئے ' بڑھے' پھولے پھلے اور آخر کار مٹ گئے' کیوں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے عقلی ارتقا کے ساتھ ساتھ جدید ضروریات پیدا ہوتی گئیں۔ جن کو ان مذاہب کے اصول پورا نہ کر سکے۔ یہی سبب ہے کہ اہل مذہب کو وقتاً فوقتاً نئے نئے علم کلام ایجاد کرنے کی ضرورت پیش آتی رہی۔ جن کے اصول کی رو سے انہوں نے اپنے مذاہب کو پرکھا اور ان کی تعلیم کو ایسی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی جو عملی اور روحانی زندگی میں انسان کی رہنما ہو سکے''۔ (۵) اس استدلال کے تسلسل میں اقبال فقہ اسلامی پر تجدید نظر کی ضرورت کا احساس بھی رکھتے ہیں۔ اسی مضمون میں اقبال اصلاح تمدن کی بحث میں مسلمانوں میں اصلاح تمدن کے سوال کو ایک مذہبی سوال قرار دیتے ہوئے وضاحت کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی تمدنی زندگی کا کوئی بھی پہلو ایسا نہیں جو ہمارے اصول مذہب سے جدا ہو۔ کیونکہ اقبال کی رائے میں اسلامی تمدن مذہب اسلام کی عملی صورت کا نام ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ ''حالات زندگی میں ایک عظیم الشان انقلاب آ جانے کی وجہ سے بعض ایسی تمدنی ضروریات پیدا ہو گئی ہیں کہ فقہا کے استدلات جن کے مجموعے کو عام طور پر شریعت اسلامی کہا جاتا ہے، نظر ثانی کی محتاج ہیں۔ میرا یہ عندیہ نہیں کہ مسلمات مذہب میں کوئی اندرونی نقص ہے، جس کے سبب سے وہ ہماری موجودہ تمدنی

ضروریات پر حاوی نہیں ہیں' بلکہ میرا مدعا یہ ہے کہ قرآن شریف اور احادیث کے وسیع اصول کی بنا پر جو استدلال فقہا نے وقتاً فوقتاً کیے ہیں ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو خاص خاص زمانوں کے لیے واقعی مناسب اور قابل عمل تھے' مگر حال کی ضروریات پر کافی طور پر حاوی نہیں۔" (۶) اقبال اگرچہ شریعت اسلامی کی تدوین وتوضیح میں امیر المومنین حضرت علیؓ اور حضرت امام ابوحنیفہ کی مساعی کی توصیف کرتے ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ "اگر موجودہ حالات زندگی پر غور وفکر کیا جائے' تو جس طرح ہمیں اس وقت تائید اصول مذہب کے لیے ایک جدید علم کلام کی ضرورت ہے۔ اس طرح قانون اسلامی کی جدید تفسیر کے لیے ایک بہت بڑے فقہیہ کی ضرورت ہے۔ جس کے قوائے عقلیہ ومتخیلہ کا پیمانہ اس قدر وسیع ہو کہ وہ مسلمات کی بنا پر قانون اسلامی کو نہ صرف ایک جدید پیرائے میں منظم ومرتب کر سکے' بلکہ تخیل کے زور سے اصول کو ایسی وسعت دے سکے جو حال کے تمدنی تقاضوں کی تمام ممکن صورتوں پر حاوی ہو۔" (۷) اس دور میں قانون اسلامی کی تدوین نو کی ضرورت کا احساس تو اقبال کے ہاں بڑی شدت سے پایا جاتا ہے لیکن ابھی انہوں نے بدلتی ہوئی تمدنی صورت حال میں قانون اسلامی کی جدید تفسیر کے لیے فرد اور ادارے کے کردار اور دائرہ عمل پر گہرا غور وفکر نہیں کیا تھا' ایک بہت بڑے فقہیہ کا تصور آئمہ اربعہ کی مساعی کے تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ لیکن اس موضوع پر اقبال کے ہاں یہ احساس بھی موجود ہے کہ "اگر اس کام کی اہمیت کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام شاید ایک سے زیادہ دماغوں کا ہے اور اس کی تکمیل کے لیے کم از کم ایک صدی کی ضرورت ہے" (۸) گویا اقبال کے ہاں ابتداء سے یہ احساس بھی موجود تھا کہ جدید دور میں متعدد وجوہ کی بنا پر فقہ اسلامی کی تدوین کا کام کسی ایک عالی دماغ متقنن کے لیے ممکن نہیں رہا۔ اس وقت جس کام کے لیے اقبال ایک سے زیادہ دماغوں کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ خطبہ اجتہاد میں اقبال اس کام کو جمہور کی منتخب پارلیمان کے سپرد کرنے کی ضرورت واہمیت پر روشنی ڈالتے نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ بحث بعد میں' یہاں ہم صرف یہ دیکھ رہے ہیں کہ اقبال دین اسلام کے بارے میں کیا تصور رکھتے ہیں اور یہ کہ عمومی طور پر مذہبی تفکر اور خصوصی طور پر فقہ اسلامی کی تشکیل جدید کے بارے میں ان کے تصورات اور تجاویز کیا ہیں۔ اقبال کو اس بات کا شدید قلق رہا کہ عوام الناس کی مذہبی تعلیم وتربیت کی تمام تر ذمہ داری

جن مولوی حضرات پر ہے وہ بوجوہ نامکمل تعلیم یافتہ اور بیشتر صورتوں میں اپنے حقیقی منصب کے اہل نہیں ہوتے۔ ۱۹۰۴ء والے مضمون قومی زندگی میں ایسے ہی مولوی صاحبان کا ذکر کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں کہ "مولوی صاحبان کی یہ حالت ہے کہ اگر کسی شہر میں اتفاق سے دو جمع ہو جائیں تو حیات مسیح یا آیات ناسخ و منسوخ پر بحث کرنے کے لیے باہمی نامہ و پیام ہوتے ہیں اور اگر بحث چھڑ جائے اور بالعموم بحث چھڑ جاتی ہے تو ایسی جوتیوں میں دال بٹتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ پرانا علم و فضل جو علمائے اسلام کا خاصا تھا نام کو بھی نہیں رہا۔ ہاں مسلمان کافروں کی ایک فہرست ہے کہ اپنے دست خاص سے اس میں روز بروز اضافہ کرتے رہتے ہیں"۔ (۹) ایسے مولوی صاحبان جمود اور تقلید کی تاریکی میں پرورش پاتے ہیں اور اس تاریکی کی طرف اٹھنے والی ہر شعاع کو دین پر حملہ تصور کرتے ہیں۔ ۱۹۱۰ء کے خطبہ علی گڑھ مسلم کمیونٹی میں بھی اقبال اس تاسف کا اظہار کرتے ہیں کہ "ہمارے ہاں مسلمانوں کی اخلاقی تربیت کا کام مولویوں اور واعظوں کے انتہائی نااہل طبقے کے ہاتھ میں ہے اور اسلامی تاریخ و ادبیات سے متعلق ان مولویوں اور واعظوں کا علم بے حد محدود ہے۔" (۱۰) یہاں میں نے اس دور کے پیشہ ور مولوی صاحبان کے بارے میں اقبال کی رائے کا اجمالی تذکرہ اس لیے کیا ہے کہ اجتہاد اور اس کے متعلقات کے بارے میں اقبال کے موقف کی سب سے زیادہ مخالفت اس قبیل کے مولوی صاحبان نے کی تھی۔ اجتہاد اور اس کے متعلقات پر طویل غور و فکر، مشاورت اور تدبر کے بعد اقبال نے ۱۹۲۴ء میں ایک مقالہ بعنوان اسلام اور اجتہاد، ترتیب دیا۔ اقبال اگرچہ اجتہاد اور اس کے متعلقات کے بارے میں اپنے علم اور مطالعے سے کلی طور پر مطمئن نہیں تھے۔ خود اقبال کا یہ تاثر کہ "میری مذہبی معلومات کا دائرہ نہایت محدود ہے۔ البتہ فرصت کے اوقات میں، میں اس بات کی کوشش کیا کرتا ہوں کہ ان معلومات میں اضافہ ہو۔" (۱۱) حد درجہ انکسار اپنے اندر لیے ہوئے ہے، لیکن ایسے ہی انکسار کی وجہ سے اقبال یہ اصرار کرتے رہے کہ اجتہاد کا موضوع اس قدر آسان نہیں جتنا کہ آغاز میں خیال کیا گیا تھا۔ اس ضمن میں اقبال نے ذاتی مطالعات کے علاوہ برصغیر کے بعض نامور علماء کرام کے ساتھ مشاورت بھی کی۔ عمومی طور پر یہ مشاورت مکاتیب کے ذریعے تھی۔ اقبال نے متعدد سوالات علماء کے سامنے رکھے۔ انہیں بہت ساری معلومات بھی حاصل ہوئیں لیکن

مجموعی طور پر انہیں جو جوابات موصول ہوتے رہے ان کا انداز کلامی ہوتا تھا بہت سارے موضوعات سے موصول ہونے والے جوابات اقبال کو مطمئن نہ کر سکے تھے اور بسا اوقات اقبال کے مافی الضمیر کو صحیح تناظر میں سمجھنے سے گریز بھی نظر آتا تھا لیکن اس ساری صورتحال نے اجتہاد کے متعلق اپنے اساسی موقف پر اقبال کے اعتماد اور یقین کو پختہ تر کر دیا۔ عام مولوی صاحبان کے پاس اقبال کے لیے فتاویٰ تکفیر کے سوا کچھ نہ تھا چنانچہ کفر کا ایک فتویٰ ۱۹۲۴ء میں "اسلام اور اجتہاد" والے خطبے کے جواب میں بھی آیا۔ یہ فتویٰ مسجد وزیر خان کے مولانا ابو محمد دیدار علی شاہ نے جاری کیا تھا جو اس سے پہلے گایتری منتر کے اردو ترجمے پر اقبال کو دائرہ اسلام سے خارج کر کے اپنی نجات اخروی کا سامان کر چکے تھے۔ ۱۳ دسمبر ۱۹۲۴ء کو لاہور میں اسلامیہ کالج کے حبیبہ ہال میں شیخ عبدالقادر کی صدارت میں اقبال نے اپنا مقالہ انگریزی زبان میں پیش کیا تھا اقبال اس موقع پر موجود مولانا ظفر علی خان کی خواہش کے باوجود اس مقالے کے اردو ترجمے کی اجازت دینے سے گریز کیا تھا۔ لیکن اگلے روز کے بعض اردو اخبارات میں شائع ہونے والی متفرق رپورٹس کی بنیاد پر ایک طوفان اقبال کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ اس ردعمل سے اقبال کبیدہ خاطر ضرور ہوئے لیکن ان کے عزم میں کوئی فرق نہ آیا' مقالہ پیش کرنے کے چند ماہ بعد مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی کو ایک خط میں اقبال لکھتے ہیں کہ "آپ نے ٹھیک فرمایا ہے پیشہ ور مولویوں کا اثر سر سید احمد خان کی تحریک سے بہت کم ہو گیا تھا مگر خلافت کمیٹی نے اپنے پولیٹیکل فتووں کی خاطر ان کا اقتدار ہندی مسلمانوں میں پھر قائم کر دیا۔ یہ ایک بہت بڑی غلطی تھی جس کا احساس ابھی تک غالباً کسی کو نہیں ہوا۔ مجھ کو حال ہی میں اس کا تجربہ ہوا ہے۔ کچھ مدت ہوئی میں نے اجتہاد پر ایک انگریزی مضمون لکھا تھا جو یہاں ایک جلسے میں پڑھا گیا تھا۔ انشاء اللہ شائع بھی ہو گا۔ مگر بعض لوگوں نے مجھے کافر کہا۔" (۱۲) پیشہ ور مولویوں کا اپنی مرضی' مفاد اور رائے کو انتہائی شدت سے منوانے کی روش کا جو آغاز تحریک خلافت کے دور میں ہوا تھا وہ آج بھی اسی شدت سے جاری و ساری ہے۔ بلکہ پاکستان میں عسکری اشرافیہ نے پاکستان کے آزاد خود مختار اور جمہوری معاشرے کو مذہب کے نام پر مقید کرنے کے لیے اس طبقے کو اسی طرح استعمال کیا ہے جس طرح قیام پاکستان سے پہلے خلافت کمیٹی نے اور بعد میں کانگریس نے کیا تھا۔ اقبال اس طبقے کی جہالت' معاشرے

پر اثر و نفوذ اور اقتدار طلبی سے خائف نہیں تھے۔ وہ صاف دیکھ رہے تھے کہ دنیائے اسلام میں ایک کشمکش کا آغاز ہو چکا ہے وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "میری رائے میں جدید اسلامی ملتوں کے لیے جدید دعیاتی افکار کی توسیع و ترویج ضروری ہے قدیم اور جدید اصولات تعلیم کے مابین اور روحانی آزادی اور معبدی اقتدار کے مابین دنیائے اسلام میں ایک کشاکش شروع ہو چکی ہے"۔ (۱۳) یہ کشاکش تحریک پاکستان کے زمانے میں نہایت واضح صورت میں سامنے آئی۔ پولیٹیکل علماء کے اسی منظم گروہ نے مسلمانان برصغیر کے لیے ایک جداگانہ اسلامی جمہوری ریاست کے قیام کی بھرپور مخالفت کی اور متحدہ قومیت کے فریب کی وکالت کرتے رہے۔ اور ان میں سے بعض اب بھی اس بات پر فخر کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے قیام پاکستان کے بعد "پولیٹیکل علماء" نے نہایت منظم طور پر اس پاکستان کا فکری نظم و نسق سنبھال لیا جسکے قیام کے وہ سخت مخالف رہے تھے یہ کشاکش اپنی غارت گری سمیت آج بھی پوری شدت سے جاری و ساری ہے اور قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اس طبقے کے سامنے سب سے بڑی نظریاتی رکاوٹ اقبال اور فکر اقبال ہے۔ اس طبقے نے اقبال اور فکر اقبال کو بھی اپنے حصار میں لینے کی سعی کی ہے لیکن اقبال بہر حال اقبال ہے۔

بایں ہمہ اپنے خطبہ اجتہاد میں اقبال اسلام کی ہیئت ترکیبی میں حرکت اور تغیر قائم رکھنے والے عنصر کو اجتہاد قرار دیتے ہیں۔ (۱۴) لغوی اعتبار سے اقبال بتاتے ہیں کہ اجتہاد کے معنی کوشش کرنے کے ہیں لیکن فقہ اسلامی کی اصطلاح میں اس کا مطلب ہے وہ کوشش جو کسی قانونی مسئلے میں آزادانہ رائے قائم کرنے کے لیے کی جائے۔ (۱۵) ایسی آزادانہ رائے قائم کرنے کے اصول کی وضاحت کے لیے اقبال ایک حدیث مبارکہ پیش کرتے ہیں جس کی روایت کے مطابق جناب رسالت مآب ﷺ نے حضرت معاذؓ ابن جبل کو یمن کا عامل مقرر کیا تو فرمایا "معاملات کا فیصلہ کیسے کرو گے؟ انہوں نے کہا: کتاب اللہ کے مطابق۔ لیکن اگر کتاب اللہ نے ان میں تمہاری رہنمائی نہیں کی تو پھر؟ پھر اللہ کے رسول ﷺ کی سنت کے مطابق۔ لیکن اگر سنت رسول بھی ناکافی ٹھہری تو؟" اس پر حضرت معاذ نے کہا: تو پھر میں خود ہی کوئی رائے قائم کرنے کی کوشش کروں گا۔" (۱۶) گویا اجتہاد آزادانہ تجزیئے رائے اور اس کی بنیاد پر کیے گئے

فیصلے کا نام ہے۔ ڈاکٹر خالد مسعود وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''اجتہاد کی اصطلاح قرونِ اولیٰ میں ''آزادانہ رائے'' کے معنوں میں استعمال ہوئی تھی۔ ایک طرح سے یہ اصطلاحی تعریف رائج ہونے سے پہلے کا مفہوم ہے'' (۱۷) مذکورہ بالا حدیث مبارکہ سے قانونی معاملات پر آزادانہ رائے قائم کرنے کے درج ذیل اصول سامنے آتے ہیں:

اول: اللہ کی کتاب یعنی قرآن مجید سے رہنمائی لی جائے گی۔ اقبال متوجہ کرتے ہیں کہ ''اسلامی قانون کا اولین ماخذ قرآن ہے۔ لیکن قرآن کوئی قانونی ضابطہ نہیں۔ اس کا حقیقی منشا یہ ہے کہ ذہن انسانی میں اس تعلق کا جو اسے کائنات اور خالق کائنات سے ہے اعلیٰ اور بہتر شعور پیدا کرے''

(۱۸) دوم: اللہ کے رسول ﷺ کی سنت سے رجوع کیا جائے گا اور سوم: کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کی روشنی میں اور اس روشنی کی پیدا کردہ بصیرت کی بنا پر آزادانہ رائے قائم کی جائے گی اصطلاحاً اسے قیاس کہتے ہیں۔

اقبال نے اجتہاد سے متعلق اپنے مباحث کی حدود کا تعین کرتے ہوئے وضاحت کردی ہے کہ: اگرچہ مذاہب فقہ کے نزدیک اجتہاد کے تین درجے ہیں، یعنی:

اول: تشریع یا قانون سازی میں مکمل آزادی (لیکن عملاً جس سے صرف مذاہب فقہ کے بانیوں نے فائدہ اٹھایا)

دوم: تشریع یا قانون سازی کی محدود آزادی، جو کسی مخصوص مذہب فقہ کی حدود کے اندر ہی استعمال کی جاسکتی ہے۔

اور سوم: تشریع یا قانون سازی کی وہ محدود آزادی، جس کا تعلق کسی ایسے مسئلے کی قانونی تعبیر سے ہو، جسے مذاہب فقہ کی بنیاد رکھنے والوں نے جوں کا توں چھوڑ دیا ہو: (یعنی حل نہ کیا ہو۔)۔(۱۹) لیکن اقبال نے تشکیل جدید کے خطبے 'الاجتہاد فی الاسلام' میں اپنے دائرہ بحث کو اجتہاد کی پہلی شق یعنی کسی مسئلے کی تشریع یا قانون سازی میں مکمل آزادی تک محدود رکھا ہے اور دیکھا جائے تو فی زمانہ اسلام کی ہیئت ترکیبی کے متحرک اور متغیر عنصر اجتہاد کا اطلاق زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ قانون سازی میں مکمل

آزادی پر کرنا ہی بنیادی ضرورت ہے۔ اگر اس ضرورت کی اہمیت کا شعور پختہ ہو جائے اور اسی طرح عملی مظاہرے کے امکانات بھی روشن ہوئے، تو پھر بقیہ دو شقیں بھی خود بخود اس ذیل میں آ جائیں گی۔ اس سے پیشتر کہ اس خطبے میں اقبال کی اجتہاد سے متعلق پیش کردہ مثالوں علی ہذا بیان کردہ اصول کی روشنی میں اسلامی جمہوری ریاست کے معاملات و مسائل پر بحث کریں، بہتر معلوم ہوتا ہے کہ خطبے کے جملہ مباحث پر ایک سرسری نگاہ ڈال لی جائے۔ خطبے کے آغاز میں اجتہاد کی لغوی و اصطلاحی تعریف اور اس کی اطلاقی حدود کو بیان کرنے کے بعد اقبال تاریخی بنیادوں پر یہ سراغ لگاتے ہیں کہ زندگی کو متغیر و متحرک قرار دینے والے قرآن مجید پر استوار نظام قانون کیونکر جامد ہوا۔ یعنی یہ کہ وہ کیا اسباب تھے جنہوں نے اجتہاد کے دروازے بند کر دیئے۔ (۲۰) اس ضمن میں اقبال دولت عباسیہ کے ساتھ ساتھ سر اٹھانے والی عقلی تحریک (معتزلہ کی تحریک) اور اس کے برپا کردہ تلخ سلسلہ بحث و نزاع، (۲۱) اس کے منطقی ردعمل کے طور پر فروغ پانے والے رہبانی تصوف کا (۲۲) اور اسلامی دنیا کے ذہنی و فکری مرکز بغداد کی تباہی، کہ جس کے نتیجے میں فقہائے متقدمین کی تعبیرات قوانین شریعت (یعنی اجتہادات) کو جوں کا توں برقرار رکھنے اور اس میں تغیر و تبدل کے تمام دروازے تقریباً بند کر دینے کا رجحان پیدا ہوا، (۲۳) ذکر کرتے ہیں۔ جمود کے اسباب بیان کرنے کے بعد اقبال احیا کا مطالعہ پیش کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ زوال کے بعد قدامت پسند مفکرین نے اسلام کی ہیئت اجتماعیہ کو محفوظ رکھنے کے لیے اس کے گرد نظم و ضبط کا حصار کھینچ دیا۔ اس طرح دور ابتلا میں بقا کا اہتمام تو ہو گیا، لیکن اس طرح حد سے بڑھے ہوئے نظم و ضبط میں فرد کی ذاتی ہستی فنا ہو جاتی ہے۔ اقبال یہ اصول پیش کرتے ہیں کہ ''قوموں کی تقدیر اور ہستی کا دارومدار اس امر پر نہیں کہ ان کا وجود کہاں تک منظم ہے، بلکہ اس بات پر ہے کہ افراد کی ذاتی خوبیاں کیا ہیں؟ اور قدرت و صلاحیت کیا؟'' (۲۴) اس اصول کی بنیاد پر اقبال قوائے انحطاط کے سدباب کے لیے معاشرے میں خود شناس و خودنگر افراد کی پرورش، اور ان کی بصیرت سے سامنے آنے والے فکر و عمل کے نت نئے معیار کو ضروری قرار دیتے ہیں، تاکہ اس بات کا احساس موجود رہے کہ ہمارا ماحول سرے سے ناقابل تغیر و تبدل نہیں، اس میں اصلاح اور نظر ثانی کی گنجائش موجود ہے۔ (۲۵) اقبال بتاتے ہیں کہ احترام ماضی کے غلط تصور اور افراد کا

اپنی بصیرت پر عدم اعتماد پیدا کرنے کا باعث بے جا نظم وضبط کہ جو اسلام کی اندرونی روح کے منافی تھا' ایک بڑے ردعمل کا متقاضی تھا یہ ردعمل ہوا۔ اس ضمن میں اقبال امام ابن تیمیہ اور ان کے تصورات اجتہاد کا ذکر کرتے ہیں۔ امام ابن تیمیہ نے مذاہب اربعہ کی قطعیت سے انکار کرتے ہوئے (۲۶) ان کے پیدا کردہ جمود پر ضرب لگائی اور فقہ کے بنیادی ماخذ یعنی قرآن وسنت کی طرف رجوع کر کے اپنے حق اجتہاد کو استعمال کیا۔ پھر اقبال ابن حزم کے فقہ حنفی سے اختلاف کا ذکر کر کے مصر کے مفسر ومحدث السیوطی کا مختصر ذکر کرتے ہیں کہ جنہوں نے آزادی اجتہاد کا دعویٰ کیا۔ انہی خود شناس وخودنگر افراد نے کہ جن کی بصیرت نے فکر وعمل کے نت نئے معیار پیش کیے احیاء کی کئی تحریکوں کو جنم دیا۔ مثلاً سنوسی تحریک' سید جمال الدین افغانی کی تحریک اتحاد اسلامی' اور محمد بن عبدالوہاب کی تحریک۔ اس کے بعد اقبال جدید دور کے حوالے سے ترکوں کی اجتہادی مساعی اور اس میں کارفرما تصورات پر تفصیل سے بحث کرتے ہیں۔ دور حاضر میں ترکی کے حوالے سے مسلمانوں کے اجتہاد سے متعلق خیالات' علیٰ ہذا عملی اقدامات کا ذکر کرنے کے بعد اقبال اسلامی قانون کی ہیئت ترکیبی' وسعت امکانات اور متحرک روح کا تذکرہ کرتے ہوئے چند نکات کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

اول یہ کہ آغاز اسلام سے لیکر دور عباسیہ کے آغاز تک قرآن مجید کے سوا مسلمانوں کا کوئی تحریری قانون نہیں تھا۔ (۲۷)

دوم یہ کہ پہلی صدی کے تقریباً وسط سے لے کر چوتھی صدی کے آغاز تک عالم اسلام میں انیس مذاہب فقہ کا ظہور ہو چکا تھا جس سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے قانون دانوں نے ایک بڑھتے ہوئے تمدن کی ضروریات کے پیش نظر کس قدر سعی اور جدوجہد سے کام لیا۔ (۲۸) اور یہ کہ وہ زمانے کے تقاضوں کا وسعت نظر سے ساتھ دینے کی خاطر اپنے سلسلہ تعبیر وتاویل میں استخراج کی بجائے رفتہ رفتہ استقرائی منہاج اختیار کرتے چلے گئے۔ (۲۹)

اور سوم یہ کہ اقبال اسلامی قانون سازی کے متذکرہ بالا رجحانات اور ان میں کارفرما روح اور بالخصوص اسلامی قانون کے ماخذ (قرآن مجید' حدیث شریف' اجماع اور قیاس) کے حوالے سے وضاحت

کرتے ہیں کہ اسلامی قانون سازی کے لیے کسی جمود کا شکار رہنا درست نہیں ہے، بلکہ اسلامی قانون سازی کی درخشاں روایات اور ان میں مضمر لاانتہا امکانات یہ ثابت کرتے ہیں کہ اس میں مزید نشوونما اور توسیع وارتقاء کا امکان موجود ہے۔(۳۰) اس کے بعد اقبال اسلامی قانون کے بنیادی مآخذ کی وضاحت کرتے ہیں، جو اول: قرآن مجید، دوم: حدیث شریف، سوم: اجماع امت، چہارم: قیاس پر مشتمل ہیں۔

قرآن مجید کے حوالے سے اقبال کے رجحان کا ذکر ہو چکا ہے۔ اسلامی قانون کے مآخذ دوم یعنی حدیث شریف کے ضمن میں اقبال صحت و عدم صحت حدیث کے معاملات ومسائل کے پیش نظر نہایت محتاط طرز عمل کی طرف اشارہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ اجتہاد میں حوالہ بناتے وقت فقہی اور غیر فقہی احادیث میں امتیاز قائم کر لینا چاہیے۔ اس ضمن میں بعض نکات کے حوالے سے شاہ ولی اللہ کی علمی مساعی کی توصیف کرتے ہوئے اسے حوالہ بھی بناتے ہیں، خطبے میں اقبال لکھتے ہیں کہ ''لیکن جہاں تک مسئلہ اجتہاد کا تعلق ہے ہمیں چاہیے ان احادیث کو جن کی حیثیت سرتاسر قانونی ہے، ان احادیث سے الگ رکھیں جن کا قانون سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر اول الذکر کی بحث میں بھی ایک بڑا اہم سوال یہ ہوگا کہ ان میں عرب قبل اسلام کے اس رسم ورواج کا جسے جوں کا توں چھوڑ دیا گیا، یا جس میں حضور رسالت مآب ﷺ نے تھوڑی بہت ترمیم کر دی، کس قدر حصہ موجود ہے۔ لیکن یہ وہ حقیقت ہے جس کا انکشاف مشکل ہی سے ہو سکے گا۔ کیونکہ علمائے متقدمین شاذ ہی اس رسم ورواج کی طرف اشارہ کرتے ہیں ہمیں تو شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ جس رسم ورواج کو جوں کا توں چھوڑ دیا گیا، خواہ حضور رسالت مآب ﷺ نے اس کی بالصراحت منظوری دی یا خاموشی اختیار فرمائی، اس پر کیا سچ مچ ہر کہیں اور ہر زمانے میں عمل کرنا مقصود تھا۔ شاہ ولی اللہ نے اس مسئلے میں بڑی سبق آموز بحث اٹھائی ہے...... شاہ ولی اللہ کہتے ہیں انبیا کا عام طریق تعلیم تو یہی ہے کہ وہ جس قوم میں مبعوث ہوتے ہیں ان پر اسی قوم کے رسم ورواج اور عادات و خصائص کے مطابق شریعت نازل کی جاتی ہے۔ لیکن جس نبی کے سامنے ہمہ گیر اصول ہیں اس پر نہ تو مختلف قوموں کے لیے مختلف اصول نازل کیے جائیں گے نہ یہ ممکن ہے کہ وہ ہر قوم کو اپنی اپنی ضروریات کے لیے الگ الگ اصول عمل متعین کرنے کی اجازت دے۔ وہ کسی ایک قوم کی تربیت کرتا اور پھر ایک

عالمگیر شریعت کی تشکیل میں اس سے تمہید کا کام لیتا ہے۔ لیکن ایسا کرنے میں وہ اگرچہ انہیں اصولوں کو حرکت دیتا ہے جو ساری نوع انسانی کی حیات اجتماعیہ میں کارفرما ہیں، پھر بھی ہر معاملے اور ہر موقع پر عملاً ان کا اطلاق اپنی قوم کی مخصوص عادات کے مطابق ہی کرتا ہے۔ لہٰذا اس طرح جو احکام وضع ہوتے ہیں (مثلاً تعزیرات) ایک لحاظ سے اسی قوم کے لیے مخصوص ہوں گے۔ پھر چونکہ احکام مقصود بالذات نہیں، اس لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ ان کو آئندہ نسلوں کے لیے بھی واجب ٹھہرایا جائے شاید یہی وجہ تھی کہ امام ابو حنیفہ نے جو اسلام کی عالمگیر نوعیت کو خوب سمجھ گئے تھے احادیث سے اعتنا نہیں کیا۔ انہوں نے اصول، استحسان یعنی ''فقہی ترجیح'' کا اصول قائم کیا جس کا تقاضا یہ ہے کہ قانونی غور وفکر میں ہم ان احوال و ظروف کا بھی جو واقعتاً موجود ہیں باحتیاط مطالعہ کریں۔'' (۳۱) اسلامی قانون کے تیسرے مآخذ یعنی اجماع کو اقبال اسلام کے قانونی تصورات میں سب سے زیادہ اہم قرار دیتے ہوئے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں اس نہایت ہی اہم تصور پر اگرچہ اسلام میں نظری اعتبار سے مباحث ہوتے رہے لیکن عملاً اس کی حیثیت ایک خیال سے آگے نہ بڑھ سکی۔ (۳۲) اور اس وجہ سے اسلامی قانون سازی کے حوالے سے اجماع کا تصور ایک مستقل اور موثر ادارے کی صورت اختیار نہ کرسکا۔ اقبال اس کی وجوہ کا سراغ لگاتے ہوئے وضاحت کرتے ہیں کہ ''خلیفہ چہارم کے بعد جب اسلام میں مطلق العنان ملوکیت نے سر اٹھایا تو یہ اس کے مفاد کے خلاف تھا کہ اجماع کو ایک مستقل تشریعی ادارے کی شکل دی جاتی۔ اموی اور عباسی خلفا کا فائدہ اسی میں تھا کہ اجتہاد کا حق بحیثیت افراد مجتہدین ہی کے ہاتھ میں رہے۔ اس کی بجائے کہ اس کے لیے ایک مستقل مجلس قائم ہو۔ جو بہت ممکن ہے انجام کاران سے بھی زیادہ طاقت حاصل کرلیتی۔ (۳۳) اس پس منظر میں اقبال اس بات پر اطمینان کا اظہار کرتے ہیں کہ متعدد وجوہ کی بنا پر دنیائے اسلام میں اجماع کی قدر و قیمت اور اس کے مخفی امکانات کا شعور پیدا ہو رہا ہے۔ اقبال امید ظاہر کرتے ہیں دنیائے اسلام میں جمہوری روح کا نشو و نما اور قانون ساز مجالس کے قیام کے بعد، مذاہب اربعہ کے نمائندے جو سردست فرداً فرداً اجتہاد کا حق رکھتے ہیں، اپنا یہ حق مجالس تشریعی کو منتقل کردیں گے۔ اقبال اپنی اس پختہ رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ ''میرے نزدیک یہی ایک طریقہ ہے جس سے کام لے کر

ہم زندگی کی اس روح کو جو ہمارے نظامات فقہ میں خوابیدہ ہے از سر نو بیدار کر سکتے ہیں۔"(۳۴) اسلامی قانون کے چوتھے ماخذ قیاس یعنی قانون سازی میں مماثلتوں کی بناء پر استدلال سے کام لینے کے بارے میں اقبال کہتے ہیں کہ یہی قیاس جو شروع شروع مجتہدین کی ذاتی رائے کا ایک دوسرا نام تھا' آخر کار شریعت اسلامیہ کے لیے حرکت اور زندگی کا سرچشمہ بن گیا (۳۵) حنفی مکتب فکر سے منسوب اور ارسطا طالیسی منطق سے متاثر اسی تصور قیاس کو اقبال قانون سازی کے آریائی رجحان سے تعبیر کرتے ہوئے امام مالک اور مام شافعی کی طرف سے بطور ایک ماخذ قانون امام ابوحنیفہ کے اصول قیاس پر علمی تنقید کو آریائی رجحان کے خلاف ایک بڑی اور موثر سامی روک قرار دیتے ہیں۔ اور اقبال کے نزدیک اسی تنقید کی وجہ سے یہ احساس پیدا ہوا کہ اصول فقہ کی تعبیر و ترجمانی میں زندگی کے حقیقی تنوع اور حرکت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے (۳۶) اقبال کا واضح رجحان یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی بھی فقہی تعبیر کی حیثیت دوامی نہیں ہوتی اور نہ ہی ہونی چاہیے۔

اب ہم آتے ہیں ایک اسلامی جمہوری ریاست میں اجتہاد سے کام لے کر کس طرح مسائل حل کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ ایک جدید مسلم ریاست کے جمہوری مسائل کے حوالے سے اقبال نے ترکوں کی مذہبی اور سیاسی فکر علیٰ ہذا اجتہادی تصورات کو بطور خاص موضوع بنایا ہے۔ اور انہی کی مثالوں سے اپنا موقف واضح کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "ترکوں کے سیاسی اور مذہبی افکار میں اجتہاد کا جو تصور کام کر رہا تھا اسے عہد حاضر کے فلسفیانہ خیالات سے اور زیادہ تقویت پہنچی اور جس سے اس میں مزید وسعت پیدا ہوتی چلی گئی۔"(۳۷) اقبال ترکی فکر کے دو رجحانات کا ذکر کرتے ہیں۔

اول: حزب وطنی' جس کی واحد دلچسپی ریاست تھی اور جسے مذہب سے کوئی سروکار نہ تھا۔ گویا یہ ترکی وطن پرست ریاست اور کلیسا کی مسیحی مثال (تھیا کریسی) کے پیش نظر اسلامی ہیئت میں بھی اس تفریق کو فرض کیے ہوئے تھے۔ دور حاضر کے مخصوص سیاسی اور سماجی مسائل کے حوالے سے اس نقطہ نظر کی تنقید بے حد ضروری معلوم ہوتی ہے کیونکہ مذہب کو معاملات سیاست و ریاست سے الگ تھلگ خیال کرنے کا رجحان آج بھی جوں کا توں موجود ہے۔

دوم: حزبِ اصلاح مذہبی، جس کے داعی سعید حلیم پاشا تھے۔ وہ اسلام میں دوئی (ریاست اور مذہب میں، حقیقت اور مجاز میں، علیٰ ہذا) کے قائل نہ تھے۔ ان کے پیش نظر اسلام کا پیدا کردہ وہ حسین امتزاج تھا جس نے حیات انسانی کو ایک وحدت کی صورت میں پیش کیا۔ اقبال سعید حلیم پاشا کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اسلام نے حریت، مساوات اور استحکام انسانیت کی ابدی صداقتوں کو چونکہ ایک وحدت میں سمو دیا، لہٰذا اس کا کوئی وطن نہیں (۳۸) اسلام عالمگیر انسانی معاشرے کا داعی ہے۔ وہ کسی خاص قوم کی عادات و خصائل کے ساتھ وابستہ نہیں ہے۔

سعید حلیم پاشا کے بعد اقبال ترک مفکر ضیاء گوک آلپ کے اجتہادی شعور کا ذکر کرتے ہیں، جس سے اقبال نے بعض جگہ اختلاف بھی کیا ہے۔ لیکن بہر حال، ترکوں کے حوالے سے جدید اجتہادی رجحانات کو سمجھنے کے لیے ضیاء کا مطالعہ بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ اپنے خطبے میں اقبال نے ضیاء کی چار نظموں کا حوالہ پیش کر کے ان کے اتحاد اسلام کے نئے تصور (۳۹) جدید ترکیہ میں پرورش پانے والے مذہبی مطمح نظر، (۴۰) دین کے روحانیت خیز افکار کو عربی کی بجائے ترکی زبان میں ادا کرنے کی خواہش (۴۱) اور جدید معاشرے میں عورت کے مقام اور حقوق کے بارے میں اجتہادی تصورات کو اجاگر کیا ہے۔ اس طرح دور جدید میں اجتہاد کے بارے میں ترکوں کے خیالات بیان کرنے کے بعد اقبال ان کی فکری آزاد روی کو سراہتے ہیں (۴۲) ان کے نزدیک جدید تر حالات کے تناظر میں جس ذہنی انقلاب سے ترک دوچار ہو رہے ہیں، عنقریب دوسرے اسلامی ممالک بھی اس سے دوچار ہوں گے۔ لہٰذا...... ضرورت اس بات کی ہے کہ اجتہاد کی متحرک روح اور اس کی بنیاد پر تشکیل پانے والے جدید مسلمانوں کے فکری رجحانات پر گہری نظر رکھی جائے۔ ضیاء کے خیالات نے دور انقلاب میں ترکوں کے غور و فکر کی تشکیل میں گہرا حصہ لیا۔ ہر چند کہ مصطفیٰ کمال پاشا کی عملی اصلاحات اور ضیاء کے تصورات میں عدم مطابقت کے آثار ملتے ہیں، لیکن بہر حال جدید ترکیہ کو ایک سیکولر (۴۳) ریاست بنانے میں ضیاء کی فکری رہنمائی شامل ہے۔ بایں ہمہ، سعید حلیم پاشا کے اسلام سے متعلق حقیقت پسندانہ خیالات اور ضیاء گوک آلپ کے جدید نظریات سے متاثر اجتہادی تصورات کے تناظر میں اقبال جدید دنیائے اسلام میں پرورش پانے والے،

اور اسی کی مدد سے رونما ہونے والے فکری انقلاب کا سراغ لگاتے ہیں۔ عملی اعتبار سے اقبال ترکوں کے جس اجتہاد کو سراہتے ہیں، وہ ہے (اسلام کی حرکی روح کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اور حالات کے تقاضوں کے عین مطابق) منصب خلافت کسی فرد واحد کی بجائے کسی جماعت، یا منتخب مجلس کے سپرد کیا جا سکتا ہے۔ اقبال اس اجتہاد کو دور حاضر کی جمہوری روح سے قریب پاتے ہیں۔ دراصل اقبال متعدد وجوہ کی بناء پر ریاست کے بارے میں کسی بھی ایسے اصول کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہیں کہ جس میں زمام اقتدار کسی فرد واحد کے ہاتھ میں ہو۔ ایسا چاہے خلافت کے نام پر ہو یا ملوکیت کے نام پر امر واقعہ یہ ہے کہ اقبال آمریت کی کسی بھی صورت کو قبول نہیں کرتے ۔ وہ اس تصور کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہیں کہ اسلامی ریاست بنیادی طور پر آمرانہ یا شخصی اختیارات کی حامل ہے۔ خطبہ اجتہاد میں اقبال لکھتے ہیں کہ "بہ حیثیت ایک اصول عمل توحید اساس ہے حریت، مساوات اور حفظ نوع انسانی کی۔ اب اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو از روے اسلام ریاست کا مطلب ہوگا ہماری یہ کوشش کہ یہ عظیم اور مثالی اصول زمان و مکاں کی دنیا میں ایک قوت بن کر ظاہر ہوں۔ وہ گویا ایک آرزو ہے ان اصولوں کو ایک مخصوص جمعیت بشری میں مشہود دیکھنے کی۔ لہٰذا اسلامی ریاست کو حکومت الٰہیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے تو انہی معنوں میں۔ ان معنوں میں نہیں کہ ہم اس کی زمام اقتدار کسی ایسے خلیفۃ اللہ فی الارض کے ہاتھ میں دے دیں جو اپنی مفروضہ معصومیت کے عذر میں اپنے جور و استبداد پر ہمیشہ ایک پردہ سا ڈال رکھے۔" (۴۴) اقبال اسلامی جمہوری ریاست کو عرب ملوکیت کے زیر اثر تشکیل پانے والے رجحانات سے پاک و مبرا دیکھنا چاہتے ہیں۔ مسلمانانِ برصغیر کے لیے ایک علیحدہ اور خود مختار اسلامی جمہوری ریاست کا تصور پیش کرتے وقت بھی اقبال کے ذہن میں ریاست کے کردار کے بارے میں کوئی ابہام نہیں تھا۔ خطبہ الٰہ آباد میں وہ برملا کہتے ہیں کہ مسلمانان برصغیر کے لیے جداگانہ ریاست کے قیام سے "...... اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کے صحیح معانی کی تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے" (۴۵)۔ ایسی اسلامی جمہوری

ریاست میں مذہب کو عامۃ الناس کی اجتماعی زندگی سے علیحدہ عنصر بنا کر اور اس کے نام پر سیاست کرنے والی جماعتوں اور گروہوں کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے؟ اگر ایک اسلامی جمہوری ریاست میں مسلمان قطعی اور فیصلہ کن اکثریت میں ہیں تو پھر مذہب یا اسلام کے نام پر کسی بھی جماعت یا گروہ کو سیاست کرنے کا حق حاصل نہیں ہونا چاہیے۔ وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی ہر سیاسی جماعت بجائے خود اس لیے اسلامی جماعت ہے کہ اس میں شامل اور عامل لوگ مسلمان ہی ہیں، ممکن ہے کہ معاملات سیاست و ریاست کے بارے میں ان کا اپنا تصور اور نقطہ نظر ہو لیکن ان کی جملہ سیاسی مساعی دراصل اس روح کے اظہار کا ایک طریقہ یا امکان ہی ہے جس کے سامنے کوئی مادی یا طبیعی بجائے خود روحانی حیات سے الگ یا متغائر نہیں ہے۔ اقبال خطبہ اجتہاد میں صراحت کرتے ہیں کہ ''مادی۔ بحیثیت مادی کوئی معنی ہی نہیں، الا یہ کہ ہم اس کی جڑیں روحانیت میں تلاش کریں۔ بالفاظ دیگر یہاں کسی ناپاک دنیا کا وجود نہیں۔ برعکس اس کے مادے کی ساری کثرت روح ہی کے ادراک ذات کا ایک میدان ہے اور اس لیے جو بھی ہے مقدس ہے، کیا خوب ارشاد فرمایا ہے حضور رسالت مآب ﷺ نے کہ ہمارے لیے یہ ساری زمین مسجد ہے لہٰذا اسلامی نقطہ نظر سے ریاست کے معنی ہوں گے ہماری یہ کوشش کہ ہم جسے روحانی کہتے ہیں اس کا حصول اپنی ہیت اجتماعیہ ہی میں کریں۔ لیکن پھر ان معنوں میں تو ہر اس ریاست کو حکومت الٰہیہ ٹھہرایا جائے گا جس کی بنا استیلا اور تغلب کی بجائے مثالی اور عینی اصولوں پر ہے۔'' (۴۶) ایسی روحانی جمہوریت یا روحانی جمہوری ریاست میں اختیار و اقتدار کا مرکز و محور فرد نہیں ادارے ہوں گے۔ ایک ریاست میں قانون سازی اور تشریع اصول کا انفرادی حق باقی رکھ کر افراط و تفریط اور تفریق در تفریق کے عمل کو روکنا ممکن نہ رہے گا۔ سیاسات کا ایک عام طالب علم بھی جانتا ہے کہ ایک منظم ریاست میں کسی بھی قانون کو نافذ ہونے کیلئے ریاست کی باقاعدہ منظوری کی ضرورت ہوتی ہے اسلامی جمہوری ریاست میں یہ منظوری نہ تو کوئی بہت بڑا فقیہہ یا عالم دے گا اور نہ ہی علماء کی کوئی نگران مجلس، یہ منظوری قانون ساز ادارے یعنی پارلیمان کے ذریعے دی جاتی ہے۔ یہ تاثر درست معلوم نہیں ہوتا کہ اسلامی شریعت کو نافذ ہونے کیلئے ریاست کی رسمی کارروائی کی ضرورت نہیں ہوتی اور قانون سے متعلق سب کچھ قاضی کی صوابدید پر ہوتا ہے۔ اب ایک

اسلامی جمہوری ریاست میں اسلامی قانون یعنی فقہ اسلامی کو رسمی قانون کا درجہ دینے کیلئے ضروری ہے کہ:

اول: جملہ فقہی مواد کو جدید طرز پر ضابطوں کی شکل میں مرتب کیا جائے اقبال اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ "میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطہ نگاہ سے زمانہ حال کے "جورس پروڈینس" پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا، وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔" (۴۷)

دوم: یہ کہ قانون رسمی طور پر رائے جمہور سے منتخب ہونے والی پارلیمان یعنی قانون ساز ادارے سے طریقہ کار کے مطابق منظور ہو کر نظام کا حصہ بنے۔ یہ انفرادی کی بجائے اجتماعی اجتہاد کی صورت ہوگی۔ دراصل اقبال کے تصور اجتہاد کی اساس قانون سازی کا یہی اجتماعی حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے پوری توانائی کے ساتھ انفرادی اجتہاد کی بجائے اجتماعی اجتہاد کی ضرورت پر زور دیا۔ لیکن اس ضمن میں وہ جس اہم تر پہلو کی طرف متوجہ کرتے ہیں وہ ہے کہ اجتماعی اجتہاد کا ذمہ دار کون ہو؟ جدید دنیائے اسلام کے حوالے سے بالعموم اور پاکستان کے موجودہ حالات کے تناظر میں بالخصوص یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ اقبال کا فیصلہ تو یہ ہے کہ اجتماعی اجتہاد کا حق ایک منتخب شدہ مجلس قانون ساز کے سپرد کیا جانا چاہیے۔ (پاکستان کے حوالے سے قومی اسمبلی کہہ سکتے ہیں) ایسی مجلس قانون ساز قرآن وسنت کی روشنی میں، اور جدید تقاضوں کے حوالے سے جو فیصلے کرے گی وہ اجتماعی اجتہاد کہلائیں گے۔ ایسی مجلس قانون ساز جمہور کی تائید سے منتخب ہو، اقبال کہتے ہیں کہ جمہوری طرز حکومت اسلام کی روح کے عین مطابق ہے۔ (۴۸)

پاکستان میں عملی طور پر طرز حکومت کا مسئلہ ابھی تک طے نہیں کیا جاسکا۔ قیام پاکستان کے محرکات، اور طریق کار کا جائزہ یہ ثابت کرتا ہے کہ رائے جمہور سے معرض وجود میں آنے والی ریاست کی ہیئت ترکیبی بھی خالص جمہوری ہو۔ پاکستان کے قائدین کے تصورات یہی تھے۔ لیکن بدقسمتی سے پاکستان اپنی تشکیل میں براہ راست حصہ لینے والی اعلیٰ تر قیادت سے جلد محروم ہوگیا اور اس کے بعد پاکستان کو ایسے طالع آزماؤں سے سابقہ پڑا جن کا واحد مطمح نظر اپنے شخصی اقتدار کا استحکام تھا۔ انہوں نے

پاکستان کی نظریاتی اور سیاسی ضروریات کو پس پشت ڈال کر اس جمہوری فکری ارتقاء کا دروازہ بند کرنا چاہا' جو تشکیل پاکستان کا باعث بنا تھا۔ نتیجتاً ملک کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا۔ پاکستان مسلمانانِ برصغیر نے جمہوری عمل کے ذریعے حاصل کیا تھا۔ لیکن یہاں اقبال کی آرزو کے مطابق نہ تو اسلام کے منتہائے نظر بین الاقوامی نصب العین کی طرف پیش رفت کی جا سکی کہ شروع شروع میں جس کو عربی شہنشاہیت نے پس پردہ ہی نہیں' پس پشت ڈال رکھا تھا (۴۹) اور نہ ہی ایک مہذب معاشرے کے خواب کو پورا کیا جا سکا۔ طالع آزماؤں نے اپنے ذاتی مفاد اور شخصی ترجیحات کے لیے اسلامی جمہوری ریاست کو فلاحی ریاست بنانے کی بجائے خطرات میں گھری ایک خوفزدہ ریاست بنا کر رکھ دیا ہے۔ دراصل پاکستان میں دگرگوں سیاسی حالات نے جو عملی صورت حال پیدا کی' اس کے مطابق' مذہبی امور میں رتی برابر روشن فکری یا کم از کم ترکوں جیسی اجتہادی بصیرت کا اظہار نہ کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں مذہب کو ایک مقید ادارہ بنا کر قدیم طرز کے ملاؤں نے تھامے رکھا۔ عوام کی اکثریت اسلام پر دل و جان سے فریفتہ' لیکن ناخواندہ اور خطرناک حد تک خوش اعتقاد ہے اس لیے قدیم ملاؤں کی گرفت مذہب کے حوالے سے مضبوط رہی۔ لیکن اجتماعی شعور میں کارفرما اجتہادی بصیرت کا راستہ روکنا ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عملی سیاست میں پاکستان کے عوام نے ہمیشہ روح عصر کو سمجھنے کی (اپنے تئیں) کوشش کی۔ اس کی ایک مثال تو یہ ہے کہ پاکستان کے لوگ اسلام سے گہری عقیدت رکھنے اور اس کے نفاذ کے دل سے آرزومند ہونے کے باوجود کبھی کسی خالص مذہبی جماعت کو انتخابات میں کامیاب نہیں کرتے۔ ان کا حق رائے دہی' اگر کبھی انہیں اس کے اظہار کا موقع ملے' ہمیشہ ان سیاسی جماعتوں کے حق میں استعمال ہوتا ہے جو عصری تقاضوں کے مطابق جمہوری روایات کو فروغ دینے کی دعوے دار ہوں۔ ہم عوام کی اس شعوری یا غیر شعوری حکمت عملی کو بھی' اجتماعی اجتہاد کا نام دے سکتے ہیں۔ پاکستان میں شاید اسلامی طرز حکومت اور جدید جمہوری طرز حکومت کو الگ الگ اور بسا اوقات متصادم ثابت کرنے کا افسوسناک رجحان بھی موجود رہا ہے۔ اس رجحان کو دور کرنے کی کوئی ٹھوس کوشش ابھی تک نہیں کی گئی۔ شاید اس لیے کہ ایسی کوشش کرنے والے کی نیت پر گہرا شک کیا جائے گا۔ قدیم طرز کے نیک نیت لیکن اسلام کے نادان دوست' علماء اسلامی نظام

سیاست وریاست سے مراد خلافت راشدہ کا جوں کا توں نفاذ لیتے ہیں وہ نہ تو زمانے کی رفتار کا اندازہ کر سکے ہیں اور نہ ہی اسلام کی روح کو سمجھنے پر آمادہ ہیں ان کی خانقاہی تربیت نے ان کے طرز عمل کو تقلید کی ژولیدگی نے کس رکھا ہے۔ انہوں نے اپنے اسلام کو اس طرح سنبھال رکھا ہے گویا اسے ہر طرف سے خطرات کا سامنا ہو۔ کیا ہمارے لیے یہ ممکن ہے کہ ہم اپنے روشن ماضی کو آواز دینے کی بجائے اس کی فراہم کردہ بصیرت سے استفادہ کرتے ہوئے' روشن تر مستقبل کے آرزومند ہوں۔ کیا ہم اسلام کی حرکی روح کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہیں؟ کیا ہم ریاست اور مذہب کی تفریق کو (جس کے ہم پاکستانی لوگ غیر شعوری طور پر مرتکب ہو رہے ہیں) ختم کرنے پر آمادہ ہیں؟ یہ اور ایسے کئی سوالات پر غور کرنا ہوگا اور اگر ہم نیک نیتی سے ایسا کرنا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں اقبال کے اجتہاد اجتماعی کے اصول کو اہمیت دیتے ہوئے اسے اپنی حیات اجتماعیہ علیٰ ہذا ہئیت سیاسیہ کا اہم اور فعال عنصر بنانا ہوگا جہاں تک طرز حکومت کا تعلق ہے اگر ہم اقبال کے نظریات سے استفادہ کرتے ہوئے قومی اسمبلی کو اجتہادی ادارے میں تبدیل کر سکیں تو پھر جدید جمہوری نظام اور اسلام میں کوئی بعد باقی نہ رہے گا' اور عوام' خالص جمہوری طرز فکر وعمل کو غیر اسلامی خیال کرنے کی الجھن سے چھٹکارہ حاصل کریں گے۔ یہ اقدامات پاکستانیوں کے لیے نئے یا انوکھے نہ ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی تاریخ ان کے شعوری یا غیر شعوری اجتماعی اجتہادات کی روشن مثالوں سے بھری پڑی ہے اور ایک ایسی قوم جس کے اجتماعی شعور میں اجتہاد کی مثالیں پنہاں ہوں' اس کے لیے اسلامی روح اور اجتہادی بصیرت کی روشنی میں جدید نظام سیاست وریاست کی تشکیل کوئی مشکل بات نہیں ہے اس ضمن میں خطبہ ''الاجتہاد فی الاسلام'' میں اقبال کی مثالیں اور وضاحتیں ہم پاکستانیوں کی اس طرح سے رہنمائی کریں گی:

الف: ہئیت مقتدرہ کا چناؤ بذریعہ انتخاب کرنا چاہیے۔

ب: فی زمانہ خلافت کا روایتی ادارہ اپنی اہمیت کھو چکا ہے' اس لیے اس کے احیاء کی خواہش کی بجائے' اجتماعی خلافت کے اصول کی طرف توجہ کرنا ہوگی۔ جہاں تک ایک اسلامی ریاست کے انتظام وانصرام اور قانون سازی کے اختیارات کا تعلق ہے' اقبال کہتے ہیں کہ وہ منتخب مجلس قانون کے سپرد کیے جائیں۔ اس

سلسلے میں اقبال ایک اہم سوال بھی اٹھاتے ہیں، وہ یہ کہ"......موجودہ زمانے میں تو جہاں کہیں مسلمانوں کی کوئی قانون ساز مجلس قائم ہوگی اس کے ارکان زیادہ تر وہی لوگ ہوں گے جو فقہ اسلامی کی نزاکتوں سے ناواقف ہیں۔ لہٰذا اس کا طریق کار کیا ہوگا، کیونکہ اس قسم کی مجالس شریعت کی تعبیر میں بڑی بڑی شدید غلطیاں کرسکتی ہیں۔ ان غلطیوں کے ازالے یا کم سے کم امکان کی صورت کیا ہوگی؟" (۵۰) اس بے حد اہم سوال کے جواب میں اقبال کا نقطہ نظر یہ ہے:

ا۔ اقبال مجلس قانون ساز کو شریعت کی تعبیر میں غلطیوں کے امکانات سے بچانے کے لیے اس پر 'علمائے دین' کی کسی نگران مجلس کے قیام کے حامی نہیں۔ اسے وہ بڑی خطرناک چیز قرار دیتے ہیں (۵۱) کیونکہ اس طرح آزادی اجتہاد کا حق عملاً علماء کے نگران گروہ کی تحویل میں چلا جائے گا۔ پاکستان کے حوالے سے عملی صورتحال کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہاں آئین سازی میں وہی خطرناک طرز عمل اختیار کیا گیا، جس کی طرف اقبال اشارہ کرتے ہیں۔ یعنی یہ کہ مجلس قانون ساز ویسے تو تمام قوانین بنانے میں آزاد ہو لیکن جہاں تک قوانین کے شریعت کے مطابق ہونے کا تعلق ہے، ان پر نظر رکھنے کے لیے دینی علوم سے واقف علماء کی الگ مجلس قائم کر دی جائے۔ یہ ایک طرح سے 'دین اور سیاست' میں دوئی کا رجحان ہے، جس کی اقبال نے کھل کر حوصلہ شکنی کی۔ پاکستان کے ۱۹۶۲ء کے آئین میں قانون سازی کے جملہ امور کی وضاحت کے بعد دنیا اور آخرت میں سرخرو ہونے کی خاطر ایک 'ایڈوائزری کونسل آف اسلامک آئیڈیالوجی' اور 'اسلامک ریسرچ سنٹر' بنانے کا فیصلہ کیا گیا، تاکہ ان کی بدولت یہ دیکھا جاسکے کہ جو قوانین بنائے جا رہے ہیں، وہ قرآن وسنت کے مطابق ہیں یا نہیں۔ یہ کونسل اور ریسرچ سنٹر اسلامی قوانین بنانے کے لیے تجاویز بھی پیش کر سکتے تھے۔ ۱۹۷۳ء کے آئین میں بھی اسی قسم کے بندوبست کو قائم رکھا گیا۔ یعنی یہ کہ: ایک اسلامی نظریاتی کونسل بھی قائم کی جائے گی جو قرآن و سنت کے حوالے سے اسلامی فلسفے اور اصولوں کے بارے میں مشورہ دیا کرے گی۔ یہ کونسل پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کو قرآن وسنت کے مطابق اجتماعی زندگی کی بہتری کے لیے سفارشات پیش کیا کرے گی۔ قوت نافذہ سے محروم ہونے کی وجہ سے اسلامی نظریاتی کونسل کی مساعی قانونی درجہ حاصل کرکے

معاشرتی تبدیلی کا باعث نہ بن سکیں۔ ایسی مجلس کو حکومت کے علاوہ عوام کی طرف سے بھی (عملی طور پر) اہمیت نہیں دی جاتی۔ یہ طرزِ عمل تو یہ ثابت کرتا ہے کہ ہم فی الحال اسلام کو ایک نظام سیاست وریاست کے طور پر اپنانے میں قطعاً سنجیدہ نہیں ہیں۔ اس کے عوض اقبال یہ اصول پیش کرتے ہیں کہ ایسی مجالس قانون ساز میں علماء کو بطور رکن شامل کر لیا جائے لیکن وہ بھی دیگر اراکین مجلس کی طرح آزادانہ بحث و تمحیص میں حصہ لیں اور اپنے علم کی روشنی میں رائے کا اظہار کریں۔ (۵۲) لیکن اقبال کا رجحان یہ معلوم ہوتا ہے کہ مجالس قانون ساز میں شامل علماء کو دیگر اراکین سے زیادہ اختیارات حاصل نہ ہونے چاہئیں کہ اس طرح بھی آزادانہ اجتہاد مجروح ہوگا۔ اور اس ضمن میں جس حتمی ضرورت کی طرف اقبال توجہ دلاتے ہیں وہ ہے کہ فقہ اسلامی کی جدید تعلیم کا اہتمام کیا جائے تاکہ علماء کو بھی قدامت کے ''حفاظتی حصار'' سے نکال کر دنیائے جدید کے جملہ تقاضوں سے روشناس کرایا جائے۔ اس خیال میں یہ روح کارفرما ہے کہ علماء کے گروہ کو معاشرے سے جدا ''نفوس قدسیہ'' خیال کرنے کی بجائے عوام میں سے اور عوام جیسے صاحبانِ علم و فضل شمار کیا جانے لگے۔ اقبال اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''......شریعت اسلامی کی غلط تعبیرات کا سدباب ہو سکتا ہے تو صرف اس طرح کی بحالت موجودہ بلاد اسلامیہ میں فقہ کی تعلیم جس نہج پر ہو رہی ہے اس کی اصلاح کی جائے۔ فقہ کا نصاب مزید توسیع کا محتاج ہے' لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ جدید فقہ کا مطالعہ بھی بااحتیاط اور سوچ سمجھ کر کیا جائے۔'' (۵۳) پاکستان کے خصوصی حوالے سے اقبال کی اس تجویز سے اس طرح استفادہ کیا جا سکتا ہے کہ:

۱۔ تمام تر قدیم دینیاتی مدرسوں کے نصابات کا از سرِ نو جائزہ لے کر انہیں جدید نظام تعلیم سے ہم آہنگ کیا جائے۔

۲۔ ان کی عام نظام تعلیم سے علیحدہ حیثیت کو ختم کر کے یکساں نظام تعلیم کا جزو بنایا جائے۔

۳۔ جس طرح عام نظام تعلیم میں ہر شعبہ علم میں تخصیص حاصل کرنے کے مواقع موجود ہیں' اسی طرح علوم فقہ و تفسیر' علیٰ ہذا علم حدیث کو جدید طریقہ تدریس و تحصیل کے مطابق مرتب کر کے درسیات میں شامل کیا جائے۔ تاکہ فقہ کی تحصیل و تدریس کا عمل قدیم طرز کے پراسرار مدرسوں کے نیم تاریک احاطوں سے نکل کر

عام درسگاہوں اور دانشگاہوں میں رائج ہو سکے۔ اور یوں نظام تعلیم میں دوئی کا غیر اسلامی رویہ ختم ہو۔

۴۔ لیکن یہ اہم تر کام کرنے سے پہلے اس شدید ردعمل کا صحیح اندازہ قائم کرنا ہوگا جو ان قدیم مدرسوں کے وارث علماء کی طرف سے سامنے آسکتا ہے کیا وہ اپنے تئیں اس عمل کو ''دین کی بنیادوں پر کافروں کی یلغار'' تو قرار نہیں دیں گے؟ بہر حال اگر ہم نے آنے والے زمانوں میں اپنے ملی وجود کو باعزت طور پر باقی رکھنا ہے تو ایسے انقلاب سے دوچار ہونا ہی پڑے گا۔

جہاں تک معاشرتی مسائل بالخصوص خواتین کے حقوق کا تعلق ہے' پاکستان میں فی الحال ایسے حالات تو پیدا نہیں ہوئے کہ مغرب کے معیار کو سامنے رکھ کر ہمیں بھی وہی طرز عمل اختیار کرنا پڑے' جو ترکوں کو اختیار کرنا پڑا تھا اور جس کی وکالت اور وضاحت کے لیے ضیاء گوک آلپ نے اپنے تمام تر استدلال کو خرچ کر دیا تھا لیکن موجودہ تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بھی ہمیں اقبال کی ان تجاویز کی طرف توجہ دینا ہوگی جن کا ابلاغ انہوں نے اپنے ۱۹۱۰ء والے خطبے ''مسلم کمیونٹی'' میں کیا تھا اور جس کے مطابق انہوں نے کہا تھا کہ مسلمان خاتون کو اسلام کی طرف سے عطا کیا گیا معاشرتی مقام ہی برقرار رہنا چاہیے اور اس کی تعلیم کی نوعیت کا تعین اسے عطا کئے گئے مقام کے حوالے سے کیا جانا چاہیے۔'' (۵۴) عورتوں کی تعلیم کی نوعیت' کہ جس کی طرف اقبال نے مذکورہ خطبے میں اشارے کئے ہیں یعنی یہ کہ: ۱۔ انہیں لازمی طور پر مکمل مذہبی تعلیم دی جائے۔ ۲۔ پھر اس مذہبی تعلیم کو (الف) تاریخ اسلام (ب) گھریلو معاشیات (ج) حفظان صحت کے علوم کی تدریس کے ساتھ مکمل کیا جائے کہ بقول اقبال یہ تعلیم ایک خاتون کو اس قابل کر دے گی کہ وہ اپنے پڑھے لکھے شوہر کو عقلی اعتبار سے ہم پلہ اور ذہانت آمیز رفاقت مہیا کر سکے اور اس کے علاوہ ماں ہونے کی حیثیت سے اپنے فرائض کو بطریق احسن پورا کر سکے۔ (۵۵) عورتوں کی تعلیم وتربیت اور درسیات کے بارے میں اقبال کے ان تصورات اور مولانا اشرف علی تھانوی کی معروف تالیف ''بہشتی زیور'' کے مقاصد حیرت انگیز طور پر مماثل نظر آتے ہیں۔ قیاس چاہتا ہے کہ دور جدید کے تقاضوں کے پیش نظر معاشرتی ترقی میں عورتوں کے کردار کی ضرورت واہمیت کے پیش نظر ہمیں اس ضمن میں اقبال کے تصورات سے کچھ آگے بڑھ کر بعض معاملات پر اجتہاد کرنا ہوگا۔ جہاں تک خواتین کے حقوق سے

متعلق ان سوالات کا تعلق ہے جو ضیاء گوک آلپ نے اپنی نظم "کنبہ" میں اٹھائے ہیں اور جن کے مطابق وہ مساوات مرد وزن یعنی طلاق، خلع اور وراثت میں مساوات کا مطالبہ کرتے ہیں، اقبال کا موقف یہ ہے کہ "......شریعت اسلامی میں نکاح کی حیثیت ایک عقد اجتماعی کی ہے اور بیوی کو یہ حق حاصل ہے کہ بوقت نکاح شوہر کا حق طلاق بعض شرائط کے ساتھ خود اپنے ہاتھ میں لے لے۔ یوں امر طلاق تو مرد وزن کے درمیان مساوات قائم ہو جاتی ہے۔ رہی وہ اصلاح جو شاعر نے (ضیاء کے حوالے سے بات ہو رہی ہے) قانون وراثت میں تجویز کی ہے سو اس کی بنا غلط فہمی پر ہے۔ اگر قانوناً اس کے حصوں میں مساوات قائم نہیں کی گئی تو اس۔ سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت حاصل ہے۔ اس لیے کہ یہ خیال تعلیمات قرآنی کے منافی ہے۔ لہٰذا لڑکی کا حصہ متعین ہوا تو کسی کمتری کی بنا پر نہیں، بلکہ ان فوائد کے پیش نظر جو معاشی اعتبار سے اسے حاصل ہیں۔" (۵۶) اقبال آگے چل کر مزید وضاحت کرتے ہیں کہ "شریعت اسلامیہ کی رو سے لڑکی اس سارے جہیز کی خود مالک ہے، جو اسے والدین سے ملتا ہے اور مہر کی بھی جسے اس کی مرضی کے مطابق موجل بھی ٹھہرایا جا سکتا ہے اور غیر موجل بھی اور جس کی ادائیگی تک وہ خاوند کی ساری جائیداد مکفول رکھ سکتی ہے۔ اس کے کفاف کی ذمہ داری بھی تا حین حیات خاوند پر ہی رہتی ہے اب اگر اس نقطہ نظر سے قانون وراثت کا جائزہ لیجیے تو صاف ظاہر ہو جائے گا کہ اسلام نے لڑکوں اور لڑکیوں کی معاشی حیثیت میں کوئی فرق نہیں کیا۔" (۵۷) یہاں پیش کردہ نکات کی روشنی میں بھی اقبال کا موقف وہی ہے، جس کا بیان ۱۹۱۰ء والے خطبے کے ضمن میں ہوا کہ خواتین کو اسلام کی طرف سے عطا کیا گیا مقام برقرار رہنا چاہیے۔ ہاں اس اہتمام کی ضرورت ہے کہ خواتین کے لیے اسلام کے عطا کردہ حسین اور متوازن حقوق سلب کرنے کے رجحان کو ختم کیا جائے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ عورت کی آزادی یہ نہیں کہ اسے حقوق و فرائض میں مردوں کے مساوی قرار دیا جائے۔ یہ عورت کے مقام رفیع سے حسد کرنے اور اس کے جملہ حقوق سے جان چھڑانے والے مغربی دماغوں کی چالبازی کے سوا کچھ نہیں۔ عورت کی آزادی یہ ہے کہ اسے حقوق میں ترجیح اور فرائض میں نرمی اور سہولت دی جائے۔ اندریں حالات، پاکستانیوں کو مغربی تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے نظام معاشرت میں خواتین کے ارفع مقام کی حفاظت کا اہتمام

ضرور کرنا چاہیے تا کہ ان کے قانونی حقوق رسم و رواج اور فرسودہ ضرب الامثال کی پیدا کردہ کسی رکاوٹ کے بغیر انہیں ملتے رہیں۔ بصورت دیگر اس ضمن میں کوئی انتہا پسندانہ سوچ سامنے آ سکتی ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلامی جمہوری ریاست میں مذہب کے نام پر عورتوں کی تعلیم پر قدغن لگانے کی سعی کرنا اور عورتوں کو ایک غیر حکیمانہ پردے میں مستور اور مقید رکھنا ایسے امور ہیں کہ جن پر اجتہاد کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ہمارے علمائے کرام علم اور حلم کو ترک کر کے ظلم کی راہ پر چل نکلے ہیں ان کو یقین ہونا چاہیے کہ کوئی معاشرہ ظلم کی بنیاد پر قائم نہیں رہ سکتا۔

حواشی/حوالے

(۱) محمد اقبال، جغرافیائی حدود اور مسلمان، مشمولہ حرف اقبال مرتبہ لطیف احمد خان شیروانی (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ۱۹۸۴ء) صفحہ ۲۲۲، ۲۲۳

(۲) محمد اقبال، جغرافیائی حدود اور مسلمان، صفحہ ۲۲۳

(۳) محمد اقبال، دیباچہ، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ مترجم نذیر نیازی (لاہور: بزم اقبال، طبع دوم ۱۹۸۳ء) صفحہ ۳۹

(۴) محمد اقبال، خط بنام صاحبزادہ آفتاب احمد خان محررہ ۴ جون ۱۹۲۵ء مشمولہ اقبال نامہ، مجموعہ مکاتیب اقبال، مرتبہ شیخ عطاء اللہ (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، طبع نو، یک جلدی، ۲۰۰۵ء) صفحہ ۵۲۴

(۵) محمد اقبال مضمون قومی زندگی، مشمولہ مقالات اقبال مرتبہ سید عبدالواحد (لاہور: آئینہ ادب، بار دوم ۱۹۸۸ء) صفحہ ۸۷

(۶) محمد اقبال، قومی زندگی صفحہ ۹۰، ۹۱

(۷) محمد اقبال، قومی زندگی صفحہ ۹۱

(۸) محمد اقبال، قومی زندگی صفحہ ۹۱، ۹۲

(۹) محمد اقبال، قومی زندگی، صفحہ ۸۸

(۱۰) محمد اقبال، خطبہ علی گڑھ ۱۹۱۰ء ملت اسلامیہ، ایک عمرانی مطالعہ، اردو مترجم شاہد اقبال کامران (فیصل آباد، جاوید پبلشرز ۱۹۸۹ء) صفحہ ۴۲

(۱۱) محمد اقبال، خط بنام صوفی غلام مصطفیٰ تبسم محررہ ۲ ستمبر ۱۹۲۵ء مشمولہ اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ صفحہ ۹۶

(۱۲) محمد اقبال، خط بنام اکبر شاہ نجیب آبادی محررہ ۱۲۰ اپریل ۱۹۲۵ء مشمولہ کلیات مکاتیب اقبال، جلد دوم، مرتبہ سید مظفر حسین برنی (دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۹۱ء) صفحہ ۵۸۴

(۱۳) محمد اقبال، خط بنام صاحبزادہ آفتاب احمد خان، اقبالنامہ یکجا، صفحہ ۵۲۸

(۱۴) محمد اقبال، خطبہ الاجتہاد فی الاسلام، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، اردو مترجم سید نذیر عباسی (لاہور: بزم اقبال، طبع دوم ۱۹۸۳ء) صفحہ ۲۲۸

(۱۵) محمد اقبال، تشکیل جدید، صفحہ ۲۲۸

(۱۶) محمد اقبال، تشکیل جدید صفحہ ۲۲۸

(۱۷) خالد مسعود ڈاکٹر اقبال کا تصور اجتہاد (راولپنڈی، مطبوعات حرمت، طبع اول ۱۹۸۵ء) صفحہ ۱۳۵

(۱۸) محمد اقبال، تشکیل جدید، صفحہ ۲۵۵، ۲۵۶

(۱۹) محمد اقبال، تشکیل جدید صفحہ ۲۲۹

(۲۰) محمد اقبال، تشکیل جدید صفحہ ۲۲۹

(۲۱) محمد اقبال، تشکیل جدید صفحہ ۲۳۰

(۲۲) محمد اقبال، تشکیل جدید صفحہ ۲۳۱

(۲۳) محمد اقبال، تشکیل جدید صفحہ ۲۳۲

(۲۴) محمد اقبال، تشکیل جدید صفحہ ۲۳۲

(۲۵) محمد اقبال، تشکیل جدید صفحہ ۲۲۹، ۲۳۳

(۲۶) محمد اقبال، تشکیل جدید صفحہ ۲۳۳

(۲۷) محمد اقبال، تشکیل جدید صفحہ ۲۳۷

(۲۸) محمد اقبال، تشکیل جدید صفحہ ۲۵۵

(۲۹) محمد اقبال، تشکیل جدید صفحہ ۲۵۵

(۳۰) محمد اقبال، تشکیل جدید صفحہ ۲۵۵

(۳۱) محمد اقبال، تشکیل جدید صفحہ ۲۶۵، ۲۶۶

(۳۲) محمد اقبال، تشکیل جدید صفحہ ۲۶۷

(۳۳) محمد اقبال، تشکیل جدید صفحہ ۲۶۷، ۲۶۸

(۳۴) محمد اقبال، تشکیل جدید صفحہ ۲۶۸

(۳۵) محمد اقبال، تشکیل جدید صفحہ ۲۷۲

(۳۶) محمد اقبال، تشکیل جدید صفحہ ۲۷۲، ۲۷۳

(۳۷) محمد اقبال، تشکیل جدید صفحہ ۲۳۵

(۳۸) محمد اقبال، تشکیل جدید صفحہ ۲۴۰، ۲۴۱

(۳۹) اقبال اسے اسلام کے منتہائے نظر بین الاقوامی نصب العین سے ہم آہنگ خیال کرتے ہیں۔

(۴۰) جس میں جدید علم عمرانیات کی اثر اندازی صاف دکھائی دیتی ہے۔ لیکن یہ بہر حال کوئی معیوب بات نہیں ہے۔

(۴۱) اقبال نے ضیاء گوک آلپ پاشا کے اس مطالبے کو قابل اعتراض قرار دیا ہے۔

(۴۲) محمد اقبال، تشکیل جدید صفحہ ۲۵۰

(۴۳) سیکولر کو غیر مذہبی کہنے کی بجائے ''عصری'' یعنی زمانہ حال کے تقاضوں کے مطابق کہنا زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

(۴۴) محمد اقبال، تشکیل جدید صفحہ ۲۳۸

(۴۵) محمد اقبال، خطبہ الٰہ آباد، مشمولہ حرف اقبال، مرتبہ لطیف احمد خان شیروانی صفحہ ۳۱، ۳۲

(۴۶) محمد اقبال، تشکیل جدید صفحہ ۲۳۸، ۲۳۹

(۴۷) محمد اقبال، خط بنام صوفی غلام مصطفی تبسم، اقبالنامہ صفحہ ۹۸

(۴۸) محمد اقبال، تشکیل جدید، صفحہ ۲۴۳

(۴۹) محمد اقبال، تشکیل جدید، صفحہ ۲۴۵

(۵۰) محمد اقبال، تشکیل جدید، صفحہ ۲۷۰

(۵۱) محمد اقبال، تشکیل جدید، صفحہ ۲۷۰

(۵۲) محمد اقبال، تشکیل جدید، صفحہ ۲۷۱

(۵۳) محمد اقبال، تشکیل جدید، صفحہ ۲۷۱

(۵۴) محمد اقبال، ملت اسلامیہ ایک عمرانی مطالعہ، صفحہ ۴۵

(۵۵) محمد اقبال، ملت اسلامیہ ایک عمرانی مطالعہ، صفحہ ۴۵

(۵۶) محمد اقبال، تشکیل جدید، صفحہ ۲۶۱

(۵۷) محمد اقبال، تشکیل جدید، صفحہ ۲۶۳

ڈاکٹر مظہر حامد

اقبال کے بعد شاعری میں ہیئت اور اسالیب کے نئے سانچے

اظہار کا وہ سانچہ جسے چند اجزائے ترکیبی کے ساتھ مخصوص کر دیا جائے اسے ہیئت کہتے ہیں۔ ہیئت کے طور پر اپنی شناخت رکھنے والے اصناف ادب یہ ہیں۔ قصیدہ، غزل، واسوخت، رباعی، قطعہ، مرثیہ، مستزاد، مربع، مخمس، مسدس، مثنوی، ترجیع بند، ترکیب بند، نظم معریٰ، آزاد نظم، مسبع، مثمن، متسع، معشر، سانیٹ وغیرہ شامل ہیں۔ اردو شاعری نے جو نیا طرز اختیار کیا اس نئے رجحان میں مغربی اثرات کی چھاپ نمایاں رہی۔ اُس وقت مغرب میں امیجسٹ تحریک، سوشلزم تحریک سرگرم عمل تھیں۔ پہلی جنگِ عظیم ۱۹۱۴ء کے بعد مغربی ممالک کے شعراء کے ہاں خوف، تنہائی، موت اور حسرت و ناکامی کی جو فضا قائم ہو چکی تھی اس کی مثال ٹی ایس ایلیٹ کی ویسٹ لینڈ ہے۔ ہیوم ازرا پاؤنڈ اور ہلدہ دولٹل کی نظمیں اس دور کی عکاس ہیں۔ لیکن صحیح معنی میں دوسری جنگِ عظیم ۱۹۳۹ء کے بعد مغربی افکار و خیالات کے جدید رجحان میں تیزی آ گئی۔

مغرب میں ہیئت اور اسالیب کے تجربوں کے ساتھ الفاظ کی قدر و قیمت کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا جا رہا تھا۔ اوزان اور بحور کے استعمال میں بھی جدید پیرائے کو ملحوظ رکھا گیا۔ ہیئت کے اعتبار سے آزاد شاعری اور معریٰ نظم کو اختیار کیا گیا۔ امیجسٹ تحریک زیادہ عرصہ تک نہ چل سکی لیکن اسی تحریک کے وجود سے ایک نئی تحریک نے جنم لیا، جو اسٹول گروپ کہلایا۔ یہ تحریک تین افراد پر مشتمل تھی۔ جن میں دو بھائی اور ایک بہن، یہی اس کے بانی تھے۔ ان تحریکوں کے بعد سریلزم تحریک وجود میں آئی۔ جبکہ اسٹول گروپ کے عروج کا زمانہ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۱ء تک کا دور ہے۔

سریلزم تحریک کے سربرآوردہ ڈیلن ٹامس، جارج بارکر اور ڈیوڈ گیس کوائن نہایت اہم حیثیت رکھتے تھے۔ اس تحریک کی مخالفت اور مذمت کرتے ہوئے امریکی ادیب ہنری ملر نے کہا کہ اس تحریک میں وہ لوگ شامل ہیں جو ذہنی اور روحانی طور سے قلاش ہو چکے ہیں۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ بتائی کہ سریلسٹ، بے اعتباری، تفرقہ پردازی اور تنہا پسندی ان کا مقصدی محور ہے۔ شاعری میں اس نئے رجحان

کے تحت بحور کی آزادی اور ہیئت کے تجربوں سے نئے ذہنوں میں ایک انقلابی لہر دوڑ گئی۔ شعراء نے اس نئے آہنگ کو اپنانے کی کوشش کی۔ اس ضمن میں ترقی پسندوں نے نمایاں کردار ادا کیا۔ جس سے اردو شاعری میں ایک تنوع اور وسعت آ گئی۔

اقبال کی شاعری میں ہیئت کے تجربوں کو تلاش کریں تو ان کے ہاں ہیئت کا ایسا کوئی تجربہ نہیں ملتا جسے ہم ان کی ذات سے مخصوص کر سکیں۔ تاہم انہوں نے ہیئت کے ضمن میں انقلابی نوعیت کا اقدام یہ کیا اردو شاعری کی دو فرسودہ یا تقریباً متروک ہیئتوں یعنی ترکیب بند اور ترجیع بند کو اپنے فکری اظہار کے لیے اس طرح نہ صرف منتخب کیا بلکہ انہیں اس انداز سے برتا کہ ان میں ایک نئی روشنی اور ایک نئی توانائی پیدا ہو گئی۔ علاوہ ازیں اقبال نے ہیئت کے حوالے سے ایک اور نمایاں کام یہ کیا کہ اپنے عہد کی سب سے مقبول اور پامال صنف یعنی غزل کو صرف عشقیہ مضامین تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ ایک تنگ دائرے کو توسیع دے کر فکر و خیال کے لامحدود بحرِ ناپیدا کنار کی عظمت عطا کر دی۔

اقبال کے شعری اسلوب کی خصوصیت میں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ جو زور خطابت اور بیداری کا عمل ان کی شاعری میں ہمیں ملتا ہے، وہ ان کے معاصر شعراء میں نہیں، البتہ حالی کے اسلوب میں وعظ اور اصلاح کی بازگشت نظر آتی ہے۔ اقبال کی شاعری میں تخاطب اسلوب کی نشاندہی کرتا ہے۔ نظموں میں ''حرف ندا'' یعنی خطاب کا وہ منفرد انداز ہے جو ہمیں اقبال سے پہلے نہیں ملتا۔ دوسری خاص بات جو نظموں میں پائی جاتی ہے وہ پیام رسانی ہے۔ پیام رسانی میں تین نام لیے جا سکتے ہیں۔ حالی، اکبر اور اقبال لیکن ان تینوں کے اسلوب میں خاصہ فرق ہے۔ حالی ایک ناصح کی حیثیت سے اپنے اسلوب میں متشکل ہوئے اکبر کے اسلوب کو طنز و ظرافت کے آئینے میں دیکھا جا سکتا ہے جبکہ اقبال ایک حکیم کی حیثیت سے مشخص ہوئے۔

اقبال نے اپنے حکیمانہ انداز اور فلسفہ سے غور و فکر کا جو نظام مرتب کیا وہی ان کا اسلوبیاتی طرز کہلایا۔

اردو شاعری کی روایات میں حالی کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ بدلتے ہوئے حالات کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے قدیم سانچوں میں نئے موضوعات اور نئے مسائل کو نظموں میں پیش کیا۔ حقیقت نگاری اور فطرت پرستی، جمالیاتی تصور کی آئینہ دار ہے۔ حالی کی نظموں کے موضوعات میں

مذہب، اخلاقیات کے علاوہ سماجی، معاشرتی اور سیاسی موضوعات شامل ہیں۔ اس کے برعکس اقبال کی نظموں کے موضوعات میں ہمہ گیری اور وسعت پائی جاتی ہے۔ اقبال کی شاعری کا رجحان دیگر شعراء سے مختلف ہے۔ ان کی فکر کسی ایک خاص موضوع کے لئے مخصوص نہیں۔ بلکہ ہمہ جہتی اور منجملہ کیفیات کو موضوع بنا کر پیش کرنے کا ایک خاص ہنر جو انسانی اور سماجی لحاظ سے مربوط ہے، اسے وہ موضوعاتی زنجیر بنا دیتے ہیں اور اس زنجیر کی ہر کڑی موضوعاتی تاثر رکھتی ہے۔ مثلاً اقبال کی ابتدائی شاعری میں وطنیت کا اظہار ملتا ہے۔ اس کے علاوہ مفکر کی حیثیت سے پیام رسانی کا عمل بھی خاصا تیز ہے۔ انہوں نے انسانی اقدار پر بہترین نظمیں لکھی ہیں۔ ہندوستان کے بنیادی مسائل کو شاعری کا موضوع بنا دیا۔ مزید برآں اقبال کے موضوعات میں سب سے توانا موضوع خودی کا تصور ہے لیکن اقبال کہیں کسی جگہ رک کر نہیں بیٹھ گئے۔ بلکہ نئے نئے موضوعات کی تلاش میں سرگرداں رہے، طنز و مزاح کے موضوع پر بھی اقبال نے ''بانگ درا'' کے آخری حصے میں اپنا ظریفانہ کلام شامل کیا ہے۔ جس سے ان کی بذلہ سنجی کا پتا چلتا ہے۔
غرض اقبال کے ہاں حب وطن، قومی شعور اور مذہبی رجحان فکر و فلسفہ کی روشنی میں نئے موضوعات متعین ہوئے ہیں۔ بچوں کو اہمیت دیتے ہوئے اقبال نے بانگ درا کے پہلے حصہ میں ایسی نظمیں لکھی ہیں جو موثر بھی ہیں اور دلچسپی کا سامان بھی لیے ہوئے ہیں۔ اقبال کے تمام موضوعات میں انسانیت اور انسان دوستی کا جو شعور اور میلان کارفرما ہے، وہ تمام افکار و خیالات کا آئینہ دار ہے۔ تخاطب اقبال کی شناخت ہے اور یہی ان کا اسلوب ہے۔ بیشتر نظمیں تخاطب کو ظاہر کرتی ہیں مثلاً اے ہمالہ، اے گل پژمردہ، اے محیط آب گنگا، اے چاند، اے برہمن، اے درد عشق، اے قطرۂ بے تاب، اے گل رنگین، اے شمع، اے بزم جہاں، اے طفلک پروانہ خو، اے بلبل، اے دل، اے نوجوان۔ ع ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبال تُو

اس روشنی میں اقبال کے اسلوب کو سمجھنا سہل ہو جاتا ہے نظموں میں تخاطب، پیغام اور حکیمانہ انداز کی بازگشت جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ یہ وہ کیفیتیں ہیں جنہیں رمزیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ رمزیت تخیل کی وہ معراج ہے جہاں تخیل کی گلکاریاں نظر آتی ہیں۔ شعری اسلوب میں فکر انگیزی، مترنم بحریں، خوش ہنگی اور پُر اثر کیفیتیں پائی جاتی ہیں۔ یہی اقبال کے اسلوب کی خصوصیات ہیں۔ یہ طرز خاص انہی سے

مخصوص ہے، اس میں انفرادیت کے ساتھ ہمہ رنگی پائی جاتی ہے اور وہ اپنی شاعری میں جان دار یا بے جان چیزوں کو مخاطب کر کے اپنے افکار و خیالات کی ترسیل کرتے ہیں۔ اسے حرف ندا بھی کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی نظموں میں پیغام کو بھی مرکزی حیثیت حاصل ہے مثلاً جاوید کے نام، ایک نوجوان کے نام، خطاب بہ نوجوان اسلام، پنجاب کے دہقان سے، طلباء علی گڑھ کے نام، امرائے عرب سے' عبدالقادر کے نام شامل ہیں۔

اقبال بنیادی طور پر ایک فلسفی تھے۔ ان کے افکار و خیالات اسلامی نظریات کے حامل تھے۔ یوں تو اقبال نے بیشتر فلسفیوں سے استفادہ کیا جن میں نیٹشے، برگسان، کانٹ، ہیگل، مارکس وغیرہ شامل ہیں۔ مسلم فلسفیوں میں ابن سینا، محی الدین ابنِ عربی اور جمال الدین افغانی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اقبال کے فلسفے میں سب سے اہم بات جو نمایاں طور پر محسوس کی گئی وہ انسانی اقدار اور انسانی تقاضوں کا پاس اسلامی اصولوں میں تلاش کرتے ہیں۔ اقبال اپنے طرزِ فکر میں اسلامی نظام فکر کو سمو کر جدید پیرائے میں ادا کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ اقبال کے فلسفے اور طرزِ فکر کو سمجھنے کے لیے اسلامی الٰہیات یا اسلامی فکر کی تشکیل نو کا بالاستیعاب مطالعہ کرنا پڑے گا۔ اقبال کی نظم ''شمع اور شاعر'' ہی کو لے لیجے اس میں انہوں نے شمع کو معنوی اعتبار سے نئے تناظر میں پیش کیا ہے جبکہ اقبال سے پہلے شمع صرف محبوب کی علامت کے لیے وقف تھی۔ ان کی شاعری میں جو انقلابی فکر کارفرما ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیغام میں جہد مسلسل، سعی و عمل، تسخیر کائنات، قوموں کی تعمیر و ترقی اور شب و روز محنت پیہم کو اپنا نصب العین قرار دیتے ہیں۔ اقبال کا سب سے اہم کام یہ ہے کہ انہوں نے الفاظ کو تراکیب اور تشبیہات کے ذریعہ نئے معنی عطا کیے اور یہی عمل ان کا فکری اجتہاد ہے۔ جو بعد کے شعراء کے لیے مشعل راہ بنا۔ زندگی کے بارے میں نظریۂ زندگی کو کس خوبی سے نبھایا ہے اسی طرح انسان کامل، یا پھر اقبال کا مرد مومن۔ حضورِ اکرمؐ کے خصائل و شمائل کا وہ جیتا جاگتا ثبوت ہے، جسے نگاہ مرد مومن ہی پہچان سکتی ہے، رومیؒ کے افکار میں وہ تمام موضوعات مثنوی میں ملتے ہیں جو ہمیں اقبال کے ہاں مختلف اصناف میں نظر آتے ہیں۔ اقبال اگر تصور معیشت کی بات کرتے ہیں تو دوسری طرف تصور مملکت کا باقاعدہ ایک نظام بھی دیتے ہیں۔ اقبال نے اسلامی نظام فکر کو لالہ، صحرا

کے استعارے سے ظاہر کیا ہے لالہ اور اسلام میں جو مماثلت اقبال نے تراکیب کے ذریعہ پیش کی ہے وہ علامتی انداز ہے۔اس علامت کے ذریعہ گل ولالہ انسان کی علامت کے طور پر ظاہر ہونے لگا۔اقبال کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے۔

جمیل تر ہیں گل ولالہ فیض سے اس کے　　　　نگاہ شاعر رنگین نوا میں ہے جادو

اقبال نے اظہار فن کے لیے زیادہ تر ترکیب بند، ترجیع بند، مخمس اور مسدس کی ہیئت اختیار کی ہے ان کے بعد ہیئت کے تجربوں میں مخدوم محی الدین عظمت اللہ خان، ن۔م۔راشد، میراں جی، اختر الایمان، علی سردار جعفری کیفی اعظمی، قیوم نظر، یوسف ظفر، مختار صدیقی، مجید امجد، خلیل الرحمٰن اعظمی، عمیق حنفی، عادل منصوری، جعفر طاہر، شہزاد احمد اس فہرست میں اور بھی نام لیے جاسکتے ہیں۔ان شعراء کی نظموں میں زیادہ تر جو موضوع ابھر کر آیا ہے وہ مراجعت اور خواہش کا ہے۔

آزادی سے پہلے اقبال، جوش، ساغر نظامی، حفیظ جالندھری، تلوک چند محروم، چکبست، عظمت اللہ خان، مخدوم محی الدین کے نغمے فضا میں گونج رہے تھے۔لیکن آزادی کے بعد شاعری میں متواتر کئی انقلاب آئے اس کی پہلی مثال ترقی پسند تحریک پھر حلقہ ارباب ذوق تحریک کے ذریعہ سریلسٹ نظریات کی ترسیل ہونے لگی۔اظہار کے سانچوں میں بھی تبدیلیاں لائی گئیں۔یعنی نئے اسالیب، نئے موضوعات اور نئی علامتوں میں کثرت سے اظہار ہونے لگا۔ان شعراء میں فیض، ندیم، اختر شیرانی، راشد، میراجی، اختر الایمان، علی سردار جعفری نے نظم کے دامن کو وسیع تر کردیا۔خاص طور پر میراجی قنوطی اور سریلسٹ شاعری کررہے تھے جبکہ اندر جیت شرما، یوسف ظفر، مختار صدیقی، ن۔م۔راشد امیجسٹ اور علامتی شاعری میں پیش پیش تھے۔

میراجی اور ن۔م۔راشد میں جو دوری نظر آتی ہے اس کی پہلی وجہ راشد کی نظموں میں قافیہ، ردیف اور ارکان کی پابندیوں سے جو بغاوت برتی گئی، اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہ ہیئت کے تجربوں میں مصروف تھے۔وہ ابہام اور رمزیت میں اپنے فن کا اظہار کررہے تھے۔ان کی مقبول نظموں میں اجنبی عورت، بے کراں رات کے سناٹے میں، دریچے سے قریب انتقام ادبی حلقوں میں ایک نیا تاثر قائم ہوا اور اپنا مقام بنانے میں خاصے کامیاب ہوئے۔

میراجی کے متعلق مشہور ہے کہ ان کی ذات متنازعہ فیہ کی حیثیت سے رہی۔ان کی شاعری کے عروج کا زمانہ ۱۹۴۰ء سے شروع ہوتا ہے۔میراجی اپنی ذات میں ایک روایت ساز شاعر کہلائے کیونکہ شعری تخلیق نئی روایت کی آئینہ دار ہے۔ترقی پسندوں کے ہاں تجربے کا رخ داخلیت کی طرف تھا لیکن جلد ہی انہوں نے خارج کی طرف توجہ دینا شروع کی۔اس کے برعکس میراجی نے اپنے تخلیقی سفر کو داخلیت سے مربوط رکھا۔انہوں نے داخلی شاعری کو بنیاد بنا کر ایک نئی روایت کی داغ بیل ڈالی۔ترقی پسند تحریک اور میراجی کے نظریات میں مشرقین کا بُعد نظر آتا ہے۔

میراجی نے نئے شعری پیکر اور تصورات شاعری میں داخل کیے۔انہوں نے اس بات کا بھی احساس دلایا کہ وقت کے ساتھ الفاظ کے معنی بھی بدلتے رہتے ہیں۔اس لئے انہوں نے الفاظ کے نئے معنی تلاش کر کے شاعری کی وسعت میں گراں بہا اضافہ کیا ہے الفاظ کی قدر و قیمت اور اس کا بانکپن جو روایتی لفظوں کو نئے معنی دے۔اسے جدّت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔میراجی کے اس تخلیقی سفر کا گہرائی سے جائزہ لیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ انہوں نے زبان کو نئے انداز سے برتا ہے اور معنوی اعتبار سے بہت آگے تک لے گئے ہیں۔وہ ماضی سے بالکل کٹ نہیں گئے ہیں بلکہ ماضی کے سرمایہ کو اہمیت دیتے ہوئے موضوعات کے اضافے کی بات کرتے ہیں۔شعری تصورات میں وقتی حالات کو فراموش نہیں کرتے اسے ضروری سمجھتے ہوئے اعتدال سے کام لیتے ہیں۔

اردو نظم کے ارتقاء میں سب سے پہلے انجمن پنجاب کا نام آتا ہے۔مغربی افکار و خیالات اردو نظم میں منتقل ہونا شروع ہوئے۔انگریزی نظموں کے ترجمے اور ہیئت کے تجربے ہونے لگے۔نظم معریٰ اور آزاد نظم کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔مغرب میں سریلیٹ تحریک، سریلزم تحریک، اسٹول گروپ کا عام رجحان تھا۔ان تحریکوں کے اثرات بھی شاعری میں رونما ہوئے۔بیسویں صدی کے آغاز ہی میں نظموں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ہیئت اور اسلوب کے تجربوں کو اس وقت کے رسائل میں دیکھا جاسکتا ہے۔عبدالحلیم شرر نے ''دلگداز'' رسالہ کا اجراء کیا۔''مخزن'' کا اجراء شیخ عبدالقادر نے لاہور سے کیا۔اقبال کی نظمیں مخزن میں شائع ہوتی تھیں۔اقبال کے معاصرین بھی اپنی نگارشات مخزن ہی میں بھیجتے تھے۔اردو

شاعری میں نئی جہتیں اور نئے موضوعات اکبرالٰہ آبادی، اقبال اور چکبست کے ہاں نظر آتے ہیں۔ ان شعراء کے ہاں حب الوطنی کا جذبہ بھی ہے اور سیاسی تصور بھی۔ ہندوستان کی سیاسی کشمکش کے پیش نظر اقبال کی نظم ''تصویر درد'' کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ اقبال نے یورپ سے واپسی پر اپنے خیال اور رجحان کو تبدیل کیا۔ روحانی نظام کے فروغ میں اپنی فکر کو بروئے کار لائے۔

سیاسی اور سماجی موضوعات سے جوش ملیح آبادی کا گہرا تعلق رہا ہے۔ ان کی نظموں میں رومان، نیچر، سیاسیات، سماجیات اور مناظر قدرت کی مکمل تصویریں ملتی ہیں۔ ہندوستان کی سماجی اصلاح کا جو کام اقبال نے کیا ہے شاید ہی کسی نے کیا ہو ان کا سبک اور شستہ انداز ذہنوں پر اثر کر رہا تھا۔ ایک طرف سیاسی و سماجی رجحان کی نظمیں کہی جا رہی تھیں تو دوسری طرف رومانی اسلوب اور موضوعات پر جوش اور اختر شیرانی کی نظمیں یادگار اور بے مثال ہیں۔ جاں نثار اختر اور فیض نے رومانی نظموں میں بے پناہ اضافہ کیا۔ ان کے علاوہ مجاز، ساغر نظامی، ن۔ م۔ راشد اختر الایمان، احسان دانش اور حفیظ جالندھری نظم میں نئی جہتوں کا سراغ لگانے میں خاصے کامیاب رہے۔ ترقی پسندوں نے ادبی رجحانات کے علاوہ سیاسی تصور کو بھی نظموں میں اجاگر کیا۔ ترقی پسند تحریک سے پہلے اقبال اور ان کے معاصرین قومی و وطنی شاعری کر رہے تھے۔ اکبر اقبال، چکبست، ظفر علی خاں انسان کی بیداری کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ ادبی تاریخ کی روشنی میں یہ اندازہ تو ہو جاتا ہے کہ ترقی پسندوں نے نظم کو بین الاقوامی مسائل کے اظہار میں وسیع موضوعات دینے کے علاوہ ہیئت و اسلوب اور نئی جہتوں سے روشناس کر دیا۔ آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد کی شاعری میں جو فرق اور تفاوت ہمیں نظر آتا ہے وہ نظمیں اس بات کی عکاس ہیں۔ اقبال اور جوش نے نظموں میں بیداری کے عمل کو ملحوظ رکھا لیکن ترقی پسندوں نے نظم میں نئے تجربات کر کے فرد اور سماج کی بات کی۔ اس کے علاوہ نظموں میں نئے اسالیب نئے موضوعات، آزاد نظم میں وسعت دینا اور نئی علامتوں کو وضع کرنا روایت سے بغاوت کا اظہار ترقی پسند نظم کا بنیادی رجحان تھا۔ ترقی پسندوں نے نظم میں نئی جہتوں کی تلاش کے علاوہ بھی نظم کو نئے رجحانات سے آشنا کیا۔ سیاسی و ملکی حالات کے تحت انسان کی بے بسی اور مجبوری کو موضوع بنا کر نئی شعری علامتیں وضع کیں۔

نظم میں نئے آورش اور تبدیلی کا سہرا ترقی پسند شعراء کے سر بندھتا ہے ان میں علی سردار جعفری، اختر الایمان، کیفی اعظمی، مخدوم محی الدین، جوش و فیض نے نظم کو ہیئت و اسلوب سے قطع نظر نئی معنومیت سے جذبہ و فکر کو برانگیختہ کر دیا۔ نثری اسلوب اور علامت نگاری دراصل دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ علامت نگاری مغربی شعر وادب اور افکار کی ترسیل ہے۔ مغرب کی تقلید سے شاعری میں ایک نیا اسلوب جسے میراجی نے متعارف کرا دیا۔ حلقہ ارباب ذوق سے متعلق شعراء میں داخلیت کا رجحان پایا جاتا ہے اس میں میلارے اور بودلیئر کے اثرات زیادہ ہیں۔ علامت نگاری کے اسلوب کو فروغ دینے میں فرانسیسی شعراء کا بھی دخل ہے۔ مغربی اثرات کے زیر اثر نظموں میں ابہام کے الزام لگنا شروع ہو گئے تھے۔ میراجی اور ان کے رفقاء نے آزاد نظم پر خصوصی توجہ دی اور اسے ایک صنف کی حیثیت سے منوایا۔

حلقہ ارباب ذوق ادب میں کسی قسم کی پابندی کا قائل نہیں تھا۔ اظہار خیال کے لیے آزادی کا ہونا ضروری ہے۔ میراجی، ن، م، راشد، تصدق حسین خالد، قیوم نظر، یوسف ظفر اور مختار صدیقی نے نئی جہتوں کی دریافت میں نئے تجربے بھی کیے جس میں جذبہ، خیال اور احساس کو آزاد نظم اور معریٰ نظم میں پیش کیا۔ ایشیائی ممالک میں انسان کو یہ آزادی حاصل نہیں جو اسے یورپ میں حاصل ہے۔ مختلف موضوعات کو نئے سانچے میں ڈھالنا ایک آزاد ذہن کا کام ہے جو نفسیات اور جنسیات پر آزادانہ اور واضح طور پر اظہار خیال کر سکے۔

۱۹۴۱ء سے پہلے کی شاعری میں ایک خاص نقطہ نگاہ کو اجاگر کیا گیا، پھر بعد کو شاعری میں نظریات کا فرق آنا شروع ہوا۔ جن شعراء نے اس فرق کو تقویت دی ان کی فہرست خاصی طویل ہے چند شاعروں کے نام جو اس کاروان میں شریک سفر رہے، مختار صدیقی، سید فیضی، سلام مچھلی شہری، صفدر میر، منیب الرحمٰن، انجم رومانی، ظہور نظر، شہزاد احمد، قیوم نظر، منیر نیازی، عارف عبدالمتین اور شاذ تمکنت ان شعراء کے ہاں خوف، ہراس، موت اور تنہائی اور خوف اس کے تعاقب میں ہے۔ جس سے فرار ممکن نہیں۔ ۱۹۴۷ء کا سیاسی انقلاب اس بات کا آئینہ دار ہے۔ ملک کی تقسیم پر جن شعراء نے حالات کی بھرپور عکاسی کی ہے ان میں اختر الایمان کی نظم ''پندرہ اگست'' مختار صدیقی کی نظم ''باز یافتہ'' اور بلراج کومل کی نظم ''اکیلی'' میں حالات و واقعات کی صحیح ترجمانی ہوئی ہے۔ حلقہ ارباب ذوق نے اپنے جلسوں میں

تنقیدی نقطۂ نگاہ سے نئے ادیبوں کو ذہنی طور سے تیار کر کے انہیں شہرت اور ساکھ بنانے میں حتی المقدور معاونت کی ہے۔ میراجی اور ان کے ساتھیوں نے جو تجربے کیے۔ اس میں سب سے پہلا تجربہ تکنیک کا تھا۔ الفاظ کی قدروقیمت اور اوزان و بحور کا نئے ڈھنگ سے استعمال اس کے علاوہ کلاسیکی اور رومانوی طرز سے گریز برتا گیا۔ ان کے اس عمل سے کلاسیکیت اور رومانیت کی شاعری میں شگاف پڑ گیا۔ اس کے علاوہ دیگر مباحث بھی تھے جن میں جذبہ اور خیال کی اہمیت پر زور دیا گیا۔ اظہار یا ابلاغ، ادب اور جمالیات، ادب اور صحافت سب سے اہم بات شاعری میں ابہام کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا۔ ادب اور پروپیگنڈہ ہی کے تحت جدید شاعری کے موضوعات پر جو مباحث ہوئے ان سے یہ فائدہ ہوا کہ نگارشات و تخلیقات میں نئے زاویے، نئی جہتیں اور شعور کے نئے دروازے وا ہونے شروع ہو گئے۔ حلقہ ارباب ذوق میں شعراء کو جو پذیرائی ملی وہ رپورٹس اپنی جگہ ایک حیثیت رکھتی ہیں۔ حلقہ ارباب ذوق کی جانب سے نظموں کا پہلا انتخاب ۱۹۴۱ء کی بہترین نظموں کی صورت میں متعارف ہوا۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جدید ادب اور نظم نگاری کی پہلی آواز ''ادبی دنیا'' ہی سے اٹھی۔ اس رسالہ سے اردو شاعری اور اردو ادب کے نہایت اہم ستون متعارف ہوئے۔ حلقہ ارباب ذوق کے شعراء فرانسیسی ادب سے متاثر ہو کر منظوم تراجم میں اضافہ کر رہے تھے جو آزادی خیال کا نمونہ ہیں۔ اس کی مثالیں راشد کی ''ماورا'' مختار صدیقی کی ''منزل شب'' قیوم نظر کی ''قندیل'' یہی وہ مجموعہ ہائے کلام ہیں۔ جس میں نئے نئے تجربے جو موضوعاتی اور تکنیکی طرز پر تھے۔ نظم میں ہیئت کے تجربے نظم آزاد، معریٰ نظم او نثری نظم یا پھر ان تجربوں میں جنسی بے راہ روی، ابہام اور اشاریت نظموں میں نئی جہتوں کا خاصہ رہا۔ مجاز کی نظم ''نغمہ ٹیگور'' ہیئت کا تجربہ ہے۔ اختر شیرانی اور ن، م، راشد کے سانیٹ بھی ہیئت کے نئے تجربوں میں اہمیت کے حامل ہیں۔ ایسی نظموں کو غنائی شاعری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے دو مصرعے جو کہ قوانی کے لحاظ سے دونوں مصرعوں کو ملاتا ہے۔ اس صنف کو اختر جونا گڑھی نے پہلے پہل متعارف کرایا۔ اس صنف کی مختلف قسمیں ہیں۔ مثلاً اسپنسری سانیٹ، سکیسپری سانیٹ اور پٹیرارکی سانیٹ ان سب میں مختلف مصرعے ترتیب دیئے جاتے ہیں۔ عظمت اللہ خان وہ واحد شاعر ہیں۔ جنہوں نے ہیئت، آہنگ اور

اوزان و بحور میں نئے تجربے کیے ہیں۔ ہیئت اور اسلوب کے یہی وہ نئے تجربے تھے جو اقبال کے بعد شعراء نے نظم کے پیرائے میں کیے۔ نظم میں قوافی کے نظام سے نئے آہنگ کو متعارف کرایا۔ اس میں ترنم بھی ہے اور غنائیت بھی۔ اقبال کی شاعری اور بعد کے شعراء میں جن موضوعات پر کثرت سے نظمیں لکھی گئیں۔ ان میں یہ احساس بیدار ہو چکا تھا کہ مغربی طاقتیں انسان کو پارہ پارہ کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔

اقبال نے اپنے ہم عصر شعراء کو اپنے افکار، موضوعات، ہیئت اور اسلوب سے اس قدر متاثر کیا کہ اس کی ہر جہت کی تقلید کی گئی۔ اقبال کے معاصرین نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اقبال کے فکر و فن کی دنیا بہت وسیع ہے۔ اقبال کی حکیمانہ نظر اور سماجی شعور اس بات کا پتا دیتا ہے کہ وہ نوع انسانی کو اپنے خاص انداز میں پیغام دینا چاہتے ہیں اور اس پیغام رسانی کے عمل میں مکالماتی اسلوب اختیار کرتے ہیں۔ اقبال نے اپنی نظموں سے صرف شعراء ہی کو متاثر نہیں کیا بلکہ برصغیر کے عوام کو بھی بیدار کیا ہے۔ بیداری کے اس عمل میں انہوں نے خودی کا فلسفہ پیش کیا اور یہ ثابت کیا کہ جس نے اپنی خودی کا ادراک کر لیا اس نے راز ہائے بستہ کا سراغ لگا لیا۔ مغرب کی نئی روشنی پر اقبال نے جو تنقیدی نظمیں لکھی ہیں اس سے صرف مغرب کی مادیت کی طرف اشارہ ہے۔ یہی وہ خودی ہے جس نے مشرق اور مغرب کی راہوں کو جدا کر دیا۔ اقبال نے تصور ملت کو پیش نظر رکھتے ہوئے۔ خودی، درویشی، حرکت اور عمل کا پیغام دیا۔ زبان و اسالیب کے لحاظ سے بیسویں صدی میں صرف اقبال ہی وہ واحد شاعر ہے جس نے اپنے بعد کے شعراء کو متاثر ہی نہیں کیا بلکہ نئی راہوں سے روشناس بھی کرایا ہے۔

نسیم عباس

اقبالیات اور قرۃ العین حیدر

قرۃ العین حیدر اردو ادب میں علامہ اقبالؒ کی اہمیت سے آگاہ ہیں اور بیسویں صدی کا بہترین شاعر تصور کرتی ہیں۔ ان کی نظر میں اردو ادب میں کسی اور کو یہ مقام حاصل نہیں ہو سکا۔ وہ علامہ اقبال کی عظمت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتی ہیں۔

''بیسویں صدی کے اردو ادب میں فقط ایک Olympian Immortal نمودار ہوا۔ جس کا نام اقبال تھا اردو فکشن نے اب تک اس مرتبے کی کوئی ہستی پیدا نہیں کی۔ لہٰذا آج ''خدایانِ ادب'' کا ذکر ہی نہیں کیا جا سکتا لیکن ''انسانی سطح'' پر بات کیجیے تو ۱۹۰۰ء سے لے کر آج تک چند مشہور ترین شخصیتوں کے علاوہ بہت سے اچھے ادیب سامنے آئے۔ ان کو طاق نسیاں پر رکھ دیا گیا۔ ضروری نہیں کہ ایک شخص پچاس برس ایک سے ایک بڑھیا کہانیاں لکھے تب ہی اسے یاد کیا جائے''۔(۱)

قرۃ العین حیدر کو اس بات کا زبردست گلہ ہے کہ مشرقی ادب اعلیٰ پائے کا ہونے کے باوجود بھی اسے مشرق و مغرب میں وہ اعلیٰ مقام نہ مل سکا جس کا وہ مستحق تھا۔ اس سلسلہ میں وہ علامہ اقبال کے ساتھ ساتھ اپنے ساتھ بھی ہونے والی ناانصافی کا تذکرہ کرتے ہوئے بتاتی ہیں کہ رومی، غالب اور اقبال جیسے عظیم شعرا کو وہ مقبولیت نہ مل سکی جس کے وہ مستحق تھے۔

''اچھا مشرقی ادب اپنے آپ میں محصور رہتا ہے اور دوسرے درجے کی مغربی چیزیں عالم گیر شہرت حاصل کرتی ہیں۔ عزیز احمد اور ہم تو خیر بونے لوگ ہیں۔ رومی، غالب اور اقبال کو اسی ترسیلی خلیج کی وجہ سے وہ عالم گیر شہرت اور مقبولیت حاصل نہ ہوئی، جو عمر خیام اور جاپانی ہائیکو نظم کو ملی''۔(۲)

قرۃ العین اُردو ادب میں نہ صرف اپنے آپ کو ایک اعلیٰ ادیب گردانتی ہیں بلکہ وہ علامہ اقبال کی

عظمت کا واضح اور ٹھوس ثبوت پیش کرتی ہیں کہ یو این کی ایک سروے رپورٹ کے مطابق پاکستان کے عظیم اور قومی شاعر کی کتب کو اہمیت حاصل ہے۔ جس کے لیے وہ ان الفاظ میں باور کروانا چاہتی ہیں۔

''ایک عزیز جو عالمِ طیر رکھتا ہے۔ دو سال قبل کراچی سے ٹوکیو جاتے ہوئے سانتا کروز ائر پورٹ بمبئی پر ٹکا۔ اس جہت سے کہ ویزا نہ رکھتا تھا۔ ایئر پورٹ سے میرے دفتر فون کیا اور باتوں باتوں میں بتلایا کہ یو۔ این کے سروے کے مطابق پاکستان میں شاعری کی کتابوں میں اقبال اور فیض اور نثر میں ''آگ کا دریا'' مقبول ترین کتابیں ہیں''۔ (۳)

وہ علامہ اقبال کی اہمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے فیض احمد فیض کے حوالے سے بتاتی ہیں کہ وہ بھی اقبال کی عظمت کے قائل تھے۔ اور اقبال کو لیجنڈ تصور کرتے تھے۔ جس کے متعلق وہ ان الفاظ میں اظہار کرتی ہیں۔

''ایک پائپر ہماری گلی میں آیا تھا۔ اس کی موسیقی سن کر سب لوگ، مرد، عورتیں، بچے اپنے اپنے کام چھوڑ گلی میں ناچنے لگے اور ایک سنہرے زمانے کی طرف رقص کرتے چلے گئے۔ ایک آئرش شاعر نے بچوں کی ایک نظم میں لکھا تھا۔ ہم سب مختلف پائپر کے پیچھے پیچھے جا رہے ہیں۔ جن میں سب سے بڑا پائپر خود ضمیر ہے۔ ''آیا ہمارے دیس میں ایک خوش نوا فقیر'' فیض صاحب نے اقبال کے لیے لکھا تھا۔ اقبال کو ایک لیجنڈ بنے زمانہ ہو گیا۔ اب خود فیض صاحب ایک لیجنڈ بنتے جا رہے ہیں۔ بلّی بھائی کے ہاں دریچے میں کھڑے ہو کر صبح صبح ڈان اخبار کی سرخی دیکھی۔ فیض احمد فیض اور سجاد ظہیر کے لیے سزائے موت''۔ (۴)

عینی آپا علامہ اقبال کے افکار کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اہلِ مغرب کو آگاہ کرتی ہیں کہ عیسائی لوگ تاریخ اسلام کی نسبت اس قدر نجانے کیوں متعصب ہیں۔ وہ اسلامی ہیروز کے افکار و نظریات پڑھنے کی بجائے ٹیگور بنگالی شاعر کو اہمیت دیتے ہیں جو قراۃ العین حیدر کو علامہ اقبال کی نسبت قطعاً ناپسند ہیں۔

''رونلڈ برطانوی ہے۔ نسلاً خالص اینگلو سیکسن''، تم برصغیر کی ساری خرافات سیاسیات کا ذمہ دار مجھے ٹھہراتی ہو، یہ تمہاری بھول ہے۔ وہ انگلی اٹھا کر پیغمبرانہ انداز میں مجھ سے مخاطب ہوتا ہے۔ ڈاکٹر الٹ ملر کرسٹفر لی سے ٹیگور کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں۔ ''حضرت علیؑ اور امام غزالیؒ اور ابن خلدون اور اقبال کا بھی مطالعہ کیجئے۔ مگر آپ عیسائیوں کا قدیم تعصب کب مٹے گا'' ...... میں کہتی ہوں''۔(۵)

قرۃ العین حیدر کو ایک دفعہ روس جانے کا اتفاق ہوا۔ جہاں مشرق و مغرب کے تمام ممالک سے ادبا و شعرا کے علاوہ انہیں بھی ادبی تقریب میں مدعو کیا گیا تھا۔ بنگلہ دیش کے قائد نے ٹیگور کے افکار و نظریات پر روشنی ڈالی جبکہ قرۃ العین حیدر نے پچاس ہزار افراد کے روبرو علامہ اقبال کے متعلق بزبان انگریزی فی البدیہہ تقریر کر کے انہیں روشناس کروایا۔ قرۃ العین حیدر نے اس موقع پر نہ صرف روس میں بلکہ تمام عالم میں علامہ اقبال کے افکار و نظریات کو اجاگر کیا۔ قرۃ العین حیدر اس اجتماع کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہیں۔

''بہت وسیع ڈائیس پر مندوبین کی تقاریر شروع ہوئیں۔ پچاس ہزار کا مجمع گھاس پر نہایت عقیدت سے بیٹھا سن رہا تھا۔ میں نے اپنی فی البدیہہ تقریر بزبان انگریزی میں علامہ اقبال کو بہت Quote کیا جو ایسے موقع پر بہت کام آتے ہیں۔ ایرا نے روسی میں ترجمہ کیا۔ بنگلہ دیشی قائد نے ٹیگور سے شروع کر کے ٹیگور پر ختم کیا''۔(۶)

قرۃ العین اردو ادب میں الم پرستی، رومانی کرب اور رابندر ناتھ ٹیگور کی غم پسندی کا ذکر بڑے دکھ کے ساتھ کرتے ہوئے ناپسند کرتی ہیں جبکہ علامہ اقبال کی شاعرانہ خصوصیات کو اجاگر کرتے ہوئے تاریخ ادب اردو میں ان کا ایک مقام متعین کرتی ہیں۔ انہیں علامہ اقبال کی نسبت اس دور کے دیگر تمام مصنفین قابل رحم نظر آتے ہیں۔ جنہوں نے اردو ادب کو درس حیات دینے کی بجائے موت کا درس دیا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے ایسے ادیبوں کے متعلق بڑے گہرے دکھ، غم اور افسوس کا اظہار کیا ہے۔ جو قوم کو کچھ دینے کی

بجائے صرف ان کے سامنے آنسو بہانا جانتے ہیں۔ اس الم پرستی کو صرف اور صرف علامہ اقبال نے ختم کرنا چاہا مگر رابندرناتھ ٹیگور جسے ہندو عظیم شاعر تصور کرتے ہیں اور اس کے گن گاتے ہیں۔ اس نے دوبارہ شاعری میں الم پرستی کو فروغ دیا۔ قرۃ العین حیدر نے اس کے متعلق ان الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

> ''۱۹۰۸ء میں ''عصمت'' کا اجرا ہوا۔ اس کے بانی علامہ راشد الخیری نے جو ''مصورِ غم'' کہلائے اس رویے کو عروج پر پہنچا دیا۔ خواجہ حسن نظامی کی ''غدر کی ماری شہزادیاں'' راشد الخیری اور خواتین ناول نگاروں کی مظلوم ہیروئینیں رومانی ہیرو ہر طرف دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ سارا ہندوستان غم پسندی میں مبتلا تھا۔ اقبال کی گھن گرج نے اردو شاعری کی الم پرستی کو ذرا کم کیا لیکن ٹیگوریت اور رومانی کرب نے پھر آنسوؤں، آہوؤں اور ٹھنڈی سانسوں کا مینہ برسا دیا۔ کولونیل سماج کا ادیب و شاعر رونا ہی جانتا ہے''۔ (۷)

وہ اردو ادب کی ترقی کی خواہاں ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ اردو ادیب کو نئی روایت کے ساتھ ساتھ قدیم روایت سے بھی تعلق رکھنا چاہیے تا کہ وہ مستقبل پر بھی نظر رکھے۔ اس سلسلے میں انہیں ایک خدشہ لاحق ہے کے ہمارا روایت سے تعلق ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اس روایت پر چل کر ہم علامہ اقبال کی تعلیمات اور افکار سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ علامہ اقبال کے افکار و نظریات سے مستفید ہونے کی دعوت دیتی ہیں۔ جن کا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتی ہیں:

> ''اسد اللہ شاہ بخاری کے خیال میں روایت سے رشتے ٹوٹتے جا رہے ہیں۔ زیادہ تر نوجوان اردو ادیب اگر وقت سے پہلے مر گئے تو عالم بالا میں قدما اور اقبال سے مل کر خود کو اجنبی محسوس کریں گے ...... آج کے مصنف کو نہ صرف یہ کے نئی چیزوں کے نئے نام دریافت کرنے میں بلکہ ان چیزوں کو جو پہلے سے جانی یا محسوس کی گئی ہیں، از سر نو پہچاننا اور ان کے نام تلاش کرنے کے لیے کمر بستہ ہونا ہے۔ اردو مصنف ایک ایسی پھیلی ہوئی کمیونٹی میں رہتا ہے۔ جس کی اب تک

توضیح نہیں کی گئی۔ایک وژن،ایک فوکس کی تلاش اور ایک مقصد اور آگے دیکھنے کی جسارت اور ہمت اس کے لیے ضروری ہے"۔(۸)

قرۃ العین اردو ادب کی بہتری کے لیے کوشاں ہیں۔اس سلسلے میں انہوں نے ایک طویل مضمون "افسانہ" تحریر کیا جس میں ترقی پسند مصنفین کو داد دی ہے۔۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک اور قیام پاکستان کے بعد سے لے کر آج تک افسانوی ادب کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے۔اس میں "لندن کی ایک رات" اور "انگارے" نے ایک نیا دروازہ کھول دیا ہے مگر مصنفین جدت پسند نہیں اور وہ بار بار سوال اٹھاتی ہیں کہ اس ملک میں اچھا ادب کیوں نہیں تخلیق کیا جاتا؟ چند ایک اچھے افسانہ نگاروں کے نام بھی گنواتی ہیں۔۔نئے لکھنے والوں میں جیلانی بانو کا بھی تذکرہ کرتی ہیں۔ان کے خیال میں یہ چند ایک ادیب کب تک اردو ادب کی گاڑی چلائیں گے۔اس سلسلہ میں وہ اظہار افسوس کرتی ہیں کے ویسے تو ہم بڑے ذہین ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اپنے آپ کو میر تقی میر،حالی،غالب اور علامہ اقبال جیسے عظیم شعرا کے وارث گردانتے ہیں مگر ادبی لحاظ سے بہتر کارکردگی ظاہر نہیں کرتے جو علامہ اقبال نے ظاہر کی۔قرۃ العین حیدر اس کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہیں:

"دعوے تو آپ کو بہت ہیں۔ہم انٹلکچو ل ہیں (بہت ہیبت ناک لفظ ہے) ہم معاشرے کا ضمیر ہیں،ہم میر و غالب و حالی و اقبال کے وارث ہیں۔تہذیب کے محافظ ہیں (وغیرہ وغیرہ)۔اپنے آپ کو"ادیب" کہلا کر پھولے نہیں سماتے مگر جو حالت ہے وہ یہ ہے"۔(۹)

ان کی نظر میں علامہ اقبال نہ صرف شاعر،ادیب،فلسفی،سیاست دان اور مفکر پاکستان تھے بلکہ وہ ایک بہت بڑے فلمی کہانی نویس بھی تھے۔انہوں نے ایک فلم افغان شہزادہ کی کہانی تحریر کی۔وہ نہ صرف علامہ اقبال کی ذہانت کی قائل ہیں بلکہ ان کے ہر فن مولا ہونے کا ثبوت بھی پیش کرتی ہیں۔

"۱۹۳۴ء میں لاہور میں ایک فلم بن رہی تھی۔اس کی کہانی علامہ اقبال نے لکھی تھی۔فلم کا نام افغان شہزادہ اناؤنس ہوا تھا۔خواجہ حسن نظامی اس کے ڈائیلاگ رائیٹر تھے"۔(۱۰)

قرۃ العین حیدر اردو ادب کی ترقی اور ادیبوں کی اصلاح کے لیے ''اقبال ایوننگ'' قائم کرنے کی خواہاں ہیں تا کہ دورِ جدید کے ادیب علامہ اقبال کے افکار و نظریات سے آگاہ ہو سکیں۔ انہوں نے اس سلسلہ میں برطانیہ میں انگریزوں سے بھی رابطہ کیا اور تگ و دو کی تا کہ لوگ اقبال کے نظریات کے فروغ کے لیے مزید کوشاں ہوں وہ اقبال ایوننگ اکیڈمی قائم کرنے کی زبردست خواہاں ہیں۔

''پرسوں میلہ کمیٹی کی میٹنگ ہے۔ اقبال ایوننگ کے سلسلے میں اقبال سنگھ سے ملنا ہے...... رلف رسل اور انگریزوں کے جگر مراد آبادی سے بھی اقبال ایوننگ کے لیے بات کرنی ہے اور افسوس ہے کہ احتشام صاحب اس سے پہلے ہی لکھنؤ لوٹ جائیں گے...... میں شام کو سخت ڈیپریسڈ گھر پہنچی۔ اس وقت اُوجیت کا فون آیا۔

''ہلو...... سنو'' ...... وہ دھاڑ رہا تھا۔ دیکھو یہ ٹیگور ٹیگور ہر وقت بنگالی کا شور مچا رہتا ہے۔ اب اقبال ایوننگ ہونی ضروری ہے۔ ضرور ایسا ہی ہوگا۔ میں نے کہا۔
اگلے روز پریس کلب سے میں نے رلف رسل کو فون کیا (رلف علی گڑھ سے اردو پڑھ کر آئے تھے اور یہاں یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں پڑھاتے تھے۔ نہایت فصیح و بلیغ اردو بولتے تھے اور اکثر ہم لوگوں کو اردو کی غلطیوں پر ٹوکتے رہتے تھے۔)
بھئی یہ علامہ اقبال کا سلسلہ ہے کچھ۔'' (۱۱)

قرۃ العین علامہ اقبال کے افکار و نظریات سے مستفید ہونے کے متعلق پاکستانیوں کے بارے میں اظہارِ تعجب کرتی ہیں کہ پاکستانی اپنے قومی شاعر کے متعلق اس قدر آگاہ نہیں۔ جس قدر ہندوستانی لوگ ہیں اور انہوں نے علامہ اقبال کے متعلق بے حد کام کیا ہے اور علامہ اقبال کی اہمیت سے اس قدر آگاہ ہیں کہ انہوں نے برطانیہ میں انڈیا ہاؤس پر اقبال ایوننگ کے پوسٹر لگائے ہوئے ہیں جسے دیکھ کر پاکستانی حیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ آج میں نے ایک عجیب بات دیکھی......

''ایک پاکستانی نے دوسرے سے کہا۔ انڈیا ہاؤس میں چاروں طرف ''اقبال ایوننگ'' کے پوسٹر لگے ہوئے ہیں۔ میں نے نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور پھر

کام میں لگ گئی۔" (۱۲)

قرۃ العین حیدر برطانیہ میں انگریزوں کی علامہ اقبال سے متعلق دلچسپی اور افکار و نظریات سے مستفید ہونے کا تذکرہ کر کے علامہ اقبال کی اہمیت پر روشنی ڈالتی ہیں کہ اقبال کے متعلق انگریزوں کی دلچسپی کوئی دور جدید کا واقعہ نہیں بلکہ اقبال کی اولین تصنیف "اسرار خودی" کا ترجمہ انگریزی میں پروفیسر نکلسن نے کیا جس سے اقبال یورپ میں روشناس ہوئے۔ انگریزوں نے علامہ اقبال کو ایک عظیم شاعر تصور کرتے ہوئے اسے سرکاری طور پر اہمیت دی اور "اقبال ڈے" منایا۔

> "دیکھو یہ ٹیگور ٹیگور ہر وقت بنگالی کا شور مچا رہتا ہے۔ اب اقبال ایوننگ ہونی ضروری ہے...... اچھا...... تو خیال یہ ہے کہ اقبال اتنا بڑا شاعر تھا کہ ایک انگریز بھی اس کے متعلق تقریر کر رہا ہے...... قصہ یہ تھا کہ سرکاری اقبال ڈے کے موقعوں پر سلطنت برطانیہ کے بڑے بڑے نائیٹ حضرات کو مدعو کر کے جن کو اقبال یا ان کے کلام سے دور دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ ان سے تقریریں کروائی جاتی تھیں۔ انگریزوں کے جگر مراد آبادی صاحب انگریزی کے اچھے خاصے مشہور شاعروں میں سے تھے اور روحانی طور پر بڑے سخت مسلمان تھے۔ مشرق کے افلاس میں ان کو خدا کی قدرت نظر آتی تھی۔ سرکاری "یوم اقبال" پر یہ ہر سال مسجدوں کے میناروں کی تعریف میں اپنی ایک آدھ انگریزی نظم پڑھ ڈالتے تھے"۔ (۱۳)

قرۃ العین حیدر پریس اتاشی کی ملازمت کے دوران لندن تشریف لے گئیں۔ وہاں انہوں نے اقبال ایوننگ کی تیاری میں بڑی محنت اور مشقت سے کام لیا، ان کے ہمراہ رمیش سنگوی بھی تھے۔ جنہوں نے مل کر اقبال کے کلام کا انگریزی ترجمہ کرنے میں محنت و مشقت سے کام لیا۔ قرۃ العین حیدر دور جدید کے ادیبوں کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے، اپنی کوششوں کا ذکر بھی اقبالیات کے حوالے سے کرنا چاہتی ہیں کہ انہوں نے اقبالیات کے حوالے سے بہت کام کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ خوش گپیوں سے لطف اندوز ہونے کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

''مڈل ٹمپل کی لائبریری میں بیٹھے ہوئے میں اور رمیش سنگوی اسکرپٹ کیلئے اقبال کی نظموں کو جلدی جلدی انگریزی میں ترجمہ کرنے میں مشغول رہے۔ ہمارے ساتھ ہی آل حسن کی خوب صورت بیوی کرشنا اور پی ایس ایف کا بنگالی پریذیڈنٹ ہمایوں رشید اور ترونا دیدی کے میاں دلیپ بیٹھے حسبِ معمول کسی بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ یہ سب قانون کے طالب علم تھے۔ اقبال کا اسکرپٹ ایک طرف رکھ کر ہم نے کسی بات پر ہنسنا شروع کیا۔ حسبِ معمول پھر شور مچنے لگا''۔(۱۴)

''اقبال ایوننگ'' میں جن حضرات نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، قرۃ العین ان کا ذکر کیے بغیر رہ نہیں سکتیں اور ان کی کاوشوں کا تذکرہ کر کے ''اقبال ایوننگ'' کی کامیابی کا ذکر ان الفاظ میں کرتی ہیں:

''اقبال ایوننگ'' نہایت شاندار اور کامیاب رہی۔ ہندی سیکشن والے بی بی سی تھیٹر میں اپنی ''سبھا'' پیش کر رہے تھے، آمنہ، سریکھا، انور اور غزالہ سب کے سب اس میں جٹے تھے''۔(۱۵)

انہوں نے ''اقبال ایوننگ'' کے حوالے سے نوجوان ادباً کی سرگرمیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ انہوں نے اقبال کے فلسفہ پر لندن میں تقاریر کیں اور اقبال ایوننگ کو اپنی غربت کے باوجود کامیاب بنانے کے لیے عطیے دے کر اعانت کی۔ حالانکہ انہیں اپنے مکان کو مرمت کروانے کے لیے رقم کی شدید ضرورت تھی مگر انہوں نے علامہ اقبال کے نظریات اور تعلیمات کے فروغ کے لیے حتمی کاوش کی۔ جس سے اقبالیات کے ساتھ گہری دلچسپی ظاہر ہوتی ہے۔

''طلعت اور کمال وغیرہ کی سرگرمیوں کو رنجور صاحب بہت سراہتے تھے۔ اقبال ایوننگ میں جا کر انہوں نے اقبال کے فلسفے پر تقریر کی۔ لندن مجلس کو ہمیشہ مختلف قسم کے عطیے اپنی بساط سے بڑھ کر دیتے رہتے۔ حالانکہ رنجور صاحب کی مالی حالت اتنی خستہ تھی کہ اپنے مکان کی مرمت تک نہ کروا سکتے تھے''۔(۱۶)

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے متعلق ادباً کی گہری دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے بتانا چاہتی ہیں۔

جہاں لوگ نگر نگر گھوم کر مختلف نوادر جمع کرنے کے شوقین ہیں۔ وہاں ان کے کمروں میں اقبال جیسے عظیم شاعر کی کتب الماریوں سے بھری پڑی ہیں۔ جن سے وہ استفادہ کرتے ہیں۔ اس کے متعلق وہ ان الفاظ میں ذکر کرتی ہیں:

> ''کمرے میں ایک طرف کتابوں کی الماریاں تھیں۔ اقتصادیات، علامہ اقبال، فیض، کرشن چندر، پھر سریکھا کی کتابیں تھیں۔ موسیقی، بیلے، کربوگرافی، سارے میں نفیس آرٹسٹک چیزیں لگی تھیں۔ جو سریکھا اور گلشن نے سارے ہندوستان، عوامی چین اور یورپ میں گھوم کر جمع کی تھیں۔ روس کا بیلا لیکا چین کے نوادر ،ہنگری کی گڑیاں، اٹلی اور فرانس کی پینٹنگز''۔ (۱۷)

قرۃ العین علامہ اقبال کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے آگاہ کرنا چاہتی ہیں کہ علامہ اقبال کے افکار و نظریات یا تصانیف سے فقط ادبا ہی مستفید نہیں ہو رہے بلکہ بڑے بڑے روٗسا اور نواب کلام اقبال سے زندگی کے تلخ حقائق کا حل تلاش کرتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر بھی یہی درس نوجوان نسل کو دینے کی زبردست خواہاں ہیں کہ زندگی کے مسائل کا حل فلسفہ اقبال میں موجود ہے۔ لہٰذا ہمیں اقبال کے افکار و نظریات سے استفادہ کرنا چاہیے اور اس پر عمل کرنا چاہیے۔

> ''نواب سید عاشق حسین مرحوم کے جس مکان میں حسنین ماموں اور چندا ممانی کی شادی ۱۹۳۲ء میں رچی تھی۔ اس میں اب نواب سید حامد علی خاں (ابن نواب سید عاشق حسین خاں مرحوم) کے نہوڑی داماد سید حسین مہدی رضوی ایڈووکیٹ فروکش ہیں اور اقبال کی ''اسرار خودی'' کا منظوم اردو ترجمہ لکھنے میں مصروف۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زندگی کے تلخ حقائق کا فلسفے اور مابعد الطبیعات سے کیا رابطہ اور کس نوع کی مطابقت ہے؟ ایک نوابزادہ کزن کارل مارکس کا مطالعہ کر رہا ہے۔ کچھ لوگ فلسفہ اقبالؒ میں زندگی کا حل تلاش کرتے ہیں''۔ (۱۸)

قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کو پاکستان کا قومی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے اعلیٰ افکار و نظریات کی بدولت پاکستان کا روحانی باپ تصور کرتی ہیں۔ وہ اس بات کا اظہارِ کرتی ہیں کہ علامہ اقبال

میں بے حد صفات تھیں۔ انہوں نے مغربی فلسفہ کا عمیق مطالعہ کیا۔ وہ جمہوریت پسند تھے اور جمہوریت کو اسلامی الٰہیات اور قوانین کے مطابق ڈھالنے کی خواہش رکھتے تھے۔ اس کے متعلق وہ یوں ذکر کرتی ہیں:

> ''اقبال پاکستان کا روحانی باپ تھا۔ وہ Westernizer تھا۔ اس نے فلسفے کا مغرب میں مطالعہ کیا اور مغربی فلسفیوں کے متعلق لکھا۔ اسے صرف دو مفکر پسند آئے۔ S.T.Thomas Aqlanas اور Max Sholer (بیسویں صدی کا مابعد الطبیعاتی مفکر جس کا نظریہ مذہبی تھا)۔ اقبال جمہوریت پرست بھی تھا لیکن جمہوریت کو اسلامی الٰہیات اور قوانین کی مطابقت کے ساتھ رائج کرنا چاہتا تھا۔
> آج کل طرزِ حکومت کے مسائل کے متعلق جو پاکستان میں لکھا جا رہا ہے اور تحریروں اور مباحثوں میں مضمر Stimulation, Shock, Challenge سارا کا سارا مغربی ہے''۔(۱۹)

علامہ اقبال کو بعض ادباً پروگریسو گردانتے ہیں اور بعض ری ایکشنری۔ قرۃ العین حیدر کے نزدیک اقبال پروگریسو ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ علامہ اقبال کی نظم ''مسجد قرطبہ'' کا ذکر کرتی ہیں۔ جسے بعض لوگ ری ایکشنری کہتے ہیں لیکن قرۃ العین حیدر یہ واضح کرنا چاہتی ہیں کہ اقبال ایک پروگریسو ذہن کے مالک ہیں۔ وہ اس سلسلہ میں فیصلہ ہم پر چھوڑتی ہیں کہ ان کے کلام کا مطالعہ کیا جائے۔ تب آپ فیصلہ کر پائیں گے کہ آیا اقبال پروگریسو تھے یا ری ایکشنری۔ اس کے لیے وہ ان الفاظ میں سوال کرتی ہیں؟

> ''انڈر گراؤنڈ کے برقی زینے تک پہنچتے پہنچتے تقی میاں پبلک سروس کمیشن کو بھول کے جوش میں آ کر ''مسجد قرطبہ'' شروع کر چکے تھے۔ دفعتاً انہوں نے ٹھٹھک کر کہا، مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک ری ایکشنری نظم ہے۔ یہ اردو کی زبان کی حسین ترین نظم ہے''۔ میں نے جواب دیا۔ پلیٹ فارم پر پہنچ کر پائپ دوبارہ سلگاتے ہوئے تقی میاں نے فرمایا۔ ''اب یہ غور کرنا لازم ہے آیا اقبال کس حد تک پروگریسو تھے اور کس حد تک ری ایکشنری''۔(۲۰)

قرۃ العین کے نزدیک علامہ اقبال بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ نہ صرف قومی شاعر ہونے

کے ناطے ان کی معتقد ہیں بلکہ ایک اسلامی شاعر ہونے کی بناء پر ان کی پیروکار بھی ہیں۔ وہ اقبال کو ایک سچا مسلمان اور عاشقِ دین تصور کرتے ہوئے ان کے افکار و نظریات کی قائل ہیں اور وہ اقبال کے اسی پہلو کو سب سے زیادہ پسند کرتی ہیں۔

''اب علامہ اقبال کو لیجیے اور اسلامی کلچر کے متعلق ان کے نظریات...... انتہا پسندی ہمیشہ پُر کشش ہوتی ہے۔ مزید برآں اقبال کا ایک پہلو ہمیشہ آپ کو جماعت اسلامی کی طرف لے جائے گا۔ مجھے ہے حکم اذان''۔(۲۱)

قرۃ العین حیدر ہمہ وقت اقبالیات کو سمجھنے کی کاوش میں لگی رہتیں اور اقبال کی شاعری کو سمجھنے کی جستجو کرتی رہتیں، جس سے انہیں اقبالیات سے والہانہ لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اقبالیات سمجھنے کے لیے اپنے والد محترم سید سجاد حیدر یلدرم سے رات گئے تک محو گفتگو رہتیں اور یلدرم بھی اپنی بیٹی کو اقبال کی شاعری کے متعلق دوستانہ ماحول میں آگاہ کرتے اور ان کے اندر اقبال شناسی کے لیے تجسس پیدا کرتے۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے والد محترم سے دوستانہ ماحول میں اقبال شناسی سیکھی۔ بقول قرۃ العین:

''رات کو ابا جان کے ساتھ میں دیر تک اقبال کی شاعری اور دنیا جہان کی باتوں پر بحث کرتی رہتی ابا جان میرے بہترین دوست تھے''۔(۲۲)

لہٰذا وہ اس بات کا واضح طور پر اعتراف کرتی ہیں کہ کلامِ اقبال کو اس دور میں سمجھنا ان کے لیے بالاتر تھا جب وہ لڑکپن کی زندگی بسر کرتی تھیں۔ جس کا وہ ذکر ان الفاظ میں کرتی ہیں۔ ''نجانے کیوں، اس وقت تک اقبال کو سمجھنے کی عقل بھی نہیں آئی تھی''۔(۲۳)

قرۃ العین علامہ اقبال کی تصانیف سے متعلق بچپن کے واقعات کا تذکرہ کرتی ہیں کہ بچپن میں ان کے والد محترم سید سجاد حیدر یلدرم کے ہاں ان کے دوست احباب ملنے کیلئے آتے تھے تو وہ ان کو علامہ اقبال کی کتب اٹھا کر پڑھنے کے لیے دیتی تھیں۔ اس طرح بچپن ہی سے وہ علامہ اقبال کی کتب سے آشنا ہو گئی تھیں۔

''مجھے اس وقت یاد آیا ایک افغان شہزادے سردار عمر خان جب نمبر ۲۰ کرزن روڈ دہرہ دون کے پہلو کے روشن برآمدے میں آکر بیٹھا کرتے تھے اور ابا جان کے

ساتھ شطرنج کھیلتے تھے۔ایک بار میں نے ضربِ کلیم میں سے ''رومی بدلے، شامی بدلے، بدلا ہندوستان۔تو بھی اے فرزند کہستاں اپنی خودی پہچان''۔ان کو دی تھی اور وہ اٹک اٹک کر اس نظم کو پڑھ رہے تھے اور اس وقت علامہ عبداللہ یوسف علی کے مترجمہ قرآن شریف کا ایک پارہ ڈاک سے آیا اور ابا جان نہایت ذوق و شوق سے اس کے متعلق سردار عمر خان سے گفتگو کرنے لگے''۔(۲۴)

قرۃالعین حیدر نے ایک افسانوی مجموعہ ''ستاروں سے آگے'' مکتبہ جدید لاہور سے پہلی بار ۱۹۴۶ء میں شائع کروایا۔اس افسانوی مجموعے کا عنوان علامہ اقبال کے اس شعر سے ماخوذ ہے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں　　　　ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

علامہ اقبالؒ کے مذکورہ بالا شعر سے ظاہر ہوتا ہے وہ کائنات کا راز جاننے کے خواہاں تھے اور وہ جدوجہد کے قائل اور جہانِ نو پیدا کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔یہی پیغام وہ نئی نسل کو منتقل کرنا چاہتے تھے۔قرۃالعین نے اپنے مذکورہ بالا افسانوی مجموعہ میں علامہ اقبال کی مانند نوجوان نسل کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی کاوش کرتے ہوئے علامہ اقبال کے کلام سے مستفید ہونے کی دعوت دی ہے۔

''دوعالم کون ومکاں (Versus) لامکاں۔اے طائر لاہوتی' نہ تو زمین کے لیے ہے نہ آسمان کے لیے۔ہوا میں معلق رہ۔اسرار خودی پڑھو، رموزِ بے خودی پڑھو، اگر قرآن پڑھنے کی توفیق نہ ہو تو اقبال کا مطالعہ کرو''۔(۲۶)

قرۃالعین نے علامہ اقبال کے ایک اور شعر سے مزید ایک اور ناول ''کارِ جہاں دراز ہے'' منسوب کیا جو تین جلدوں پر مشتمل سوانحی ناول ہے۔جس میں انہوں نے اپنے خاندان کے تعلقات کا تذکرہ علامہ اقبال کے خاندان کے ساتھ کیا ہے، اس ناول کی پہلی جلد ۱۹۷۷ء میں، دوسری جلد ۱۹۷۹ء میں مکتبہ جدید اردو ادب لاہور نے شائع کی، جب کہ تیسری جلد ۲۰۰۱ء میں سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور نے شائع کی۔ان تینوں جلدوں کو سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور نے ایک جلد میں یکجا کیا ہے۔اس ناول کا نام علامہ اقبال کی تصنیف ''بال جبریل'' کی تیسری غزل کے چھٹے شعر سے ماخوذ کیا ہے۔

باغِ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں   کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر (۲۷)

قرۃ العین حیدر نے سفرِ ایران پر مبنی ایک سفر نامہ ''کوہ دماوند'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔ ''کوہ دماوند'' ایران میں ایک پہاڑ کا نام ہے۔ انہوں نے علامہ اقبال کے درج ذیل شعر سے اس سفرنامے کو منسوب کیا ہے۔

مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین وحق اندیش   خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دماوند (۲۸)

قرۃ العین نے اس سفرنامے میں تاریخ ایران کے ساتھ ساتھ زوال ایران پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ کن حالات وواقعات کی وجہ سے شاہ ایران رضا شاہ برسراقتدار آئے اور ان کی حکومت کو زوال آیا۔ انہوں نے ''کوہ دماوند'' میں شہنشاہ ایران اور اس کی ملکہ فرح دیبا کی دلچسپ اور عبرت انگیز کہانی تحریر کی ہے اور مصطفیٰ کمال اور شہنشاہ ایران کی صلاحیتوں کا ذکر کیا ہے۔ جن کے متعلق علامہ اقبال پہلے ہی مایوس ہو چکے تھے۔

نہ مصطفیٰ، نہ رضا شاہ میں نمود اس کی   کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی (۲۹)

قرۃ العین حیدر نے اپنی تصانیف میں، افسانوں اور ناولوں کے موضوعات میں جا بجا علامہ اقبال کے تخیلات، افکار ونظریات، الفاظ، مخصوص علامات واصطلاحات، تشبیہات واستعارات اور اشعار کے حوالے سے خوب صورتی پیدا کی ہے اور اپنے قارئین کو علامہ اقبال کے افکار ونظریات سے آگاہ کرتے ہوئے مزید ان کی معلومات میں اضافہ کیا ہے۔ چنانچہ وہ اقبال کے اسلوب نگارش کے سحر میں اس قدر اسیر ہیں کہ وہ خود کو اس سے باہر نہیں نکال سکتیں اور اپنی تصانیف میں وہ اقبال کی امیجری پیدا کرنے کی زبردست خواہاں ہیں اور متحیر بھی رہیں کہ اسے کس طرح اپنی تحریروں میں پیدا کروں۔ چنانچہ وہ اس معاملہ میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئیں ہیں۔ وہ ''جہانِ نو پیدا'' کرنے کی غرض سے نئے اور انوکھے کردار کی صورت میں بعض اوقات علامہ اقبال کے افکار کو زیر قلم لائیں کہ اقبال کے اشعار، مصرعے اور تلفظ ان کا اپنا اسلوب نگارش معلوم ہوتا ہے۔

ان کی تحریریں یہ بات واضح طور پر ثابت کرتی ہیں کہ ان کی نظر میں علامہ اقبال ایک خاص مقام رکھتے ہیں اور اسی وجہ سے حکومت ہند نے انہیں ''اقبال سمان'' کا ایوارڈ بھی ۱۹۸۷ء میں عطا کیا۔ (۳۰)

حوالہ جات

۱۔ پکچر گیلری۔ قرۃ العین حیدر، قوسین لاہور بار اول ۱۹۸۳ء صفحہ نمبر ۱۲۷
۲۔ ایضاً صفحہ نمبر ۱۳۲
۳۔ کار جہاں دراز ہے، جلد دوم۔ قرۃ العین حیدر۔ مکتبہ اردو ادب، لاہور (س ن) صفحہ نمبر ۳۱۲
۴۔ ایضاً صفحہ نمبر ۱۳۸
۵۔ ایضاً صفحہ نمبر ۱۳۴
۶۔ گلگشت، قرۃ العین حیدر۔ مکتبہ اردو ادب بازار، لاہور (س۔ن) صفحہ نمبر ۱۲۱
۷۔ کار جہاں دراز (جلد اول) قرۃ العین حیدر۔ مکتبہ اردو ادب بازار، لاہور۔ (س۔ن) صفحہ نمبر ۱۶۸
۸۔ کار جہاں دراز ہے۔ جلد دوم، صفحہ نمبر ۲۸۰
۹۔ پکچر گیلری۔ قرۃ العین حیدر۔ صفحہ نمبر ۶۸
۱۰۔ گردش رنگ چمن۔ قرۃ العین حیدر۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نمبر ۶ اشاعت ۱۹۹۱ء صفحہ نمبر ۲۸۰
۱۱۔ فصل گل آئی یا اجل آئی۔ قرۃ العین حیدر۔ مکتبہ اردو ادب بازار، لاہور (س۔ن) صفحہ نمبر ۶۴، ۶۷
۱۲۔ ایضاً صفحہ نمبر ۶۸
۱۳۔ ایضاً صفحہ نمبر ۶۷، ۶۸
۱۴۔ ایضاً صفحہ نمبر ۶۸، ۶۹
۱۵۔ ایضاً صفحہ نمبر ۷۱
۱۶۔ آگ کا دریا۔ قرۃ العین حیدر۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔ سال اشاعت ۱۹۹۹ء صفحہ نمبر ۴۱۰
۱۷۔ ایضاً صفحہ نمبر ۴۵۵
۱۸۔ کار جہاں دراز ہے۔ جلد دوم۔ صفحہ نمبر ۳۶۴
۱۹۔ ایضاً صفحہ نمبر ۳۸۱
۲۰۔ ایضاً صفحہ نمبر ۱۳۰
۲۱۔ ایضاً صفحہ نمبر ۵۱، ۲۱۴
۲۲۔ ستاروں سے آگے۔ قرۃ العین حیدر۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔ ۱۹۹۵ء صفحہ نمبر ۲۰۴
۲۳۔ کار جہاں دراز ہے۔ جلد دوم۔ صفحہ نمبر ۶۵
۲۴۔ ایضاً صفحہ نمبر ۲۱۵
۲۵۔ بال جبریل۔ محمد اقبال۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔ اگست ۱۹۹۹ء صفحہ نمبر ۶۱
۲۶۔ ستاروں سے آگے۔ صفحہ نمبر ۹۷
۲۷۔ بال جبریل، صفحہ نمبر ۷
۲۸۔ ایضاً صفحہ نمبر ۲۱
۲۹۔ ضرب کلیم۔ محمد اقبال۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔ اگست ۱۹۹۹ء صفحہ نمبر ۲۱
۳۰۔ ہندو مسلم فسادات اور اردو افسانہ۔ محمد غیاث الدین شیخ۔ میاں چیمبرز ۳ ٹمپل روڈ لاہور۔ ۱۹۹۹ء صفحہ نمبر ۱۶۵

انشائیہ

ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی

تصوّر

تصور ارزاں بھی ہے اور حسین بھی۔ ہر قید سے آزاد اور انسانی ظرف کے تابع جہاں انسان کی رسائی ممکن نظر آتی اور وہ خیال انسان کے لیے آئیڈیل ہوتا ہے تو تصور سے ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ تصور کے حصول کے لیے کوئی فارمولا نہیں ہے، کوئی پابندی نہیں ہے، اس کے لیے تو خود ہی موڈ بنتا ہے تمام وسائل جیسے پہلے ہی سے فضا میں موجود ہوتے ہیں کسی جادو کے تحت اتنی تیزی سے ان کا وجود عمل میں آتا ہے جیسے وہ پہلے ہی سے موجود تھا۔ حیران ہونے کا بھی موقعہ نہیں ملتا۔ ہر چیز اپنی مکمل شکل میں کھنچی چلی آتی ہے، اتنی مکمل اور حقیقی کہ اسے چھو کر دیکھا جاسکتا ہے بلکہ عام حالت میں تو شک وشبہ کی گنجائش بھی نکل سکتی ہے اور نکلتی ہے لیکن تصور میں تو سود و زیاں، وہم وگماں ہر بات سے مبرا ہر وہ چیز سامنے موجود ہے جو ذہن اور دل ودماغ میں آسکتی ہے، دراصل یہ بھی تصور کی پہنائی ہوتی ہے۔

تصور محفوظ اور بے مثال جائے پناہ ہے۔ اس پر کوئی پابندی عائد نہیں ہوسکتی۔ جیسے چاہیں جب چاہیں تصور کی دنیا آباد کی جاسکتی ہے وہاں تک رسائی میں آسانیاں ہی آسانیاں ہیں قید و بند بھی رکاوٹ نہیں بن پاتے انسان دندناتا ہوا چلتا ہی چلا جاتا ہے اور جسمانی طور پر چلنے اور منزل تک پہنچنے کی راہ خالی نظر آتی ہے، ہر طرف ممکنات کی فضا ہوتی ہے۔ عاشق، شاعر، محروم، معذور ہر کوئی اپنی خواہش اور آئیڈیلز کے مطابق ہر قدم پر خوشی کے ساتھ ایک فاتح کے سے انداز میں گو ہر مراد حاصل کرتا ہے۔ اسے کسی بات کا خوف نہیں ہوتا۔ تصور میں سات پردوں میں چھپا ہوا محبوب اس کے قدموں میں لوٹتا اور مچلتا ہے۔ خوشبو کی طرح وہ پھیلتا چلا جاتا ہے اسے کسی بات کا ارمان نہیں رہتا۔ اسے یہ کہنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی کہ بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے اس لیے کہ آپ نے جوں ہی سوچا اور وہ کام ہوگیا۔ اب یہ آپ کے سوچنے پر منحصر ہے کہ آپ کس انداز میں کس معیار سے سوچتے ہیں۔ ہاں سوچنے سے عاری شخص ضرور

محدود رہتا ہے۔ یہاں انسان کی شخصیت کا اظہار برملا ہوتا ہے۔ اس کے خیال کی اڑان کا بھی امتحان ہوتا ہے۔ تصور کی دنیا آباد کرنے والا شخص خوب جانتا ہے کہ وہ بہاؤ کی زد میں ہے صرف اشارے کی دیر ہے۔

تصور کا براہ راست تعلق انسان کی قوتِ متخیلہ سے ہے وہ تمام باتیں جو سوچی جاسکتی ہیں وہ کسی نہ کسی طریقے پر ذہن میں بھی آسکتی ہیں وہ تصور کا حصہ ہیں اور جن تک خواہ عام زندگی میں رسائی ممکن نہ ہو لیکن تصور میں وہ آن کی آن میں زیادہ بہتر، زیادہ واضح اور خوب صورت انداز میں موجود ہوتی ہیں۔ انسان حیران رہ جاتا ہے اتنا واضح تصور تو خواب میں بھی نہیں آپاتا۔ وہاں بھی فضا بکھری بکھری، منتشر سی، اڑتے ہوئے بادل، کہیں کہیں گیپ اور یاد سے بھی محو ہو جانے والی باتیں، آدھے پونے چہرے، ان چہروں میں بھی مختلف چہروں کی مشابہت، کبھی کبھی دو متضاد خیالوں میں الجھی ہوئی تصویر ہوتی ہے اور سب سے بڑی قباحت یہ ہوتی ہے کہ شک وشبہ کی گنجائش رہتی ہے۔ شاید وہ نہیں شاید وہ۔ کچھ کچھ ایسا ماحول تھا، یہ سب کچھ بکھرے بکھرے تصور سے بھی ماورا جہاں اگر ہم خواہش بھی کریں تو ویسا نہیں کرپاتے کبھی کبھی تو اذیت ناک عذاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں چیختے ہیں چلاتے ہیں۔ خوف کی فضا میں گھبراہٹ محسوس کرتے ہیں، بے بس نظر آتے ہیں۔ نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ دعا مانگتے ہیں، منہ سے الفاظ نہیں نکلتے اور کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ خواب میں سنہری اور چمکیلے لباس میں پریاں رقص کرتی ہیں نغموں کی بارش ہوتی ہے. جی چاہتا ہے کہ اگر یہ خواب ہے تو یوں ہی چلتا رہے کبھی ختم نہ ہو لیکن ہم کسی چیز پر قادر نہیں ہوتے جبکہ تصور ایک وجدانی کیفیت کا حامل ہوتا ہے انسان اس کیفیت پر قادر ہوتا ہے۔ وہ تصور میں ڈوبا رہتا ہے غرق رہتا ہے۔ وہ گہرائی میں اتر جاتا ہے پھر فضا میں تیرنے لگتا ہے۔ کوئی مشکل مشکل نہیں رہتی انسان جس طرح بھی چاہتا ہے راستے بنتے چلے جاتے ہیں بالکل ایسے ہموار راستے جو انسان کے وہم وگمان میں آسکتے ہیں۔ قید وبند کا تصور نہیں۔ رکاوٹ نہیں بندھن نہیں، راستے انجانے نہیں...... یہ سب کچھ انسان کی اپنی خواہش اور فکر کے مطابق ہوتے ہیں۔

تصور معذور شخص کی عید ہے، سکون ہے، زندگی کی لہر ہے، احساس اور خوشی کی آزادی ہے۔ تصور کسی بھی قسم کے نشے کے مترادف ہرگز ہرگز نہیں۔ کالرج کی شاعری میں یقیناً افیون کا نشہ شامل

تھا لیکن اس حالت میں اس کے تصور نے جو صورت اختیار کی وہ ایک اعلیٰ شاعری کا حصہ ہے کالرج وہاں تک پہنچ جاتا تھا جہاں تک اس کا تخیل کام کر سکتا تھا۔ یوں فضا دوسری بھی ہو سکتی ہے لیکن کالرج نے اس کا فائدہ بھی اٹھایا۔ تصور اور فکر میں تضاد نہ سہی فرق ضرور ہے۔ فکر عقل کے تابع ہوتی ہے سود و زیاں کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے جبکہ تصور آزادی کا بے پناہ تصور ہے اس میں ایک تو انسان کی مرضی کے خلاف پابندیاں نہیں ہوتیں اور اگر کہیں ایسا شائبہ ہوتا بھی ہے تو وہ جادو کے سے انداز میں خود بخود انسان کی مرضی کے مطابق ہوتا چلا جاتا ہے کہا یہ جاتا ہے کہ تصور کے عالم میں انسان عقل اور فکر کو قید کر دیتا ہے وہ ان کے وجود سے گریزاں ہوتا ہے، حد یہ ہے کہ عقل اور فکر ایک لمحہ کے لیے بھی تصور کا راستہ روکنے کی اہل نہیں رہتیں۔ انسان ڈوبنے میں زندگی کی راہیں تلاش کر لیتا ہے، تلاش کیا کر لیتا ہے وہ راستے انسان کو خود بخود کشش کرتے ہیں اور وہ ان راستوں پر فخریہ چلتا چلا جاتا ہے۔

فلسفے کی زبان میں گفتگو کریں تو مسلمان فلسفے کے نزدیک علم منطق دو قسموں پر مشتمل ہے تصور کا علم اور تصدیق کا علم جبکہ یونانی فلسفہ اس بات کو ہی نہیں مانتا تصدیق کرنے بیٹھتے ہیں تو تصور غائب ہو جاتا ہے۔ تصور تصدیق پر زمانی سبقت رکھتا ہے، ذہن انسان میں پہلے خیالی تصورات آتے ہیں اور بعد میں انہیں نفی یا اثبات کے حکم سے "جوڑا جاتا ہے" جس رشتے سے تصورات ذہن میں جوڑے جاتے ہیں وہ بھی خارج کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو۔ بنا بریں تصورات کے اس طرح باہم جوڑنے کے عمل میں کسی خاص ذہنی فعل کو کوئی دخل نہیں۔ ذہن کا کام صرف اتنا ہے کہ تصورات کے خارجی موضوعوں اور ان موضوعوں کے درمیان خارجی نسبت یا رشتے کا ادراک کرے۔ شاعر اور مزدور کے تصور میں بنیادی فرق ہوتا ہے جبکہ تصور میں پابندی کا تصور ہی نہیں ہے شاعر ہمیشہ رومان پرور ماحول سے دوچار ہوتا ہے ہزار ہا نہیں لکھو کھا داد دینے والے موجود ہوتے ہیں۔ واہ وا، سبحان اللہ، کیا خوب کہا ہے، مکرّر، پھر ارشاد ہو، جزا کلا یہ فضا خود بخود وجود میں آ جاتی ہے پھر اشعار کا نزول مسلسل ہوتا ہے آمد اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ پھر شاعر جہاں جہاں جس جس سے متاثر ہوتا ہے اپنے وجود اور فعل کو اسی طرح کا پاتا ہے بعض شعرا کے ہاں تو اس کیفیت میں اچھے اشعار کا بھی نزول ہو جاتا ہے اور جب وہ اس تصور کے سحر سے باہر نکلتے ہیں تو ان

شعار کو لکھ بھی لیتے ہیں اس لیے تصور کے لیے انسان کے ہاں بنیادی ضرورت ہے پہلے سے وہ جہاں ہے
وہاں سے ہی اور اسی راستے پر ہی گامزن ہوتا ہے۔ یہاں بھی ذہن کی رسائی اہم مسئلہ ہے، مزدور اپنی خوش
حالی کا تصور کر سکتا ہے اپنی مزدوری کے بارے میں سوچ سکتا ہے لیکن اس کے بعد کوئی بھی غیر معمولی چیز گو
کہ اس پر اس کی پابندی نہیں ہوتی لیکن نہ وہ اس کے ذہن میں آتی ہے نہ وہ اس کا تصور کرتا ہے اگر وہ
چاہے بھی تو شاید نہ کر سکے۔ دراصل راستوں کا تعین اسے ہی کرنا ہے وہ اپنے میدان میں جتنے راستے ہیں
یا راستے پیدا کئے جا سکتے ہیں ان سے واقف ہوتا ہے اس لیے اس کی مرضی کے مطابق راستے بنتے چلے
جاتے ہیں۔ وہ شاعر، انجینئر، سیاست دان، فلاسفر یا نفسیات کے ماہر کے انداز میں سوچ ہی نہیں سکتا۔
پابندی نہ ہونے کے باوجود اس طرف اس کا گزر ممکن ہی نہیں۔

سیاست دان کے تصور کی عکاسی کی جائے تو کچھ اور ہی دنیا سامنے آتی ہے۔ لاکھوں کا مجمع ہوتا
ہے اور وہ تنہا دھاڑ رہا ہوتا ہے سکوت کا عالم صرف سیاست دان کی آواز، سب مل کر زندہ باد کے نعرے لگا
رہے ہیں ملک و قوم کی خیر خواہی کے وعدے مسلسل ہو رہے ہیں۔ سیاست دان جتنے بھی جھوٹے وعدے
کر سکتا ہے کرتا ہے وہ تصور میں وعدوں کی گہرائی میں جا سکتا ہے اور جاتا ہے وہ یہی تصور کرتا ہے کہ لوگ
اس کے کئے ہوئے وعدوں کو بھول جانے کے عادی ہیں اس کی کمزوریوں پر لوگوں کی نظر نہیں پڑتی یا لوگ
چشم پوشی کے عادی ہو گئے ہیں اس نے لوگوں کو مزید بے وقوف بنانے کی صلاحیت حاصل کر لی ہے،
اسے کوئی بھی روکنے اور ٹوکنے والا نہیں۔ اس کے فریب اور چالاکیاں کھلی کھلی اور نمایاں ہونے کے باوجود
کسی کو بھی نظر نہیں آتیں۔ وہ سینہ تان کر ہر وہ بات کہتا ہے جو ممکن نہیں ہوتی اور اس پر کبھی عمل بھی نہیں
ہوتا۔ عام زندگی میں تو لوگ گندے انڈے اور سڑے ٹماٹروں سے برا حال کر سکتے ہیں، جوتوں کا ہار پہنا
سکتے ہیں، مردہ باد کے نعرے لگا سکتے ہیں، غدار قرار دے سکتے ہیں لیکن یہ کمال تصور کا ہی ہے کہ ایسا کوئی
بھی ہنگامہ وجود میں نہیں آتا۔

تصور کا تعلق براہ راست انسان کی فطرت اس کی شخصیت اور طبعی رجحان سے ہوتا ہے، تصور
فطری طور پر ان چیزوں کے تابع ہوتا ہے ہاں اس طرف جتنی بھی رکاوٹیں انسان کے ذہن میں موجود

ہوتی ہیں ہٹتی چلی جاتی ہیں، نہ صرف ہٹتی اور راستہ دیتی ہیں بلکہ حسین راستے خود بخود وجود میں آتے چلے جاتے ہیں۔ اس حوالے سے نئی نئی باتیں انسان کے ذہن میں اس طرح آتی ہیں کہ ان کی کامیابی آسان اور واضح ہوتی ہے۔ اگر انسان چاہے تو تصور کو خام مواد بنا کر اپنے مسائل حل کر سکتا ہے صرف عزم اور حوصلے کی ضرورت ہوگی۔ تصور تو صرف آئیڈیلز تیار کرتا ہے اور اس کی کامیابی کی ضمانت بھی دیتا ہے۔ راستوں کا تعین کرتا ہے۔ خوابوں کے حسن میں اضافہ کرتا ہے۔ فضا کو رومان پرور بنا سکتا ہے یقین کی دولت عطا کر سکتا ہے لیکن عمل کی دنیا سے نہیں ٹکرا سکتا۔ پاش پاش ہو جاتا ہے اس کے ٹکڑے دور دور جا کر گرتے ہیں۔ تصور تو شیشے کا نگر ہوتا ہے اور عمل پتھر۔ جہاں عمل کا دخل شروع ہوا وہاں سے تصور رفو چکر ہوتا ہوا نظر آتا ہے بالکل اس طرح جس طرح لاحول پڑھتے ہیں شیطان دور دور تک نظر نہیں آتا۔

تصور اور عمل کے تضاد سے جو چیز سامنے آتی ہے وہ بڑی معرکتہ الارا ہوتی ہے جو اں ہمت انسانوں کے لیے یہ نعمت بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ اقدار، آئیڈیلز، حسن، زندگی کے وجود میں عمل اور سعی مسلسل، یقین اور حوصلے کے ساتھ ایک نئی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے جو تعمیری بھی ہو سکتی ہے۔

تصور یقین کی فضا پیدا کرتا ہے۔ ممکنات کی مختلف صورتیں نظر آتی ہیں۔ ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ دنیا حسین و جمیل نظر آتی ہے۔ ناممکن کوئی لفظ نہیں ہے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے، حسن اپنی مختلف صورتوں میں نظر آتا ہے۔ تصور بے بس، بے سہارا، معذور، مایوس، کمزور انسانوں کے لیے لاٹھی کے سہارے سے بھی کہیں بڑا ہے وہ حوصلہ بخشتا ہے۔ وہ ایک لمحے کے لیے ہی مایوسیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ انسان کو اس بات کا یقین دلاتا ہے کہ ناممکن کوئی چیز ہی نہیں ہے، وہ ایسے آئیڈیلز کو وجود میں لاتا ہے جو عام زندگی میں کسی اور صورت میں سامنے نہیں آتے۔ کمزور انسانوں کی تمنائیں آسودہ ہوتی ہیں وہ انہیں موقع دیتی ہیں کہ اپنی مایوسی کو خیر باد کہہ دیں، اپنی کمزوریوں کو جواز نہ بنائیں۔ یہ ساری باتیں سارے آئیڈیلز ممکن ہیں جب یہ تصور میں آسکتے ہیں تو جدوجہد کرنے کے بعد انہیں آسانی کے ساتھ حاصل بھی کیا جا سکتا ہے، یقیناً قدرت ہمت کرنے والوں کا ساتھ دیتی ہے، کامیابی قدم چوم سکتی ہے۔ تصور حوصلہ بھی ہے اور سیدھے راستے کا نشان بھی ہے وہ باتیں جو ہماری زندگی میں کڑوی اور کسیلی ہوتی ہیں، ہم بھاری پتھر

سمجھ کر چوم کر چھوڑ دیتے ہیں لیکن تصور ایک حد تک جدو جہد کرنے کا جذبہ ہے وہ انسان کی ناکامی اور نامرادی کے لیے عبرت ہے یہ دوسری بات ہے کہ تصور میں پاکی داماں کی حکایت زیادہ ہی بڑھ جاتی ہے لیکن شاید انسان کی صحت کیلئے یہ بہتر بھی ہے کہ ایک لمحے کیلئے ہی سہی یقین کی فضا تو سامنے آجاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کوشش کرنے اور جدو جہد کرنے سے کامیابی بھی ہو اس حوالے سے کامیابی کو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔

تصور دراصل ایک غبارہ ہوتا ہے اس میں حسین رنگ ہوتے ہیں یہ غبارہ پھولتا ہی چلا جاتا ہے اس میں حسن و رعنائی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے اور جب یہ پھٹتا ہے تو ایک دھما کا سا ہوتا ہے انسان بکھر جاتا ہے۔ شاعر، ادیب، سیاست دان غرض ہر وہ شخص جو تصور کی سیڑھی سے آسمان کی بلندی تک پہنچتا ہے اگر اس میں عزم اور حوصلہ نہیں ہے تو وہ ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ تصور بعض اوقات مسائل کا حل بھی بن جاتا ہے الجبرے اور جومیٹری میں یہ تصور فرض کرو کہ صورت میں ہوتا ہے نہ معلوم چیز کو معلوم کرنے کے لیے اس کو فرض ہی کرنا پڑتا ہے پھر مختلف طریقوں سے اسے یقین اور ٹھوس کی شکل صورت دی جاتی ہے۔

تصور نیند کی گولی بھی ہے اس کا نشہ جب تک رہتا ہے ایک عجیب سا سرور رہتا ہے۔ ایک حسین دنیا آباد رہتی ہے۔ ایک رومان پرور فضا دنیا مافیہا سے بے خبر کر دیتی ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے ہی انسان اپنے سارے غم بھول جاتا ہے۔ دنیا میں ہر طرف رنگ بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ زندہ رہنے کو جی چاہتا ہے۔ آئیڈیلز کا وجود عمل میں آتا ہے۔ ذہن کو سکون ملتا ہے، انسان کیف و سرور میں مست ہو جاتا ہے، وہ بادشاہ بھی بن سکتا ہے۔ سیاست دان اور شاعر بھی بہت سی باتیں ایسی وجود میں آجاتی ہیں جنہیں وہ عام زندگی میں کسی صورت میں حاصل نہیں کر پاتا یہ سب کچھ تصور ہی کی دین ہے تصور جو ہر پابندی سے آزاد ہے۔

خاکہ

محمد شفیع عارف دہلوی

دلّی کا آخری یادگار مشاعرہ

دہلی علم و ادب کا گہوارہ اور اسلامی تہذیب و تمدن کا مرکز رہی ہے۔ یہ سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کا دور ہے۔ ہر چند کہ سلطنتِ مغلیہ کے اقتدار کا سورج ڈوب رہا ہے مگر اس کے باوجود قلعۂ معلّٰی میں شہزادگان اور شہر میں نوابین اور رؤسا کی بود و باش میں ابھی زندگی کے کچھ آثار پائے جاتے ہیں۔

۴؍ رجب ۱۲۶۱ھ کو نہایت تزک و احتشام کے ساتھ حویلی مبارک النساء حوض قاضی دہلی میں ایک یادگار مشاعرہ منعقد ہوا۔ یہ مغلیہ سلطنت کے دور کا آخری مشاعرہ تھا جس میں خود ظلِ سبحانی حضرت بہادر شاہ ظفر تو بوجہ علالت شرکت نہ فرما سکے تھے لیکن انہوں نے اپنا کلام بلاغت نظام بھیج کر شعراء کرام اور حاضرینِ محفل کی عزت افزائی ضرور فرمائی تھی۔ البتہ قلعۂ معلّٰی کے تمام شہزادگان اور اس دور کے تمام استادانِ فن اور نامور شعراء کرام نے جن میں حضرت شیخ محمد ابراہیم ذوق استاد محترم خلد آشیانی حضرت بہادر شاہ ظفر، مرزا اسد اللہ خاں غالب، مولوی امام بخش صہبائی، حکیم مومن خاں مومن، حافظ عبدالرحمٰن احسان، مفتی صدر الدین آزردہ، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، نواب مرزا خاں داغ، مرزا قربان علی بیگ سالک وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔

اس عالیشان مشاعرہ کا اہتمام جناب نواب زین العابدین خاں عارف نے جو مرزا غالب کے بھانجے اور شاگرد بھی تھے فرمایا تھا مگر اس کے انصرام و اہتمام میں جناب مولوی کریم الدین صاحب کی خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مشاعرہ کا ایک منظر

یہ مبارک النساء حویلی ہے جو حوض قاضی پر واقع ہے۔ سڑک کے دونوں جانب نہایت خوشرنگ نئی قناتیں لگا کر روشنی کے گلاس آویزاں کر کے رات کو دن بنا دیا گیا ہے۔ صاف ستھری سڑک پر ہزارہ سے

چھڑکاؤ کر کے اسے اس طرح سجا دیا گیا ہے جیسے کسی حسین ومہ جبیں کی صاف شفاف گلرنگ مانگ میں افشاں چھڑک دی گئی ہو۔ حویلی کے صدر دروازہ پر بڑے پھاٹک کو روشن گلابوں قمقموں اور رنگ برنگی قندیلوں سے اس طرح آراستہ کیا ہے جیسے گلزار آتشیں، دروازہ سے دہلیز تک جگمگاہٹ اور روشنی کا یہ عالم ہے کہ آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں۔

حویلی کے دَرودیوار پر سفیدی کرتے وقت ابرک بکثرت ملادی گئی تھی۔ جب چھتوں پر جھاڑ فانوس، ہنڈوں، قندیلوں اور دیواروں پر دیوار گیریوں کی روشنی ان لاتعداد ابرک کے چمکدار ذرات پر عکس ریز ہوئی تو ساری حویلی جگمگا اٹھی۔ بقعۂ نور بن گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پوری حویلی ایک نگارخانہ ہے جسے کوئی پرستان سے اٹھالایا ہے۔ حویلی کے عین وسط میں خوب صورت سبز مخمل کا کارچوبی شامیانہ گنگا جمنی۔ ریشمی طنابوں کی مدد سے ایستادہ عجیب دلفریب منظر پیش کر رہا تھا۔ شامیانے کے نیچے سفید چاندنی کا فرش۔ اس پر پھولدار قالینوں کا حاشیہ اور چاروں طرف قالینوں کے ساتھ ساتھ سبز کارچوبی گاؤتکیوں کی باڑھ۔ وسط میں سبز مخمل کی کارچوبی مسند۔ ہر کونے پر چاندی کے فانوس، سنہری اور روپہلی چوبوں پر سفید موتیا کے کلابتون سے مزین گجرے۔ دیواروں پر خوشرنگ پھولوں کے ہار لٹکے ہوئے عجیب وغریب سماں پیش کر رہے تھے، تمام مشاعرہ گاہ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ ہوا اگر عطر بیز تھی تو فضا سحر انگیز۔ اس رنگین اور پُرکیف ماحول میں اس میخانۂ شعر وسخن میں کون کافر ہے جو غزل سرا نہ ہو۔ کون میکش ہے جو توبہ نہ توڑے۔

حویلی کے ایک صحن چی میں پانی کا انتظام ہے۔ اگر ایک طرف کورے اور سوندی مٹی کے کچے گھڑے ہیں تو دوسری جانب شورے میں لگی ہوئی جست کی ٹھنڈی صراحیاں۔ دوسری صحن چی میں چاندی کے چمکدار خاصدان اور سرخ قند کی صافی میں کرارے پان رکھے ہیں۔ ایک بڑی خوبصورت سی نقشین میز پر چاندی کی چمکدار کشتی رکھی ہوئی ہے جس میں نئے لال قند کی گیلی صافیوں کی ایک تہہ میں موتیا کے پھول ہیں تو دوسری میں خوشبو سے بسی ہوئی پان کی گلوریاں۔ دوسری چھوٹی کشتیوں میں الائچیاں، چکنی ڈلیاں، بُن دھنیا اور خوب صورت شیشوں میں زعفرانی قوام۔

باورچی خانہ میں حقوں کا تمام سامان موجود تھا۔ جگہ بجگہ خُدام۔ نوکر چاکر صاف ستھرے

لباس میں ملبوس مؤدب کھڑے حکم کے منتظر تھے۔ قالینوں کے ساتھ ساتھ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر نہایت قرینے اور سلیقے سے حقے پیچ دان کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ حقوں کے درمیان جہاں جگہ خالی تھی وہاں چھوٹی چھوٹی اخروٹ کی لکڑی کی نقشین تپائیاں رکھی ہوئی تھیں جن پر چاندی کے خاصدان سجا دیئے گئے تھے۔ مسند کے سامنے چاندی کے دو شمعدان جن کے اندر کافوری بتیاں اور اوپر ہلکے سبز رنگ کے چھوٹے خوبصورت کنول، شمعدانوں کے نیچے چاندی کے چھوٹے خوب صورت لگن، لگنوں میں عرق گلاب اور کیوڑہ، جن کی وجہ سے تمام فضا رنگین و معطر تھی۔ غرض محفل کیا تھی ایک آئینہ خانہ تھا۔ جس رخ سے دیکھو ہر چیز نمایاں اور دیدہ زیب۔

حویلی آراستہ و پیراستہ۔ بالکل عروسِ نو کی طرح بنی سنوری شعراء کرام کے آمد کی منتظر تھی کہ اتنے میں مرزا کریم الدین صاحب رسا تشریف لاتے دکھائی دیئے۔ یہ سلاطین زادے ہیں۔ مُعمر ہونے کے باوجود بڑے باہمت اور وضع دار ہیں۔ مشاعرہ میں سب سے پہلے آتے اور سب کے بعد میں جاتے ہیں۔ شاعر تو واجبی سے ہیں لیکن بڑے شاعر ہونے کا غرّہ ہے مگر بے حد رحمدل، خوش اخلاق اور سادہ مزاج ہیں۔ نواب زین العابدین خاں صاحب نے جیسے ہی دیکھا فوراً تیزی سے ان بزرگ شاعر کی طرف بڑھے اور انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ابھی ان سے گفتگو جاری تھی کہ شہزادوں کا ایک گروہ جناب حافظ عبدالرحمٰن صاحب احسان کو اپنے جلو میں لیے آپہنچا۔ احسان صاحب حافظ جیو کے نام سے زیادہ معروف ہیں اور جگت استاد مانے جاتے ہیں۔ پہلے تو قلعہ کا ہر شعر کہنے والا ان کا شاگرد تھا اور یہاں ان کا طوطی بولتا تھا مگر جب سے حضرتِ ذوق نے قلعہ میں قدم رکھا ہے ان کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ تقریباً نوے برس کے پیٹے میں ہیں مگر غزل ایسی پاٹ دار آواز میں پڑھتے ہیں کہ مشاعرہ پر چھا جاتے ہیں، مصرع پر مصرع یا گرہ لگانے میں جواب نہیں رکھتے۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ سند پیش کرنے میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ ذرا کسی صاحب نے لفظ کی کسی بندش پر اعتراض کیا اور حافظ جیو نے تڑاق سے کسی استاد کا شعر بطور سند اس کے منہ پر کھینچ مارا اور معترض کی زبان بند کر دی۔ بہر حال نواب زین العابدین صاحب نے جناب احسان کو ان کے مقام اور منصب کے اعتبار سے نشست عطا فرمائی۔ آ کر بیٹھے ہی تھے کہ جناب محمد علی صاحب تشنہ

تشریف لے آئے مگر عجیب انداز بے نیازی کے ساتھ۔ بالکل برہنہ۔ مادرزاد برہنہ۔ بڑے بانکے جوان اور تیکھے نقش ونگار کے مالک ہیں۔ کبھی بڑے خوش لباس اور خوش وضع تھے۔ پھر نہ معلوم کیا انقلاب آیا کہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو گئے۔ جوانی اندھی ہوتی ہے اس کے منہ پر آنکھیں نہیں ہوتیں۔ شاید اسی عالم میں کسی مہہ جبیں نے ایک ایسی نگاہ غلط انداز سے دیکھا۔ ایک ایسا تیر مارا کہ دل میں اتر گیا اور یہ تڑپتے رہ گئے۔ سروپا کا ہوش نہ رہا مگر خوش نصیب تھے کہ عشق مجازی سے عشق حقیقی کی طرف جانکلے۔ جس سے الجھی ہوئی تمام پگڈنڈیاں جن پر خار دار جھاڑیاں بھی تھیں اور خار مغیلاں بھی اور جن پر گامزن ہو کر نہ صرف جامۂ انسانیت تارتار ہو جاتا بلکہ پارسائی بھی دم توڑ دیتی۔ توفیقِ خداوندی سے سبک روشوں میں ڈھل گئیں، قندیل آسمانی کی شبنمی چھاؤں نے سارے وجود کو سکون دوام بخش دیا۔ اور ذکرِ الٰہی میں ایسے محو اور سرشار ہوئے کہ دنیا بدل گئی۔ اب جذب ومستی اور کیف کا عالم طاری رہتا ہے۔ ہوش میں آتے ہیں تو حجابِ روئے جاناں ہو جاتا ہے۔ اس لیے دامنِ ہوش تارتار کر دیا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں نہ سر رہتا ہے اور نہ آستانہ۔ انسان معبود حقیقی کی ذات میں گم ہو جاتا ہے۔ جب فنا فی اللہ کی منزل نصیب ہو جائے تو پھر نہ ستر کا ہوش رہتا ہے نہ شریعت کی پابندی۔

موصوف بلا کے ذہین ہیں اور یادداشت تو اس غضب کی ہے کہ جو سنا یاد ہو گیا۔ ہزاروں اشعار نوکِ زبان پر ہیں۔ ایک بار تو یہ ہوا کہ ایک شاعر جو بڑے استاد بنے پھرتے تھے اور کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے تشنہ صاحب نے ان شاعر باکمال کی غزل سنی اور ضبط ذہن کر لی۔ طرحی مشاعرہ تھا۔ جب مشاعرہ شروع ہوا تو تشنہ صاحب نے ان کی غزل سر مشاعرہ پڑھ دی اور صاحب غزل سر پیٹ کر رہ گیا۔ ساری ٹر کی تمام ہو گئی۔ مگر یہ اس دور کی بات ہے جب وہ زندہ دل تھے۔ ہوش وحواس پر قابو تھا۔ اب تو ہوش میں ہی نہیں ہیں مگر ان کا کہنا یہ ہے کہ

"ہوش کھو کر بھی رہا میں ہوش والوں میں شریک   وہ تصور میں مرے آیا کئے جایا کئے"

بہر حال نواب زین العابدین نے انہیں برہنہ دیکھ کر عرض کیا۔ تشنہ صاحب یہ کیا رنگ ہے۔ فرمایا انسان کا اصل جامہ تو یہی ہے۔ اسی لباس میں آیا ہے اور اسی لباس میں جائے گا۔ پھر فرمایا مشاعرہ

کب شروع ہوگا۔ نواب صاحب نے عرض کیا حضور بہت جلد۔ بہر کیف تشنہ صاحب کو ایک گوشہ میں بٹھا دیا اور ایک دوشالہ لاکر ان پر ڈال دیا۔

الغرض آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ شعراء کرام آتے رہے اور حویلی کی شان وشوکت اور رونق میں اضافہ ہوتا گیا۔ جناب حکیم مومن خاں مومن آئے۔ ان کے ساتھ جناب آزردہ، شیفتہ، صہبائی اور جناب مولوی مملوک العلیٰ تھے۔ موخر الذکر عجیب باکمال آدمی ہیں۔ خود تو شعر نہیں کہتے مگر حسنِ مذاق اور شعر سمجھنے اور پرکھنے کا فن انہی کا حصہ ہے۔ یہ حضرات آکر بیٹھے ہی تھے کہ سامنے سے مرزا نوشہ پالکی سے اترے۔ حضرت میر علائی سالک اور جناب حزیں ان کے ہمراہ تھے۔ مرزا صاحب مومن کی طرف بڑھے، مصافحہ کیا اور فرمایا بھئی حکیم صاحب! آج محمد قاصر خاں محزوں کا عظیم آباد سے خط آیا ہے اور آپ کو سلام لکھا ہے (محزوں صاحب، میر درد کے پوتے ہیں) ہمیں ان کا دہلی چھوڑ کر چلا جانا بھلا نہ لگا۔ پھر مرزا صاحب نے فرمایا، ارے بھئی خاصی رات آگئی ہے، میاں ابراہیم نظر نہیں آرہے، آخر کب آئیں گے اور کب مشاعرہ شروع ہوگا۔ حکیم صاحب ابھی کچھ جواب دینے ہی والے تھے کہ دروازہ سے السلام علیکم کہنے کی آواز سنائی دی۔ مولانا صہبائی نے فرمایا۔ مرزا صاحب، لیجیے، وہ استاد کے ''نشانِ ہاتھی'' حافظ ویران صاحب آگئے اور وہ آپ کے دوست میاں عبد الرحمٰن ہد ہد بھی ساتھ ہیں۔ دیکھئے آج کس کے چونچ مارتے ہیں۔ یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ جناب ذوق مشاعرہ گاہ میں قدم ریز ہوئے۔ ان کے ساتھ قلعۂ معلّٰی کے شہزادے بھی تھے۔ صاحب سلامت کر کے اپنی اپنی جگہ پر تشریف فرما ہوگئے۔ استاد ذوق سب سے مل جل کر شامیانے کے دائیں جانب بیٹھ گئے۔ مشاعروں میں شعراء کرام کو ان کے مقام اور منصب کے مطابق بٹھانا بھی اپنی جگہ ایک فن ہے مگر جناب نواب زین العابدین عارف نے اس ذہانت اور سلیقے سے یہ خدمت سرانجام دی کہ کسی کو کوئی شکایت پیدا نہ ہوئی ورنہ اس معمولی سی بات پر ہی بگڑا بگڑی شروع ہو جاتی ہے اور محفل میں رنگ میں بھنگ پڑ جاتی ہے۔

محفل آراستہ ہو چکی تھی۔ نشست کا انتظام کچھ اس طرح سے تھا کہ مشاعرہ کے دائیں جانب وہ لوگ تھے جن کا تعلق قلعۂ معلّٰی سے تھا اور بائیں طرف شہر کے دوسرے اساتذہ اور ان کے تلامذہ تشریف فرما تھے۔ جناب ذوق کو آئے ہوئے چند ہی منٹ گزرے ہونگے کہ شہزادہ مرزا فتح الملک، مرزا فخر الدین

صاحب عالم، نواب مرزا خاں داغ دہلوی کے ہمراہ شاہی سواری میں آن پہنچے نواب شمس الدین خاں کی پھانسی کے بعد ان کی زوجہ یعنی مرزا داغ کی والدہ مرزا فخرو کے نکاح میں آ گئی تھیں اس لیے داغ قلعہ میں اپنی والدہ کے ہمراہ رہا کرتے تھے۔

شاہی سواری کے رکتے ہی مرزا فتح الملک گاڑی سے اترے۔ ان کا نیچے قدم رکھنا تھا کہ جملہ حاضرین نہایت ادب واحترام کے ساتھ سرو قد کھڑے ہو گئے۔ چار چوبدار جسموں پر سبز بانات کی نیچی اچکنیں پہنے سروں پر سبز پگڑیاں باندھے۔ ہاتھوں میں گنگا جمنی عصا اور مورچھل لیے آ موجود ہوئے۔ عصا بردار آگے اور مورچھل بردار پیچھے۔ مرزا فتح الملک کا یہ شاہی جلوس آہستہ آہستہ شامیانے کی طرف بڑھا۔ فتح الملک مرزا فخرو نے شامیانے کے قریب کھڑے ہو کر شاہی رکھ رکھاؤ کے ساتھ اہل محفل کا سلام لیا۔ پھر چاروں طرف نظر ڈالی۔ محفل کا ایک جائزہ لیا اور فرمایا ''اجازت ہے'' سب نے بہ آواز بلند کہا۔ بسم اللہ، بسم اللہ۔ اجازت پا کر صاحبِ عالم شامیانے کے اندر تشریف لے گئے اور سب کو سلام کر کے بیٹھ گئے اہل محفل ابھی اجازت کے انتظار میں ایستادہ تھے۔ صاحب عالم نے سب پر شفقت بھری نظر ڈال کر فرمایا تشریف رکھیے۔ سب لوگ سلام کر کے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

استاد ذوق نے داغ کو اپنے قریب ہی بٹھالیا۔ مورچھل بردار شامیانے کی پچھلی اور عصا بردار سامنے کی صف کی پشت پر نہایت ادب سے جا کھڑے ہوئے۔ یہ مرحلہ طے ہونے کے بعد نواب زین العابدین خاں آگے بڑھ اور مرزا فخرو کے پاس جا کر تسلیمات بجالائے اور دوزانو ہو کر وہیں بیٹھ گئے، چپکے چپکے صاحب عالم سے کچھ گفتگو کی اور پھر اٹھ کر اپنی جگہ پر جا بیٹھے۔ ان کے چلے جانے کے بعد صاحب عالم نے اپنے دونوں ہاتھ برائے دعا بلند فرمائے۔ اہلِ محفل نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ دعائے خیر کے بعد صاحب عالم نے اہلِ محفل سے اس طرح خطاب فرمایا۔ اے خوش نوایانِ دہلی۔ اے طوطیانِ چمن! میری کیا بساط کہ آپ جیسے اہلِ علم اور استادانِ فنِ سخن کی موجودگی میں میر مشاعرہ بننے کا خیال دل میں لاؤں۔ صرف ظلِ سبحانی، حضرت بہادر شاہ ظفر تاجدار سلطنتِ مغلیہ، کے حکم کی بجا آوری میں حاضر ہوا ہوں۔ ورنہ کہاں یہ ناچیز اور کہاں صدرِ مشاعرہ۔ اس کے بعد صاحبِ عالم نے فرمایا ''حضرات! اس مشاعرہ کی ایک تو خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کوئی طرح نہیں رکھی گئی۔ کوئی شک نہیں کہ قافیہ اور ردیف کی پابندی

کے ساتھ ایک مخصوص بحر اور وزن میں شعر کہنے سے شاعر کی پروازِ تخیل، معنی آفرینی الفاظ کی نشست و برخواست اور قادر الکلامی کا پتہ چلتا ہے مگر ساتھ ہی شعراء کرام میں غیر ضروری چپقلش اور فخر ومباہات کا دروازہ کھل جاتا ہے جسے "طرح" نہ دے کر بند کر دیا گیا ہے۔ اس مشاعرہ کی دوسری خصوصیت آپ یہ پائینگے کہ اس محفل میں بجائے ایک شمع کے دو شمعیں گردش کرینگی۔ اس طرح تقدیم وتاخیر سے جو خیالات مزاج کو مکدر کرتے تھے وہ بھی دور ہو جائینگے۔ مشاعرہ کی ابتداء کرنے یا ختم کرنے کا خیال بھی اکثر دلوں میں بدمزگی پیدا کر دیتا ہے لیکن اس مشاعرہ میں انتہا کو ابتداء اور ابتداء کو انتہا اس طرح بنایا جا رہا ہے کہ سب سے پہلے ظلِ سبحانی کا کلام معجز بیان پیش کیا جائے گا اور اس کے بعد یہ خاکپائے شعراء اپنی غزل پیش کرنے کی سعادت حاصل کر کے اس فرق کو مٹا دے گا۔ یہ چند ارشاداتِ عالیہ بیان فرما کر فتح الملک مرزا فخرو صاحب عالم نے ہاتھ کا اشارہ کیا...... دونوں چوبدار جو سامنے باادب ایستادہ تھے دونوں شمعیں اٹھا کر ان کے سامنے لے آئے اور صدرِ محفل نے بسم اللہ کہہ کر فانوس اتارے اور شمعیں جلا کر فانوس چڑھا دیئے۔ چوبداروں نے شمعوں کو لے جا کر لگنوں میں رکھ دیا اور سیدھے کھڑے ہو کر صاحب عالم کی طرف دیکھا...... انہوں نے گردن سے اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی چوبداروں نے بہ آواز بلند کہا۔

حضرات مشاعرہ شروع ہوتا ہے، اس آواز کے ساتھ ہی محفل پر ایک سکوت طاری ہو گیا۔ خادموں نے آنِ واحد میں سامنے سے حقے ہٹائے اور ان کی جگہ اگالدان، خاصدان اور بھُن دھنیے کی طشتریاں لا کر رکھیں اور اپنی اپنی جگہ جا کر کھڑے ہوئے۔ اتنے میں ظل سبحانی حضرت بہادر شاہ ظفر کا خواص قلعۂ معلیٰ سے ان کی غزل لے کر حاضر ہوا۔ نقیب پیچھے رہے وہ خود شمع سے ذرا فاصلہ پر صاحب عالم کے حضور کورنش بجالایا اور غزل سرا ہونے کی اجازت طلب کی۔ صاحب عالم نے جو صدر مشاعرہ تھے اجازت مرحمت فرمائی۔ وہ وہیں دوزانوں ہو کر بیٹھ گیا۔ نقیبوں نے آواز لگائی اعلان کیا۔ حاضرین! ظلِ سبحانی حضرت بہادر شاہ ظفر کا کلام بلاغت نظام پیش کیا جا رہا ہے۔ تمام حاضرین مودب ہو کر گوش بر آواز ہو گئے اور اپنی باوقار گردنیں سطوتِ شاہی کے احترام میں جھکا دیں۔

خواص نے بادشاہ سلامت کی غزل خریطے سے نکالی، اس کو چوما آنکھوں سے لگایا اور ایسی بلند، پُرسوز اور دل گداز آواز میں پڑھا کہ ایک سماں بندھ گیا۔ ساری محفل پر ایک مدہوشی اور سرشاری کی سی

کیفیت طاری ہوگئی۔ الفاظ کی نشست و برخواست، مضمون کی بلندی، برجستگی، معنیٰ آفرینی، آواز کا سوز اور پھر اندازِ ادائیگی سب نے مل کر تمام شعراء کرام کے دلوں کو چیر کر رکھ دیا۔ ہر شخص پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری تھی او مقطع نے تو قیامت برپا کردی۔ ہر شاعر کیا مبتدی اور کیا منتہی سب ہی جھوم رہے تھے۔ پڑھنے والا پڑھتے پڑھتے نڈھال ہوگیا لیکن مقطع کی فرمائش بدستور جاری رہی۔ غزل ملاحظہ فرمایئے۔

نہیں عشق میں اس کا رنج ہمیں، کہ قرار و شکیب ذرا نہ رہا
غم عشق تو اپنا رفیق رہا، کوئی اور بلا سے رہا نہ رہا

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر، رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر، تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

ہمیں ساغرِ بادہ کے دینے میں اب کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
کہ یہ عہدِ نشاط، یہ دورِ طرب نہ رہیگا جہاں میں سدا نہ رہا

لگے یوں تو ہزار ہی تیر ستم کہ تڑپتے رہے پڑے خاک پہ ہم
ولے ناز و کرشمہ کی تیغ دو دم لگی ایسی کہ تسمہ لگا نہ رہا

ظفر آدمی اس کو نہ جانئے گا ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

غزل پڑھنے کے بعد خواص نے غزل صدرِ مشاعرہ کی خدمت میں پیش کردی۔ زرافشاں کاغذ پر یہ معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے موتی جڑ دیئے ہوں، یہ غزل ظلِ سبحانی آخری تاجدار سلطنتِ مغلیہ نے خود اپنے قلم سے جس میں پوری قلمرو کے دلوں کی دھڑکنیں مضمر تھیں سپرد قرطاس کی تھی۔ صدرِ مشاعرہ نے غزل ہاتھ میں لے کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ مملوک العلیٰ نے ادب سے سینہ پر ہاتھ رکھ کر عرض کیا۔ صاحب عالم! ہمیں اپنی کم مائیگی علم، تہی دامنی اور بے بضاعتی کا شدید احساس ہے۔ ہمارے پاس الفاظ نہیں کہ ظلِ سبحانی کے کلام بلاغت و معجز نظام کی کماحقہ تعریف و توصیف کرسکیں۔ البتہ اس نوازش شاہی کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو اعلیٰ حضرت ظلِ سبحانی نے غزل بھیج کر حاضرین مشاعرہ پر مبذول فرمائی ہے۔ ہماری

دست بستہ گذارش ہے کہ بارگاہِ جہاں پناہی میں ہماری طرف سے شکریہ پیش کر کے ہماری عزت فرمائی جائے۔ مرزا فخرو صدرِ مشاعرہ نے خواص کی جانب دیکھا۔ اس نے عرض کی قبلۂ عالم یہ غلام جاتے ہی یہ پیام ظلِ سبحانی کی بارگاہِ عالیہ میں پیش کر دے گا۔

خواص آداب بجالا کر رخصت ہوا ہی چاہتا تھا کہ صاحب عالم نے فرمایا۔ یہاں جانے سے پہلے ایک خدمت اور انجام دیتے جایئے۔ سرکار عالی وقار ولی عہد بہادر کی غزل بھی پڑھتے جایئے (اس وقت شہزادہ جواں بخت ولی عہد سلطنت تھے ان کے انتقال کے بعد مرزا فخرو ولی عہد ہوئے تھے)۔ ان کا حکم تھا کسی خوش گلو سے پڑھوا دینا۔ اس کلام کے لیے بھلا تم سے زیادہ موزوں کون ہوگا۔ یہ کہہ کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور غزل نکال کر خواص کو دے دی اور اس نے یہ غزل سنائی۔

دل سے لطف و مہربانی اور ہے — مہر بانی کی نشانی اور ہے
قصۂ فرہاد و مجنوں اور ہے — عشق کی میرے کہانی اور ہے
روکنے سے کب مرے رکتے ہیں اشک — بلکہ ہوتی خوں فشانی اور ہے
ہم سے اے دارا وہ کب ہوتے ہیں صاف — ان کے دل میں بد گمانی اور ہے

غزل تو انتہائی پھُس پھُسی تھی مگر ولی عہد بہادر کے نام کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ کس کی ماں نے دھونسہ کھایا ہے کہ تعریف نہ کرتا مگر جناب مومن اور مرزا غالب خاموش بیٹھے رہے سب ان کے مزاج اور حق گوئی سے واقف ہیں۔ کس کا دل گردہ تھا کہ ان پر کوئی اعتراض کرتا۔ الغرض اب دوسرے شعراء کرام کی باری آئی۔ مرزا فخرو نے چوبدار کو اشارہ کیا، اس نے دونوں شمعیں لاکر شامیانے کے سامنے رکھ دیں۔ صاحب عالم نے غزل اپنی جیب سے نکالی۔ شعراء کرام پر ایک نظر ڈالی اور فرمایا۔ میری کیا بساط کہ آپ جیسے استادانِ فن کے سامنے اپنی تک بندی پیش کروں اور داد کا طالب ہوں، بہرحال جو بُرا بھلا کہا ہے بہ نظر اصلاح پیش کرتا ہوں، ملاحظہ فرمایئے

غم وہ کیا ہے جو جاں گزا نہ ہوا — درد وہ کیا جو لا دوا نہ ہوا
درد کیا جس میں کچھ نہ ہو تاثیر — بات کیا جس میں کچھ مزا نہ ہوا

شکوۂ یار اور زبانِ رقیب کھیل ٹھہرا کوئی گلا نہ ہوا
پھر تمہارے ستم اٹھانے کو مرزا اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

مرزا فخرو کی آواز تو زیادہ اونچی نہ تھی مگر پڑھنے میں ایسا درد اور سوز تھا کہ سننے والوں کے دل بے قابو ہو گئے ماشاءاللہ۔ سبحان اللہ کی صداؤں سے مشاعرہ گونج اٹھا۔ دوسرے شعر کو غالب اور تیسرے کو مومن نے بہت پسند فرمایا اور تعریف کی۔ استاد ذوق خوش تھے کہ شاگرد کی تعریف دراصل استاد کی تعریف وتوصیف ہے۔ مرزا فخرو نے اٹھ کر سلام کیا اور فرمایا یہ آپ کی نوازش ہے۔ بندہ نوازی ہے، ورنہ من آنم کہ من دانم جدھر نظر جاتی لوگ داد و تحسین پیش کرتے اور صاحب عالم اہل علم اور استادان فن کو سلام کرتے۔ جب محفل ذرا ٹھنڈی ہوئی تو صاحب عالم نے چوبدار کو اشارہ کیا۔ اس نے شامیانے کے سامنے سے ایک شمع اٹھا کر سامنے کی صف میں مرزا علی بیگ نازنین کے سامنے رکھ دی۔ ادھر شمع رکھی گئی ادھر نواب زین العابدین نے آواز دی ''اوڑھنی لاؤ''۔ ایک خادم فوراً ایک گہرے سرخ رنگ کی اوڑھنی جو کلابتون منقش اور گوٹے کناری کے ماہی پشت کے جال سے کسی ہوئی تھی لیکر حاضر ہوا۔ نازنین گورے چٹے رنگ کے خوبصورت نوجوان ہیں بھرے بھرے جسم اور چوڑے چکلے سینے کے ابھار سے معلوم ہوتا تھا کہ کسرتی جسم ہے۔ نازنین نے ایک انداز کافرانہ کے ساتھ اس کو اوڑھا۔ ایک پلو کا بُکل مارا اور دوسرا پلو سامنے پھیلا لیا۔ اس لباس اور وضع قطع سے نازنین کی ذات اور ہیئت بدلی بدلی سی نظر آنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ واقعی ایک حسینۂ محشر طراز آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ غزل اس ناز و انداز اور ادائے دلبری سے پیش کی کہ سب عش عش کرنے لگے۔ اس پر ترت نے قیامت مچادی۔ جسم کی لچک اور لوچ کو اس عشوے اور غمزے کے ساتھ نمایاں کیا کہ کوئی خاندانی طوائف بھی کیا کرے گی۔ چونکہ یہ اندازِ غزل سرائی مشاعروں کی عام روش سے بالکل ہٹ کر تھا اس لیے غالب، مومن اور دیگر اساتذہ پیکرِ ضبط بنے بیٹھے رہے نہ ہوں، نہ ہاں۔ بالکل مہر بہ لب۔ جس کے صاف معنی یہ تھے کہ یہ فعل ناپسندیدہ تھا۔ لیکن شہزادے بہت خوش تھے۔ قلعۂ معلیٰ کی محفل رقص و سرور میں کبھی کبھی یہ رنگ دیکھنے میں آجاتا تھا۔ مشاعروں میں ہرگز نہیں۔ مگر آج یہ کسر بھی پوری ہوگئی۔ حضرت نازنین کے تین شعر آپ بھی سن لیں۔

اس سے ترت اور شعر کے ادا کرنیکا انداز بھی سامنے آجائے گا۔

ہوئی عشاق میں مشہور یوسف ساجواں تا کا　　ہُوا ہم عورتوں میں تھا بڑا دیدہ زلیخا کا

مجھے کہتی ہے باجی تو نے تا کا چھوٹے دیور کو　　نہیں ڈرنے کی میں بھی ہاں نہیں تا کا تو اب تا کا

اگر اے نازنیں تو دبلی پتلی کامنی سی ہے　　چھریرا سا بدن نام خدا ہے تیرے دُلہا کا

اس مرحلہ کے بعد دونوں شمعیں گردش کرنے لگیں مگر اس طرح کہ پہلی صف کی دائیں جانب سے ایک شاعر غزل پڑھتا تھا اور بائیں جانب سے دوسرا۔ مشاعرہ چلتا رہا۔ شعراء کرام اپنے اپنے مقام اور منصب پر غزل سرا ہو کر بلندیِ شعر اور معیار کلام کے مطابق داد حاصل کرتے رہے۔ اس دوران جن حضرات نے اپنا کلام عطا فرمایا ان کے اسمائے گرامی ہیں۔ عبداللہ خاں اوج، محمد یوسف تمکیں۔ غلام احمد تصویر، محمد حسین بسمل، قادر بخش صابر، میر حسن تسکین، خواجہ حسین بیدل، جارج پیس شور، محمد عسکری نالاں، غلام مُحی الدین اشکی، کریم الدین رسا، حکیم سکھا نند رقم، مرزا حاجی بیگ شہرت وغیرہ وغیرہ۔

اس کے بعد شمع ایک ایسے شخص کے سامنے آئی جو خود شاعر جس کا باپ شاعر، جس کا بھائی شاعر۔ پورا خاندان شاعر یعنی میاں باقر علی جعفری فخر الشعراء، نائب نظام الدین ممنون کے چھوٹے بھائی ملک الشعراء فخر الدین منت کے چھوٹے صاحبزادے۔ ان کے کلام میں زور بیان نہ ہوگا تو کس کے ہوگا۔ دو شعر ملاحظہ فرمائیں:

تیغ یوں دل میں خیالِ نگہہ یار نہ کھینچ　　ناخدا ترس، تُو کعبے میں تو تلوار نہ کھینچ

بے سروپا چمن و دشت میں عالم کے نہ پھر　　ناز ہر گل نہ اٹھا، منتِ ہر خار نہ کھینچ

آج کل تو اس تیور اور اس انداز کے شعر سننے اور دیکھنے میں نہیں آتے مگر وہ دور اہلِ علم کا دور تھا اس قسم کے اشعار کہنا بڑی فنکاری اور پختہ کاری تصور کی جاتی تھی۔ مشاعرہ ماشاء اللہ، سبحان اللہ کی صداؤں سے گونج اٹھا۔ غالب نے بہت داد دی، ذوق اور مومن بھی سر دھنتے رہے۔

اس کے بعد محمد علی تشنہ کی باری آئی چونکہ یہ بالکل برہنہ بیٹھے تھے اس لیے چوبداران کے سامنے شمع رکھتے ہوئے جھجکا، ہچکچایا۔ جب یہ آئے تھے تو نواب زین العابدین خاں نے ان کے جسم پر دوشالہ ڈلوا

دیا تھا مگر ان کی اضطراب آ گئیں۔ کیفیت اس کی متحمل نہ ہو سکی۔ چوبدار نے پلٹ کر نواب صاحب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ انہوں نے اشارہ کیا اور اس نے شمع حضرت تشنہ کے سامنے رکھ دی۔ جب روشنی ان کی آنکھوں پر پڑی تو انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ ایک جُھرجھری لی اور دو زانو ہو کر سنبھل کر بیٹھے۔ شعراء کرام پر ایک نظر ڈالی اور انتہائی جذب و کیف کے عالم میں فرمایا۔ حضرات! چند اشعار سماعت فرمائیں اور یہ کہہ کر شمع گل کر دی اور پھر نہایت ہی دل گیر اور دل گداز انداز میں یہ غزل عنایت فرمائی:

آنکھ پڑتی ہے کہیں، پاؤں کہیں پڑتا ہے	سب کی ہے تمکو خبر، اپنی خبر کچھ بھی نہیں
شمع ہے گل بھی ہے بلبل بھی ہے پروانہ بھی	رات کی رات یہ سب کچھ ہے سحر کچھ بھی نہیں
حشر کی دھوم ہے سب کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے	فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں
نیستی کی ہے مجھے کوچہ ہستی میں تلاش	سیر کرتا ہوں اُدھر کی کہ جدھر کچھ بھی نہیں
ایک آنسو بھی اثر جب نہ کرے اے تشنہ	فائدہ رونے سے اے دیدۂ تر کچھ بھی نہیں

نصف شب گزر چکی تھی، زمین سے لے کر آسمان تک ساری فضا پر ایک سکوت طاری تھا۔ اس رات کے سناٹے میں ایسے ''پُر کشش ترنم اور مخصوص انداز میں ہاتھ جھٹک کر تشنہ صاحب کا یہ کہنا'' ...... کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں۔ اس نے محفل کی محفل کا نقشہ بدل دیا۔ غزل کا مضمون۔ آدھی رات کا سماں۔ اور شاعر کی کیفیت، سب نے مل کر دلوں کو چیر کر رکھ دیا۔ ادھر جناب تشنہ یہ کہتے ہوئے اور ہاتھ جھٹکتے ہوئے'' کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں'' بے خودی کے عالم میں مشاعرہ گاہ سے باہر نکل گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری محفل سحر زدہ ہو گئی ہے۔ شاعر کی آواز اور اس کی حالت دیر تک قلب و نظر کو برماتی رہی۔ جب ذرا رنگ بدلا تو مرزا فخر الدین نے شمع منگوا کر روشن کی اور چوبدار سے کہا کہ ''شمع حافظ محمد حسین بسمل کے سامنے رکھ دے'' بھلا حضرت تشنہ کے بعد ان کا کیا رنگ جمتا۔ بہر حال انہوں نے غزل عطا فرمائی سوائے مقطع کے کسی اور شعر میں لطف نہیں آیا، مقطع ملاحظہ فرمائیے:۔

پیرِ مغاں نے بسملِ میکش کو دیکھ کر شیشہ بغل میں ہاتھ میں ساغر اٹھا لیا

اس کے بعد شمع جناب محمد حسین تائب کے سامنے آئی۔ تائب حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز

محدث دہلوی کے بھتیجے اور فخر الشعراء حضرت نظام الدین ممنون کے شاگرد ہیں اور بہت اچھا شعر فرماتے ہیں، دو شعر ملاحظہ فرمائیے:۔

کہیئے اس بُت کو مُشابہ کس کے　　دیکھ کر جس کو خدا یاد آیا

عہدِ پیری میں جوانی کی اُمنگ　　آہ کس وقت میں کیا یاد آیا

دونوں اشعار پر بے حد داد ملی۔ اس کے بعد شمع گردش کرتی ہوئی حضرت ذوق کے استاد غلام رسول شوق کے سامنے آئی، بوڑھے آدمی ہیں۔ شاہ نصیر کے تلامذہ میں سے ہیں۔ ابتداء میں جناب ذوق نے انہی سے اصلاح لی تھی۔ چاہتے ہیں کہ استاد ذوق اب بھی انہیں اپنی غزل دکھائیں۔ بہرحال پوری غزل میں صرف مطلع کام کا تھا۔ ملاحظہ کیجیے۔

لکھا ہوا ہے یہ اس مہہ جبیں کے پردے میں　　نہیں ہے کوئی اب ایسا زمیں کے پردے میں

اس کے بعد شمع مرزا جمعیت شاہ ماہر کے سامنے رکھ دی گئی، یہ شاہ عالم بادشاہ غازی کے پوتے اور جناب صابر کے شاگرد ہیں۔ شعر بہت اچھا کہتے ہیں۔ دو اشعار ملاحظہ فرمائیں:۔

ہم بھی ضرور کعبہ کو چلتے پر اب تو شیخ　　قسمت سے بتکدے ہی میں دیدار ہو گیا

اے ہم نشیں یہ حضرت ماہر نہ ہوں کہیں　　اک پارسا سنا ہے کہ مے خوار ہو گیا

دونوں شعر بہت پسند کیے گئے اور بڑی داد ملی۔ ان کے بعد شمع قاضی نجم الدین برق کے سامنے آئی۔ پہلے مومن سے اصلاح لیتے تھے پھر انہی کے حکم پر حضرت تسکین سے مشورہ لینے لگے۔ شعر خوب کہتے ہیں اور خوب پڑھتے ہیں۔ غزل کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے:۔

بزم اغیار ہے ڈر ہے نہ خفا تُو ہو جائے　　ورنہ اک آہ میں کھینچوں تو ابھی ہُو ہو جائے

حرم و دیر کے جھگڑے تیرے چھپنے سے پڑے　　ورنہ تُو پردہ اٹھا دے تو، تُو ہی تُو ہو جائے

تُو تو جس خاک کو چاہے وہ بنے بندۂ خاص　　میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تُو ہو جائے

ہو نہ ہو بس میں کوئی، کچھ نہیں اس کی پروا　　دلِ بیتاب پہ اے برق جو قابُو ہو جائے

سبحان اللہ کیا مرصع غزل ہے۔ سارے ماحول پر ایک بے خودی طاری تھی۔ لوگ بار بار یہ

مصرع پڑھ رہے تھے کہ "میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تو ہو جائے"۔ ساری محفل پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری تھی۔ جملہ استادانِ فن سر دُھن رہے تھے۔ اس غزل کی تعریف ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ شمع مرزا فسوں کے سامنے بڑھا دی گئی۔ یہ مرزا کریم بخش مرحوم کے فرزند اور حضرت ظلِ سبحانی کے نواسے ہیں۔ ابھی خیر سے جوان ہیں مگر غزل لاجواب کہتے ہیں۔ قلعۂ معلّیٰ میں رہتے ہیں۔ اس لیے زبان پر بلا کی قدرت ہے۔ غزل ترنم سے پڑھتے اور محفل پر چھا جاتے ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ فرمالیجیے۔

کچھ آپ ہی آپ دل یہ مرا بیٹھا جائے ہے　　　ظاہر میں تو الٰہی میں بیمار بھی نہیں

مرزا فسوں کے بعد شمع جس شاعر کے سامنے رکھی گئی واقعی وہ مایہ ناز شاعر ہے گو ابھی جوان ہے مگر شعر میں ایسی پختگی ہے کہ بہت سے کُہنہ مشق شعراء کو بھی یہ نصیب نہیں ہوتی۔ یہ ہیں جناب مرزا باقی علی بیگ سالک، شمع کا ان کے سامنے رکھا جانا تھا کہ تمام شعراء سنبھل کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے بھی انگرکھے کی آستینیں الٹیں۔ ٹوپی درست کی۔ مرزا نوشہ کی طرف دیکھا۔ جب ادھر سے اشارہ مل گیا تو صاحبِ عالم سے اجازت طلب کی۔ مرزا فخر الدین نے فرمایا۔ میاں سالک غزل عطا فرمایئے۔ سالک صاحب نے جیب سے ایک کاغذ نکالا......اور عرض کیا حضور ملاحظہ فرمایئے:۔

انتہا صبر آزمائی کی　　　ہے درازی شبِ جدائی کی

ہے برائی نصیب کی کہ مجھے　　　تم سے امید ہے بھلائی کی

نقش ہے سنگِ آستاں پہ ترے　　　داستاں اپنی جبہ سائی کی

کتنے عاجز ہیں ہم کہ پاتے ہیں　　　بندے بندے میں بُو خدائی کی

رہ گئیں دل میں حسرتیں سالکؔ　　　آ گئی عمر پارسائی کی

مشاعرہ چمک اٹھا۔ ہر شخص واہ، واہ سبحان اللہ کہہ رہا تھا۔ استاد ذوقؔ نے فرمایا۔ میاں سالک جبہ سائی شعراء باندھتے آئے ہیں مگر تمہاری داستان کو کوئی نہیں پہنچتا۔ مومنؔ نے کہا میاں ابھی تو خیر سے جوان ہو قطع میں بڑھاپے اور پارسائی کا ذکر کچھ عجب سا لگتا ہے۔ سالک نے جواب دیا حضور میں تو جوانی

ہی میں عمرِ طبیعی کو پہنچ گیا ہوں اور اگر ایسا نہیں بھی ہے تو بھی آئے ہوئے مضمون کو کل پر کیوں چھوڑ دوں۔ پتہ نہیں کل آئے یا نہیں آئے۔ یہ اہل علم کا اجتماع تھا۔ موتی بکھر رہے تھے۔ ادب ڈھل رہا تھا۔ نغمے پھوٹ رہے تھے۔ اربابِ ذوق ان لولوئے آبدار کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹ رہے تھے۔ جھولیاں بھر رہے تھے۔ ہائے کیا دور تھا۔۔ان کے بعد جناب نواب زین العابدین خاں عارفؔ کے سامنے شمع رکھ دی گئی۔ان بیچارے کو مشاعرہ کے انتظام سے کہاں اتنی فرصت تھی کہ غزل کہتے۔ بہر حال چلتے پھرتے جو دو چار شعر کہے تھے پیش کر دیئے۔فرماتے ہیں:

اٹھتا قدم جو آگے کو اے نامہ بر نہیں　　پیچھے تو چھوڑ آئے کہیں اُس کا گھر نہیں

غضب کا مطلع ہے۔استاد احسانؔ نے فرمایا میاں سبحان اللہ۔ کیا تیور ہیں۔ شعر کہتے کہتے اور سنتے سنتے بوڑھا ہو گیا ہوں مگر یہ مضمون بالکل نیا ہے اور عجیب رخ سے کہا ہے۔ مزا آ گیا۔ان نواب زادہ کے بعد شمع مولانا صہبائی کے سامنے لائی گئی۔ان کی علمیت اور شاعری کا ڈنکا پورے ہندوستان میں بجتا ہے۔ ہزاروں شاگرد ہیں جو ریختی میں کہتے ہیں۔ مولانا سب کو اصلاح دیتے ہیں اور خوب دیتے ہیں۔ ایسے باکمال اور صاحب فن لوگ بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔مگر خود فارسی میں شعر کہتے ہیں۔اس موقع پر بھی جہاں اُردو غزل کا دور چل رہا تھا انہوں نے فارسی ہی میں غزل عنایت فرمائی جس کی خوب خوب تعریف ہوئی مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ مزا نہیں آیا۔جس مشاعرہ میں اردو زبان کے چار ناخدا۔۔یا تاجدارانِ اقلیم سخن ریختی۔۔ جناب مرزا خاں داغؔ۔حکیم مومن خاں صاحب،مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ اور حضرت ابراہیم ذوقؔ، اُستادِ ظلِ سبحانی حضرت بہادر شاہ ظفرؔ موجود ہوں۔اور اُردو زبان کا بول بالا ہو۔۔ وہاں فارسی زبان کو بالادستی کیسے نصیب ہوتی۔ بیچاری ایرانی حسینہ کی طرح شرما کر رہ گئی۔ بہر حال تین شعر ملاحظہ فرمائیے:

ہمچو شبنم خویش را فارغ ز عالم ساختم　　محرمِ خورشید گشتم با خساں کم ساختم

کفر در کیشم سپاسِ نعمتِ دیدار اُوست　　جلوہ در ہر رنگ دیدم گرد نے خم ساختم

نیست صہبائی چو جام جم نصیبم گو مباد　　مے ز خونِ دل کشیدم خویش را جم ساختم

اس کے بعد شمع جناب نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے سامنے آئی۔ان کا شمار اساتذہ میں کیا جاتا ہے مگر خود حضرت مومن کے شاگرد ہیں۔فن شعر گوئی پر بڑی گہری نظر ہے۔ کہتے بھی خوب ہیں اور سمجھتے بھی خوب ہیں۔جس شعر کی تعریف کر دی اس کی وقعت کو چار چاند لگ گئے اور جس شعر کو سن کر خاموش ہو گئے وہ شعر دوسروں کی نظروں سے بھی گر گیا۔الفاظ کی نشست و برخواست، معنیٰ آفرینی، قدرت تخیل ہر چیز لاجواب اور فنِ شعر گوئی کا نادر و نایاب نمونہ پاٹ دار آواز۔ پڑھنے کا انداز ایسا کہ ہر لفظ الگ الگ۔ شعر ایسا جو سنے جھوم اٹھے۔ بہر کیف شیفتہ نے ٹوپی کو درست کیا۔انگر کھے کی آستین چڑھائیں۔ارباب ذوق اور استادانِ فن پر ایک نظر ڈالی اور یہ غزل عطا فرمائی:

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں	گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں
معنی کی فکر چاہیے صورت سے کیا حصول	کیا فائدہ ہے موج اگر ہے شراب میں
وہ قطرہ ہوں کہ موجۂ دریا میں گم ہوا	وہ سایہ ہوں کہ محو ہوا آفتاب میں
بیباک شیوہ، شوخ طبیعت ، زباں دراز	ملزم ہوا ہے پر نہیں عاجز جواب میں
تکلیف شیفتہ ہوئی تم کو مگر حضور	اس وقت اتفاق سے وہ ہیں عتاب میں

ساری غزل مرصع ہے۔جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔رات بہت ہو چکی تھی۔لوگوں پر نیند کا خمار چھایا ہوا تھا مگر حضرت شیفتہ کی غزل نے مشاعرہ میں ایک قیامت برپا کر دی۔تمام اساتذہ گوش بر آواز اور محوِ تحسین تھے۔

حضرت شیفتہ کے بعد شمع مفتی صدر الدین آزردہ کے سامنے لائی گئی۔مفتی صاحب کے شاگردوں میں بڑے بڑے جید عالم بھی شامل ہیں اور شاعر بھی۔ بہت نفیس اور خوب صورت شعر فرماتے ہیں مگر پڑھتے اس طرح ہیں جیسے شاگردوں کو سبق دے رہے ہوں لیکن ان کی وجاہت وشخصیت کا عالم یہ ہے کہ جب کلام عطا فرماتے ہیں تو شعراء کرام گوش بر آواز اور محفل پُر سکوت ہو جاتی ہے۔ ہر شخص داد دینے میں بڑا احتیاط رویہ اختیار کرتا ہے البتہ مرزا نوشہ کی بے تکلفی اور شاعرانہ نوک جھونک چلتی رہتی ہے۔کلام میں بلا کی پختگی اور بلاغت ہے۔غزل ملاحظہ فرمایئے:

باتوں سے میری کب تہہ و بالا جہاں نہیں ‏ کب آسماں زمین و زمیں آسماں نہیں
افسردہ دل نہ ہو درِ رحمت نہیں ہے بند ‏ کس دن کھلا ہوا درِ پیر مغاں نہیں
کہتا ہوں اس سے کچھ میں نکلتا ہے منہ سے کچھ ‏ کہنے کو منہ میں ہے بھی زباں اور زباں نہیں
اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں ‏ اک جان کا زیاں ہے سوا ایسا زیاں نہیں
آزردہ ہونٹ تک نہ ہلے اس کے روبرو ‏ مانا کہ آپ سا کوئی جادو بیاں نہیں

تمام مشاعرہ واہ، واہ اور سبحان اللہ کے نعروں سے گونج اٹھا۔ لوگوں میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔

حضرت آزردہ جیسے مستند شاعر اور جید عالم کے بعد ایک نوعمر شاعر کا جس کی عمر ابھی صرف ۱۷۔۱۸ سال کی تھی پڑھنا کچھ عجیب سا لگتا تھا۔ مگر اس نونہال اور نوجوان شاعر کے زور بیان اور شاعرانہ عظمت کے سب ہی قائل تھے۔ اسی لیے کسی استاد یا حضرت آزردہ جیسے پائے کے شاعر کی زبان پر بھی اس نوجوان شاعر کو۔ بعد میں پڑھوانے کا شکوہ نہیں آیا۔ بلکہ سب لوگ نہایت خندہ پیشانی سے مشتاقِ دید اور منتظرِ سخن ہو گئے۔ یہ تھے جناب داغ دہلوی جن کی زبان کی چاشنی، شوخی اور مضمون کی رنگینی نے محفل میں ایک ہلچل مچادی۔ ایسی مرصع غزل ایسی جرأت اور بیباکی سے پیش کی کہ استادانِ فن بھی حیرت زدہ رہ گئے۔ سب کا یہی خیال تھا کہ یہ شاعر دنیائے شعر و سخن میں ایک منفرد مقام حاصل کر کے رہے گا۔ اور پھر زمانے نے دیکھا کے داغ کے اشعار سند کے طور پر پیش کیے جانے لگے۔ آیئے اس شاعر کی جولانیٔ طبع دیکھیں کہ یہ کیا کہتا ہے:۔

ساز یہ کینہ ساز کیا جانیں ‏ ناز والے نیاز کیا جانیں
پوچھیئے میکشوں سے لطف شراب ‏ یہ مزا پاکباز کیا جانیں
جو رہ عشق میں قدم رکھیں ‏ وہ نشیب و فراز کیا جانیں
کب کسی در کی جبہ سائی کی ‏ شیخ صاحب نماز کیا جانیں
جن کو اپنی خبر نہیں اب تک ‏ وہ مرے دل کا راز کیا جانیں
جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے ‏ آپ بندہ نواز کیا جانیں

شب اپنی تاریکیاں اور وقت کی مہیب ظلمتیں اپنے دامن میں سمیٹے دبے پاؤں اُفق کے اُس

پار جا رہی تھی اور نور صبح صادق فضائے بسیط پر چھا رہا تھا۔ بادِ نسیم کے خوشگوار جھونکے۔ حویلی کا عطر بیز ماحول۔ داغ کی بھولی بھالی صورت۔ مترنم آواز اور پھر یہ حسین غزل سب نے مل کر ایک قیامت برپا کر دی۔ ہر شخص ایک اندازِ والہانہ میں جھومتا نظر آتا تھا۔ ماشاء اللہ، سبحان اللہ کی پُر جوش صداؤں سے مشاعرہ گونج رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حویلی کی چھت اڑ جائے گی۔ یہ اہلِ علم کا اجتماع تھا۔ فن کے قدردان جمع تھے۔ فن کسی کی میراث نہیں ہوتی۔ یہ انسان کی محنت کا ثمرہ ہوتا ہے۔ عطائے خداوندی ہے وہ جس کو چاہے عطا فرما دے۔ امیر غریب چھوٹے بڑے کی تخصیص نہیں ہوتی۔ بڑے بڑے استادانِ فن محوِ حیرت تھے کہ اس لڑکے نے کیا غزل پڑھی ہے، مشاعرہ لوٹ لیا۔

حضرت داغ کے بعد جب شمع جناب حکیم مومن خاں مومن کے روبرو لائی گئی۔ تو لوگوں نے خاموشی اختیار کی اور استادانِ فن سنبھل کر بیٹھے۔ فضا پر ایک سکوت سا طاری ہو گیا۔ معلوم ہوتا تھا کوئی دربار ہو رہا ہو۔ کسی کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے اور بلا ضرورت بولنے کا یارا نہیں۔ حکیم صاحب کا رُعب اور طنطنہ دیکھنے دکھانے کے لائق تھا کوئی چالیس سال کی عمر، کشیدہ قامت، سرخ و سپید جاذبِ نظر چہرہ۔ بڑی بڑی روشن غلافی آنکھیں۔ خنجر کی طرح تنی ہوئی بھنویں۔ لمبی سُتواں ناک۔ پتلے پتلے ہونٹ اور ان پر پان کا لاکھا۔ مسّی آلود دندان، ہلکی ہلکی مونچھیں، خشخاشی داڑھی، بھرے بھرے بازو، چوڑا سینہ، سر پر گھونگر والے بال، کاکل یا دراز زلفیں، چوڑے چکلے کندھوں پر آویزاں، خوبصورت سڈول جسم پر ہلکا شربتی ململ کا نیچی چولی کا انگرکھا، گلے میں سیاہ رنگ کی ریشمیں ڈوری، جس میں سنہری تعویز۔ کمر میں لپٹا ہوا بل دار دوپٹہ۔ سرخ گلبدنی کا پاجامہ، مہرلوں پر سے تنگ، سر پر گلشن کی خوب صورت دو پلڑی ٹوپی۔ کنارے پر پتلی باریک سنہری لیس۔ غرض نہایت خوش پوشاک اور جامہ زیب، آدمی دیکھے تو دیکھتا ہی رہ جائے۔

تو یہ ہیں جناب حکیم مومن خاں مومن جن کی نازک خیالی، معنی آفرینی اور غزل کے بانکپن پر غالب جیسا عظیم خوددار اور غیور شاعر مرمٹا اور ان کے ایک شعر پر اپنا پورا دیوان نذر کرنیکے لیے تیار ہو گیا۔ مومن کی یہ شاعرانہ عظمت اپنی جگہ...... مگر میرا خیال ہے کہ مومن کی یہ بدنصیبی تھی کہ وہ غالب کے ہمعصر ہوئے۔ اگر وہ کسی اور دور میں جلوہ افروز ہوتے تو افق شاعری برتنِ تنہا نظر آتے۔

بہر حال مومن نے شمع اٹھا کر اپنے قریب کی، بالوں میں انگلیوں سے شانہ کیا۔ آستینوں کی

چلنوں کو صاف کیا اور انتہائی دل آویز ترنم میں یہ غزل عطا فرمائی اور جملہ استادانِ فن ہمہ تن گوش ہو گئے۔

الٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ — بے طاقتی کے طعنے ہیں عذرِ جفا کے ساتھ

بہرِ عیادت آئے وہ لیکن قضا کے ساتھ — دم ہی نکل گیا مرا آوازِ پا کے ساتھ

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی — آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

ہے کس کا انتظار کہ خوابِ عدم سے بھی — ہر بار چونک پڑتے ہیں آوازِ پا کے ساتھ

بے پردہ غیر پاس اسے بیٹھا نہ دیکھتے — اٹھ جاتے کاش ہم بھی جہاں سے حیا کے ساتھ

اللہ رے گمرہی بُت و بت خانہ چھوڑ کر — مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

غزل کیا تھی ایک جام ارغوانی تھا۔ شرابِ ناب کا چھلکتا ہوا ایک پیمانہ تھا جس نے پیا سرشار ہو گیا، عشق و مستی جذب و کیف اور نور و نکہت کا ایک سیلاب تھا کہ امڈا چلا آ رہا تھا۔ نفیس کلام اور پھر شاعر کے پڑھنے کا دلکش انداز۔ اور پھر مومن کی اپنی قد آور شخصیت۔

جب جوش اور شور ذرا کم ہوا تو شمع حضرت عبدالرحمٰن احسان کے سامنے جنہیں حافظ جیو کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے لائی گئی۔ کوئی نوے سال کی عمر ہے کمر جھک کر کمان بن گئی ہے مگر غزل اتنی تیز آواز میں پڑھتے ہیں کہ جوان شرما جاتے ہیں۔ بہرکیف مومن نے استاد ذوق۔ مومن اور غالب کو مخاطب فرما کر یہ غزل پیش کی اور ہر شخص نے اپنے اپنے انداز میں حضرت احسان کو نوازا۔ ایسی سنگلاخ زمین میں ایسی مرصع غزل کہنا واقعی استادی ہے۔

تُو کیوں ہے گریہ کناں اے مرے دلِ محزوں — نہ رو، نہ رو کہ نہ تجھ کو کبھی رولائے خدا

بتو! بتاؤ تو کیا تم خدا کو دو گے جواب — خدا کے بندوں پہ یہ ظلم، بندہ ہائے خدا

بتوں کے کوچے میں کہتا تھا کل یہی احساں — یہاں کسی کا نہیں ہے کوئی سوائے خدا

حضرت احسان کے بعد شمع جس شخص کے روبرو لائی گئی وہ ادیب تھا اور شاعر بھی۔ نکتہ داں بھی تھا اور نکتہ سنج بھی۔ رند بھی تھا اور پارسا بھی۔ نرم خو بھی تھا اور فولاد کی طرح سخت بھی۔ شعر ایسا کہتا کہ بڑے بڑے استادانِ فن جھوم اٹھتے۔ کیسی سے کیسی بنجر اور سنگلاخ زمین ہوتی اسے لالہ زار بنا دیتا۔ لعل و گوہر

بکھیر کر دم لیتا...... زبان جس کے گھر کی لونڈی۔ اور محاورات جس کے روبرو صف بستہ غلام۔ جس لفظ کو جہاں چاہتا، اس طرح اٹھا کر رکھ دیتا جیسے انگوٹھی میں نگینہ...... اگر اس کی ایک ران کے نیچے فلسفۂ قدیم تھا تو دوسری کے نیچے جدید...... اور یہ شہسوار اردو زبان کے منہ زور گھوڑے کو ایڑ لگاتا ہوا زمین سے آسمان اور آسمان سے عرش و کرسی اور نہ معلوم کہاں کہاں کے طرارے بھرتا پھرتا۔ جو اس وقت بھی غالب تھا اور آج بھی غالب ہے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب کی عمر اس وقت تقریباً پچاس سال کی تھی مگر اس عمر میں بھی انتہائی حسین و دلکش سراپے کے مالک تھے۔ دراز قد...... چوڑا چکلا ہاڑ...... کھلتا ہوا سفید رنگ لیکن زردی مائل چمپئی یا سنہری...... آگے کے دو دانت ٹوٹے ہوئے...... بھری ہوئی داڑھی لیکن نہ زیادہ گھنی اور نہ زیادہ چھدری...... مُنڈا ہوا سر، اس پر سیاہ پوستین کی مخروتی ٹوپی...... ایک برکا سفید پاجامہ، سفید ململ کا انگرکھا جس پر زرد جامہ وار کا چغہ۔ صبح ہونے میں کچھ ہی دیر باقی ہوگی کہ شمع مرزا کے سامنے لاکر رکھ دی گئی۔ مرزا صاحب نے ادھر ادھر دیکھا اور فرمایا، حضرات! اب میں اپنی بھیرویں الاپتا ہوں۔ یہ کہہ کر ایسے موثر اور دلکش لہجے میں غزل پڑھی کہ سب محو ہو گئے۔ آواز بلند اور انتہائی دلگیر اور دل سوز۔ غزل کیا تھی ایک فریاد تھی۔ ایسی فریاد جس میں ناقدریٔ عالم کی شکایت ہو شکوہ ہو لیکن اس تیقن اور وثوق کے ساتھ کہ اگر آج نہیں تو کل زمانہ میری عظمت اور انفرادیت کو ضرور تسلیم کرے گا، غزل یہ تھی:۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں — کاش پوچھو کہ مُدعا کیا ہے
جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
ہم کو ان سے وفا کی ہے امید — جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں — میں نہیں جانتا دعا کیا ہے
ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا — اور درویش کی صدا کیا ہے
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب — مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

مرزا غزل پڑھ کر مسکرائے اور فرمایا "جو اس پر بھی نہ سمجھیں وہ...... تو پھر ان سے خدا سمجھے"
حکیم آغا جان عیش دہلوی جنہوں نے مرزا پر چوٹ کی تھی سمجھ گئے اور کہنے لگے، مرزا صاحب "غنیمت ہے کہ تم اس رنگ کو آخر سمجھ گئے"، غرض تعریف کے ساتھ ساتھ مذاق بھی ہوتا رہا...... اتنے میں شمع استاد ذوق کے سامنے جا پہنچی۔ جناب ذوق بڑے جہاں دیدہ آدمی ہیں۔ وہ بھانپ چکے تھے کہ داغ اور غالب کی غزلیں عصری تقاضوں سے اس قدر ہم آہنگ تھیں کہ انہوں نے اہل محفل کے دل جیت لیے۔ یہ اگر ایک طرف حسن و عشق کی جلوہ ریزیوں سے لبریز تھیں تو دوسری طرف معاشرے کی ناہمواریوں اور سسکتی آہوں کی عکاس تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص نے انہیں اپنے دل کی پکار سمجھا اور دل کھول کر داد دی۔ ان حسین غزلوں کے بعد ایک روایتی یا عام غزل وہ مقام حاصل نہیں کر سکے گی جو ان کی شایان شان ہو۔ اس لیے، استاد نے مرزا فخر الدین فتح الملک، صدر مشاعرہ سے مخاطب ہو کر کہا "صاحب عالم!" "غزل پڑھوں یا کل جو قطعہ ہوا ہے وہ عرض کروں" صاحب عالم نے فرمایا۔ "استاد آج کا مشاعرہ تمام قید و بند سے آزاد ہے، غزل پڑھیئے، رباعی پڑھیئے، قطعہ پڑھیئے جو چاہے پڑھیئے مگر پڑھیئے ضرور"۔ اس کے بعد استاد ذوق سنبھل کر بیٹھے اور ذیل کا قطعہ ایسی بلند آواز اور خوش آہنگ لہجے میں عطا فرمایا کہ ساری محفل گونج اٹھی اور ہر شخص نے تعریف کی:۔

قطعہ

کہوں کیا ذوقِ احوال شب ہجر — کہ تھی اک اک گھڑی سو سو مہینے
نہ تھی شب ڈال رکھا تھا اک اندھیر — مرے بختِ سیہ کی تیرگی نے
عوض کس بادہ نوشی کے مجھے آج — پڑے یہ زہر کے سے گھونٹ پینے
حواس و ہوش جو مجھ سے قریں تھے — قرینے سے ہوئے سب بے قرینے
مری سینہ زنی کا شور سن کر — پھٹے جاتے تھے ہمسایوں کے سینے
اٹھایا گاہ اور گاہے بٹھایا — مجھے بیتابی و بے طاقتی نے
کہا جب دل نے اب کچھ کھا کے سورہ — بہت الماس کے توڑے نگینے
نہ ٹوٹا جان کا قالب سے رشتہ — بہت ہی جان توڑی جاں کنی نے

لگے پانی چوانے منہ میں آنسو | پڑھی یسٰیں سرہانے بیکسی نے
مگر دن عمر کے تھوڑے سے باقی | لگا رکھے تھے میری زندگی نے
کہ قسمت سے قریب خانہ میرے | اذاں مسجد میں دی بارے کسی نے
بشارت مجھ کو صبح وصل کی دی | اذاں کے ساتھ یمن و فرخی نے
ہوئی ایسی خوشی اللہ اکبر | کہ خوش ہو کر کہا یہ خود خوشی نے
مؤذن مرحبا بروقت بولا | تری آواز مکے اور مدینے

جناب ذوق آخری شعر پر پہنچے ہی تھے کہ برابر کی مسجد سے آواز آئی ''اللہ اکبر'' ''اللہ اکبر''...... اس آواز کا کانوں میں آنا تھا کہ بیساختہ سب کے منہ سے نکلا ''تیری آواز مکے اور مدینے''...... اذان ختم ہوئی تو جملہ حاضرین نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ دعا سے فارغ ہوئے تو صدرِ مشاعرہ مرزا فخر الدین نے فرمایا ''صاحبان! کچھ عجیب اتفاق ہے کہ یہ مشاعرہ دعائے خیر ہی سے شروع ہوا تھا اور اب دعائے خیر ہی پر ختم ہوتا ہے'' یہ کہہ کر صاحب عالم نے دونوں شمعوں کو جو گردش کرتے ہوئے ان کے سامنے آچکی تھیں گل کر دیا...... ان کے گل ہوتے ہی نقیبوں نے آواز دی ''حضرات مشاعرہ اختتام پذیر ہوا۔ یہ سن کر سب رخصت ہونے کے لیے اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔ سب سے پہلے صاحب عالم اپنی سواری میں بیٹھے اور رخصت ہوئے اور اس کے بعد ایک ایک کر کے سب رخصت ہونا شروع ہوئے۔

آج نہ وہ محفل ہے اور نہ وہ احباب، سب اپنے خالقِ حقیقی کے حضور جا چکے۔ ہماری زندگی کے چراغ بھی ہوا کی زد میں ہیں۔ پتہ نہیں کب ہوا کا کوئی تیز جھونکا۔ کوئی جھکڑ آ کر انہیں گل کر دے۔ یہ چند گھڑیاں جو ابھی باقی ہیں بیش قیمت ہیں، آیئے ان میں کچھ آخرت کی تیاری کر لیں۔

عبدالحمید اعظمی

مُلّا دوپیازہ

لیجئے فرمائش کے مطابق یہ رہا دوپیازہ۔ مہمان نے جو بے تکلف دوست تھے پلیٹ پر ایک نظر ڈالی، مسکرائے، لب ہلے، میں سمجھا منھ میں پانی آرہا ہے۔ مگر وہاں تو الفاظ نکلنے کے لیے بے تاب تھے۔ بولے یہ تو عام طریقے سے پکا ہوا ہے۔ کیوں کوئی خاص ترکیب بھی ہے۔ کیوں نہیں۔ سیکھی کہاں سے، سیکھی کہاں۔ صرف سابقہ پڑا تھا۔ ہوا یوں کہ دو چار مہینے بدیسی کھانے کھا کھا کر طبیعت اچاٹ ہوگئی تھی۔ ہانگ کانگ پہنچے تو پاکستانی کھانوں کی چاٹ بیدار ہوگئی، جیسے ہی ایک پاکستانی ریستوران پر نظر پڑی۔ فوراً داخل ہوگئے۔ میز پر بیٹھے ہی تھے کہ بیرے سے کہا دوپیازہ لے آؤ۔ ذرا سی دیر میں پلیٹ چمچے سج گئے اور دوپیازہ کا قاب بھی آگیا۔ کھولا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ قورمے پر نہایت مہارت سے چھلی ہوئی دو پیاز رکھی ہوئی تھیں یہ دوپیازہ ہے؟ جی دیکھئے نا دو پیاز رکھی ہوئی۔[1] دل میں سوچا ضرور یہاں کے خانساماں کا رشتہ مُلّا دوپیازہ سے ملا ہوگا۔ یہ واقعہ بیان کر ہی رہے تھے کہ ایک صاحب نے پوچھ ہی لیا یہ مُلّا دوپیازہ کون تھے۔ مُلّا تو چلیئے سمجھ میں آتا ہے کہ مُلّا تو عالم فاضل ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں بچوں کو مسجد میں پڑھانے والے کو بھی احتراماً سے زیادہ رسماً مُلّا ہی کہتے ہیں۔ لیکن یہ دوپیازہ کیسے بن گئے۔ صرف شہرت کی خاطر یا اور کوئی بات ہے۔ بات یہ ہے کہ مُلّا اکبر کے دربار سے وابستہ تھے۔ ایک مرتبہ کسی دعوت میں دوپیازہ پلاؤ کھایا اتنا بھایا کہ جب مدعو کیا جاتا تو پہلے پوچھ لیتے، دسترخوان پر دوپیازہ پلاؤ چُنا

---

[1] اعظمی صاحب ایک ''انتظار بسر وقفے'' کے بعد ''الاقرباء'' کی محفل میں شریک ہیں، ان کے اس لطیفے سے قدرے مماثل چند برس پہلے کا ایک واقعہ ہمیں یاد آگیا کہ ہمارے ایک دوست ظہرانے پر ہمیں یہ کہہ کر اسلام آباد کلب لے گئے کہ وہاں ''جھل فریزی'' کی ڈش لاجواب ہوتی ہے لیکن بدقسمتی سے ہمیں پسند نہ آئی۔ کلب کے منیجر کچھ دیر بعد تشریف لائے اور فرمانے لگے کہ سر ''جھل فریزی'' پسند آئی؟ ہم نے عرض کیا کہ کھانے میں ''جھل فریزی'' تو نہیں تھی، انہوں نے ڈش کی طرف اشارہ کیا اور ہمارا یہ جواب قہقہوں میں ڈوب گیا کہ ''ہم نے تو اسے جَل فریبی سمجھ کر کھایا۔'' (ادارہ)

جائے گا یا نہیں۔ کسی نے انکار کیا تو دعوت نامنظور کی۔ لوگوں نے مُلّا جی کے دو پیازہ پلاؤ پر اصرار کو دیکھتے ہوئے انہیں مُلّا دو پیازہ کہنا شروع کر دیا۔ شہرت ہی میں شہرت دوام بھی ملی۔ جس کی بنیاد اکبر کے نورتنوں میں لالہ بیربل کے ساتھ ان کی نوک جھونک تھی۔ جس کا مزہ سارا دربار اٹھاتا۔ ان کی لطیفہ گوئی نے ان کے بہت سے کمالات کو ڈھانپ رکھا ہے۔ حتیٰ کہ ان کے اصل نام سے بھی بہت کم لوگ واقف ہیں۔

ان کی سوانح عمری کا ایک ہی ماخذ ہے ہندوستانی Speculator جس کی رو سے مُلّا کا نام ابو الحسن والد کا نام ابو محاسن اور دادا کا نام ابوالمکارم تھا۔ مُلّا اصل میں ۱۵۴۰ء میں طائف میں پیدا ہوئے۔ پُوت کے پاؤں پالنے ہی نظر آنے لگے۔ ایام طفولیت ہی سے ان کی خوش طبعی، ظرافت اور خوش مزاجی نے ملنے جلنے والوں کو گرویدہ بنا لیا تھا۔ بچپن ہی میں والدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ سوتیلی ماں نے کیا سلوک کیا ہوگا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ والد مُنی بیگم کے برتاؤ سے تاؤ کھا کر گھر سے غائب ہو گیا۔ مُلّا جی نے تلاش کا بیڑہ اٹھایا، قافلہ در قافلہ خاک چھانتے رہے آخر کار ایک ایرانی قافلے کے ساتھ، جس کا سردار جرنیل اکبر علی خاں تھا، ایران پہنچ گئے۔ یہ وہ وقت تھا جب ہمایوں کو شیر شاہ سوری نے شکست دی تھی اور وہ اس آڑے وقت میں ایران کے صفوی حکمران سے امداد لینے سے زیادہ پناہ لینے کے لیے ان کا مہمان بنا۔ قسمت نے یاوری کی اور کرنل بخش اللہ خاں ہمایوں کے ساتھ جس کا ایرانی جرنیل اکبر علی سے گہرا دوستانہ تھا۔ اس نے ابوالحسن کے طور طریق، عادات، اطوار، خوش مزاجی، بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی کو پسند فرما کر اپنے دوست سے اس زمانے کے دستور کے مطابق بطور یادگار مانگ لیا۔ اور اپنے ساتھ لیے لیے پھرتا رہا۔ یہاں تک کہ ہندوستان لے آیا۔ لیکن شومیٔ تقدیر سے اس کا مربی کرنیل بخش اللہ خان کابل کے معرکہ میں کام آیا۔ اس لیے ہمایوں کے دامن عاطفت کے سوا اور کوئی جائے پناہ نہ رہی۔ ہندوستان پہنچا ہی تھا کہ ۱۵۵۶ء میں ماچھی واڑے کی لڑائی میں حصہ لینا پڑا۔ اس وقت ابوالحسن کی عمر صرف ۱۶ سال تھی۔ لیکن عمل میں طاق تھا۔ شوقِ تعلیم سے مجبور ہو کر شمس الامرا محمد خان لودھی کی مسجد میں رہنا پسند کیا۔ خوش الحانی سے قرآن شریف کی تلاوت کرتا تھا۔ اس طرح لوگ باگ اسے مُلّا جی، مُلّا جی پکارنے لگے۔ مزید برآں اس کی لطیفہ گوئی نے تمام شہر میں دھوم مچا رکھی تھی۔ اکبر کے نورتنوں کے سرخیل ابوالفضل اور ان

کے بھائی فیضی ابوالحسن کی باتوں پر لٹو ہو گئے۔ مُلّا جی کو گھر بھی بلاتا اور موقع بہ موقع ان کے پاس مسجد میں بھی جا بیٹھتا۔ یہ ربط اتنا بڑھا کہ فیضی نے اکبر کے دینِ الٰہی کی ترویج کے لیے جو مرکز ''عبادت خانہ الٰہی'' قائم کیا تھا۔ اس کا انتظام وانصرام بھی مُلّا ہی کے سپرد کر دیا اور انہیں بادشاہ تک باریاب کر دیا۔ اکبر کا یہ حال ہوا کہ وہ ہر دم اور ہر حالت میں ان کو اپنے پاس رکھنے لگا۔ دربار کے علاوہ جنگ پر جاتا تو مُلّا ساتھ ہوتے اور اپنی بزلہ سنجی سے رزم کو بزم بنا دیتے۔

مُلّا کی بذلہ سنجی کا مقابلہ اکبر کے ایک نورتن لالہ بیربل سے بھی ہوتا رہتا تھا۔ اکبر دونوں کی نوک جھونک سے لطف اندوز ہوتے اس مقصد کے لیے دونوں کو اکثر چھیڑتے رہتے کیونکہ لطف انگیز، ملامت آمیز، چٹ پٹے لطیفے، چٹکلے دونوں کی زبان سے سرزد ہوا کرتے تھے۔ مثلاً بیربل نے کہا یہ خیل بان، شتربان، گاڑی بان اس لائق نہیں ہوتے کہ انہیں مُنھ لگایا جائے۔ بان والے سارے کے سارے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ مُلّا نے گذارش کی جی مہربان، اسی طرح پگڑی باندھنے کا چٹکلہ، نیکی کئے بدی حاصل ہونے کا بذلہ انہیں کے طبعزاد ہیں۔ اس ذخیرے میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا رہا اور آج ان گنت مہذب اور غیر مہذب لطیفے ان کے نام سے گرمیٔ محفل کا سامان فراہم کر رہے ہیں۔ اب یہ سارے کا سارا ذخیرہ یادگارِ قدیم بنتا جا رہا ہے۔ مُلّا نے ساٹھ سال کی عمر پائی۔ زیادہ اس لئے نہیں کہ وہ سٹھیا جانے کا طعنہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ شہنشاہِ اکبر کے ساتھ احمد نگر کے محاصرے سے واپس آتے وقت مہینہ بھر کے قریب بیمار رہ کر ۱۵ رمضان المبارک ۱۶۰۰ء بنارس کے قریب قصبہ ہنڈیا میں رحلت کی، چنانچہ کسی ظریف نے اسی وقت کہا کہ واہ بھئی مُلّا دو پیازے مرکر بھی ہنڈیا کا پیچھا نہ چھوڑا۔

آج بھی ''مُلّا دو پیازہ'' کے لطیفے یادگار ہیں۔ لیکن بیچارے ابوالحسن سے کتنے واقف ہیں؟

خاکہ

شریف فاروق

یادوں کے دیار میں

مارچ کے اواخر یا اپریل کے اوائل میں پشاور میں موسم بہار اپنے جوبن پر ہوتا ہے درختوں کی سرسبز وشاداب ٹہنیوں سے لے کر گہرے سبز پتوں، سبز ہموار گھاس کے تختوں اور پختہ روشوں کے ساتھ ساتھ رنگا رنگ پھولوں کی بہار نہایت سحر انگیز اور دل افروز ہوتی ہے۔ کہتے ہیں، برصغیر میں بہار کا سب سے زیادہ حسین موسم پشاور ہی کا ہوتا ہے چنانچہ اسی حسن افروز موسم میں ایک روز میں ترناب فارم کے تقسیم شدہ مستطیل قطعات کی درمیانی روش سے گزر رہا تھا ہوا کے جھونکوں سے پودے آہستہ آہستہ رقص کناں تھے۔ ان پر چھوٹے چھوٹے نرم ونازک پھول مسکرا رہے تھے ان کی خوبصورتی دل ونظر کو مسحور کیے ہوئے تھی ایک پھول میرا مرکز نگاہ بن گیا۔ دوسرے پھولوں کی طرح اس پھول کی ہر پتی بڑی نازک تھی ہر پتی کے آغاز سے ترمزی رنگ کی متناسب لکیریں اوپر کی طرف پھیلتی چلی جا رہی تھیں معلوم ہوتا تھا کسی آرٹسٹ نے انتہائی نازک برش سے پوری نزاکت سے کام لیتے ہوئے ان پتیوں اور پھولوں کو پینٹ کر دیا ہے لیکن وہ آرٹسٹ کون ہو سکتا ہے جس نے ہر نرم ونازک پھول کی طرح اس نرم ونازک پھول کی ہر پتی پر ترمزی اور ترمزی میں سے گلابی نیلے رنگ کو کشید کیا ہے؟ میں سوچ رہا تھا انسان نے ستاروں پر کمندیں ڈال دیں سورج کی شعاعوں کو مسخر کر لیا۔ آبی قوت کو انرجی میں تبدیل کر دیا تمام دنیا کو مواصلاتی نظام سے مربوط کر کے رکھ دیا۔ آسمان کو چھونے والی بلند وبالا عمارات تعمیر کر لیں سڑکوں کے پیچ در پیچ سلسلے تعمیر کر لیے چھوٹے سے برقی پنکھے کے آرمیچر سے لے کر محیر العقول انجنوں میں حرکت کرنے والی مواصلاتی شریانیں متحرک ہو گئیں۔ انہی شریانوں کے بل پر آواز سے تیز تر رفتار فضا میں طیارے اور زمین پر ہزاروں لاکھوں گاڑیاں دوڑتی ہیں اور یہ فضائی ہیولے چشم زدن سے بھی کہیں تیز تر سرعت کے ساتھ میدان میں ایک دوسرے کو شکست دینے پر تلے ہوئے ہیں، حوادث زمانہ کی وسعتیں کہاں کہاں نہیں پہنچتیں لیکن کیا عصر

حاضر کا بڑے سے بڑا سائنس دان اور تخلیق کار کسی بھی طرح ایک چھوٹے سے پھول اور اس کی پتی کو اس کی نزاکتوں کے ساتھ تخلیق کر سکتا ہے؟

آج سے نصف صدی قبل پھولوں کی سرزمین ہالینڈ کے ہوائی اڈے سے اترے، بارش کو رُکے کچھ دیر ہوئی تھی۔ میں انسانی زندگی کو پھولوں سے زیادہ نرم اور فولاد سے زیادہ سنگین سمجھتا ہوں۔ میں حوادث زندگی جو روز اول سے میرے ہم رکاب رہے ان کے گوناگوں پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے پھولوں کی دنیا میں پہنچ گیا۔ کیونکہ عرفان حق کا یہ ایک نکتہ میرے شعور میں پیوست ہو گیا تھا۔ بارش کی تیرتی اور پھیلتی خنکی ہوا کے دوش پر راحت جاں بن رہی تھی۔ چاروں طرف درختوں کی شاخیں اور تراشیدہ گھاس کے تختوں کا حسن حد نگاہ تک پھیلا ہوا تھا۔ کاروں کا قافلہ روانہ ہوا تو دارالحکومت ہیگ کی طرف جاتے ہوئے راستے میں میلوں تک پھولوں کے کھیت صف بہ صف اور شانہ بشانہ جھوم رہے تھے۔ بڑے بڑے، پیلے پیلے، سرخ گلابی گل لالہ جنھیں انگریزی میں بلب کہا جاتا ہے اپنا حسن بکھیر رہے تھے انہی پھولوں کے ہار بنائے ان کھیتوں میں بسنے والی مسکراتی لڑکیاں اور بے باک لڑکے آنے جانے والے شائقین کے لیے ان ہاروں کو فروخت کرنے کے لیے کھڑے تھے کوئی اکا دکا لڑکا یا لڑکی انہیں اپنی سائیکل کے ہینڈلوں کے گرد بھی لپیٹے ہوئے رواں دواں تھے پھولوں کی اس سرزمین میں ہر دس سال بعد ایک جشن کا اہتمام ہوتا ہے۔ جس میں یورپ سمیت دنیا بھر سے باغبان، مالی گل کار جمع ہوتے ہیں ایسا ہی جشن گل ہماری موجودگی میں بھی ہوا جس میں ہم نے شرکت کی۔ منتظمین نے خیر سگالی کی چھوٹی سی تقریب منعقد کی۔ ہمارے ناظم الامور کی اہلیہ محترمہ کے نام پر پھولوں کی ایک کیاری کا نام ''گل یاسمین'' رکھا گیا۔ پھولوں کی یہ کیاری اور جشن گل کا وہ ہنگامہ جس کا نام گل یاسمین رکھا گیا آج کہاں ہیں؟ گزرتے ماہ و سال بسیط خاموشیوں میں ہمیشہ کے لیے سب جذب ہو گیا۔ پھولوں کی دنیا بھی عجیب ہے!

دسمبر ۱۹۶۳ء میں جب میرا عزیز دوست گیری آلڈر کرسمس کے لیے مجھے اپنے کنٹری ہوم لے گیا تو اس کی باوقار والدہ نے جو چمکتے سورج کی سنہری دھوپ میں پھولوں کی کیاریوں کو درست کر رہی تھیں مسکراتے ہوئے ہمارا خیر مقدم کیا۔ ماں کی محبت میں کتنی شفقت اور پاکیزگی ہوتی ہے ایک بار پھر

مجھے گیری کی والدہ کی آنکھوں اور ہونٹوں میں میری مرحومہ ماں نظر آئی۔ گیری نے اپنی والدہ کو میری آمد سے پہلے ہی آگاہ کر رکھا تھا۔ اس کی والدہ نے ہاتھ میں چھوٹا سا رمبا پکڑ رکھا تھا وہ پھولوں کی کیاریوں کو آراستہ کر رہی تھیں شفقت اور محبت سے سرشار گیری نے بے قراری کے عالم میں کہا:

''ممی! ممی شریف کو وہ پھول دکھاؤ جو عطر بیزی اور رنگت میں لاجواب ہو......''

میں گیری سے اکثر مذاق کیا کرتا تھا کہ جس طرح تم انگریز لوگ بظاہر سرخ وسفید ہو' رنگت تو ہے ہی لیکن تم میں خوشبو نہیں، مہک نہیں، تمہارا حسن صرف ظاہری حسن ہے اس میں وفا کی خوشبو نہیں۔ گیری اس پر چڑ جایا کرتا تھا اور کہتا کہ میں تمہیں اپنے فارم پر مہکتے پھولوں کی بہار دکھاؤں گا...... چنانچہ گیری کی والدہ جو اپنی بزرگی اور سادگی کا پیکر تھیں ہنستے مسکراتے دو تین پھول توڑ کر لائیں کہ انہیں دیکھو......انہیں سونگھو...... انگلستان کے کھیتوں کے یہ پھول واقعی دیکھنے میں بہت خوبصورت تھے میں نے انہیں سونگھتے ہوئے کہا:

''ممی! بلاشبہ یہ پھول بے حد خوبصورت ہیں بالکل آپ لوگوں کی طرح لیکن ان میں مہک اور عطر بیزی جو ہمارے پھولوں میں ہے ان میں نہیں...... کبھی پاکستان آئیے، ہمارے پھولوں کی مہک سے تمام ماحول مہک اٹھتا ہے میں تہران کے ہوٹل گل لالہ سے باہر نکلتا تو تہران کے اس ہوٹل کے باہر گلاب کے انتہائی سرخ رنگ کے پھولوں کی رنگت ایرانی انقلاب کے دوران بہنے والے خون کی سرخی میں درخشاں نظر آتی۔ میں پھر ترناب فارم میں رقصاں چھوٹے چھوٹے پھولوں اور ان کی پتیوں کے رقص میں کھو گیا۔

میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ تخلیق کے بعد اگر پیچ در پیچ شریانوں میں کسی شریان کا چھوٹا سا غیر محسوس ذرہ متاثر ہو جائے تو پورا انسانی جسم تڑپ اٹھتا ہے۔ عناصر کی ہلکی سی بے ترتیبی انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے؟

مجھے یہی فکر ۱۱ ستمبر ۱۹۲۵ء کے ایک چھوٹے سے کوچے کے ایک چھوٹے سے تنگ و تاریک کمرے میں لے گئی جہاں میں ۹ کی بجائے ۷ ماہ پورے ہوتے ہی کائنات انسانی کے جیتے جاگتے ذروں میں شامل ہو گیا اور پھر عجیب بات ہے سات اور نو ماہ کا یہ فرق ہمیشہ میری زندگی پر حاوی رہا۔ ہر کام میں

جلدی اور ہر کام میں اضطراب...... اضطراب اور بے قراری میرے ساری عمر کے ساتھی بن گئے والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ تخلیق کی جلدی میں تم اس قدر نحیف ونزار تھے کہ ہمیں ہر لحہ تمہارے دنیا سے کوچ کر جانے کا دھڑ کا لگا رہتا تھا۔ تمہارا کُل حدود اربعہ پاؤں کی جوتی اور وزن دو اڑھائی کلو سے زیادہ نہیں تھا۔ لاہور کے کشمیری بازار نہیں کشمیری دروازہ کی ایک تنگ وتاریک گلی میں، میں نے آنکھیں کھولیں۔ چند ماہ ہی گزرے ہوں گے کہ کشمیری دروازہ سے ہم نسبتاً کشادہ خضری محلہ میں اٹھ آئے...... خضری محلہ کی جس گلی میں ہم اٹھ آئے وہ کچھ روشن اور کچھ ہوادار تھی اس مکان اور مسجد کے درمیان دیوار مشترک تھی اور یوں اللہ تعالیٰ کی ہمسائیگی کا شرف حاصل ہو گیا۔

اس ہمسائیگی کا یہ فائدہ ہوا کہ اذان کی صدائیں اور قاری صاحب کی قرات نہ سمجھنے کے باوجود اس کے اثرات روح میں سرایت کرتے رہے۔ ہوش سنبھالا تو پتہ چلا کہ یہی وہ محلہ تھا جہاں حضرت مولانا احمد علیؒ کی محنت شاقہ سے انجمن خدام الدین کے زیر اہتمام بہت بڑا مدرسہ اور جامع مسجد قائم کر دیئے گئے تھے۔ مولانا احمد علیؒ اپنے زمانے کے دیو بندی مسلک شاہ ولی اللہ اور مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے انقلابی افکار میں رنگے ہوئے خدا رسیدہ بزرگ تھے ان کا مسلک شہدائے بالاکوٹ سے ہوتا ہوا علمائے دیو بند سے جا ملتا تھا۔ للّٰہیت اور سادگی ان کا خاص وصف تھا۔ یہ جامع مسجد جو شیرانوالہ مسجد کے نام سے مشہور تھی۔ اس کے ساتھ ملحقہ دار العلوم دینی ہی نہیں سیاسی تحریکوں کے مراکز کی صورت اختیار کر گئے تھے۔ ان کا مقصد وحید علوم دینیہ کی تدریس اور انگریزی حکومت کے خلاف جذبہ جہاد سے سرشار علماء پیدا کرنا تھا انجمن خدام الدین چونکہ علمائے دیو بند ہی کی ایک شاخ تھی۔ اس لیے اس مقام پر بڑے بڑے دینی اجتماعات ہوتے جو دراصل سیاسی انقلابی جذباتی ردِعمل کے نقیب ہی نہیں معاشرے میں فرسودہ رسوم، لہو ولعب فضولیات اور اسراف کے خلاف بھی پیغامِ درا ثابت ہوتے۔ انجمن خدام الدین نے اپنے پیغام کو عام کرنے کے لیے ایک نئی روش کی بھی بنیاد ڈالی وہ یہ تھی کہ انجمن کے زیر اہتمام نہایت سستے، خوبصورت اعلیٰ طباعت کے حامل اصلاحی اور معلوماتی پمفلٹ شائع کیئے جانے لگے۔ لاہور ویسے ہی علم وفضل کا مرکز چلا آ رہا تھا اس لیے ایسے بہت سے دینی اور علمی ادارے موجود تھے جو اپنے انداز میں یہ فریضہ ادا کرنے میں منہمک

تھے ان میں بریلوی مکتب فکر کے ادارے بھی پیش پیش ہوتے۔ شیعہ اور اہل حدیث وغیرہ مختلف مکاتب فکر کے ادارے اور ان کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی مجلسیں تشنگان قلب ونظر کو سیراب کرتیں۔ یہ ادارے لاہور کی علمی اور دینی اہمیت کے حامل تھے جن کی وجہ سے لاہور عالم روزگار میں علماء اور فضلاء کا بے حد اہم اور ممتاز مرکز بن گیا۔

آج سے پون صدی اُدھر کے لاہور کا ماحول بڑا معصوم اور پاکیزہ تھا سادگی، سادہ زندگی اور سادہ دلی، ملاوٹ سے نا آشنا خوراک خالص دودھ، خالص دہی، خالص مکھن، خالص گھی اور صبح کے ناشتے میں خالص پیڑوں میں بلوئی ہوئی لسی...... صحت مند جانوروں کا تنومند گوشت...... اہل پنجاب کی صحت و تندرستی کا برملا ثبوت تھا۔

شیرانوالہ گیٹ کے قیام کے دوران میری عمر یہی کوئی دو یا تین سال کی ہو گی ہم چھوٹے چھوٹے بچے دنیا و مافیہا کی آلودگیوں سے بے نیاز ان روایتی محلوں کی گلیوں سے نکل کر آہستہ آہستہ بلندی سے نشیب کی طرف جھومتے درختوں اور سبزہ وگل سے آراستہ باغ میں آجایا کرتے تھے اس دور میں لاہور کو اگر گلکدہ کے نام سے یاد کیا جائے تو قطعی مبالغہ نہیں ہوگا۔ مستی گیٹ، شیرانوالہ گیٹ، یکی گیٹ، دہلی گیٹ، موچی گیٹ، لاہوری گیٹ، بھاٹی گیٹ وغیرہ یہ تمام تاریخی دروازے تھے جنہیں چاروں طرف سے باغات نے گھیرا ہوا تھا ان کا رشتہ صدیوں کی تاریخ سے جڑا ہوا تھا سرسبز و شاداب باغات میں بلند و بالا درخت، گھاس کے مخملیں فرش اور حفاظت کے لیے چھوٹے چھوٹے جنگلے، ان کے درمیان کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی نہریں بھی بہتی تھیں عرف عام میں انہیں نہریں بھی نہیں کہا جا سکتا تھا خدا جانے ان کا منبع کہاں سے پھوٹتا اور کہاں محدود اور آخر کار ختم ہو جاتا تھا۔ آج بھی میں چشم تصور سے ایک معصوم سی چھوٹی سی ندی کو بہتے دیکھ رہا ہوں یہ ندی بہے چلی جا رہی ہے۔ جس میں ہم ننھے ننھے بچے چھلانگیں لگایا کرتے تھے اور گھاس کے تختوں پر دوڑتے تھے اب ان باغات کو تاراج کر کے یہاں ٹرکوں کے بے ہنگم اڈے قائم کر دیئے گئے ہیں پون صدی پہلے ہی نہیں قیام پاکستان سے متصل مدت تک کے لاہور کے دو ایک باغات کو چھوڑ کر باقی تمام باغات کو عملاً ملیامیٹ کر کے وہاں سڑکیں اور بے ہنگم دکانیں تعمیر کر دی گئی ہیں میرے بس میں ہو

تو میں جن باغات کو غارت کر کے بسوں اور ٹرکوں کے اڈے تعمیر کر دیئے گئے ہیں ان تمام عمارتوں اور دکانوں کو بلڈوز کر کے تاریخی دروازوں کے باہر باغات کو زندہ کر کے لاہور کے حسن کو بحال کر دوں۔

یہ صرف ایک لاہور کے باغات کی بات نہیں پاکستان کے تمام بڑے شہروں کے باغات اور تاریخی عمارات کو اسی طرح روند ڈالا گیا ہے جنہیں زندہ کرنا ضروری ہے ایسا کیوں ہوا؟ ہمارے معاشرے میں دولت کی ہوس نے بڑے ظلم ڈھائے ہیں۔ انہی مظالم میں ان شہروں کے باغات، تاریخی عمارات اور تہذیب و ثقافت کے نشانات کی تباہی اور رسوائی میں ان کا مکروہ خون شامل ہے لاہور اور پشاور سمیت پاکستانی شہروں کی ثقافتی اور تاریخی تباہی کا یہ دکھ دنیا بھر میں، میں اپنے ساتھ لیے پھرا ہوں مجھے یورپ اور امریکہ کے بعض شہروں میں گھومنے پھرنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ میں نے ہر شہر میں ہر محلے اور ہر علاقے کے موڑ پر پارک دیکھے۔ چھوٹے سے چھوٹے موڑ پر دو دو تین تین کمروں پر مشتمل اپنے زمانے کے مشاہیر کی یادگاروں کو دیکھا ان کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے باغیچے دیکھے۔ پھولوں سے جھومتے پودوں اور ہرے بھرے درختوں کو دیکھا۔ لندن جہاں مجھے دو تین سال مسلسل قیام کرنے کا موقع ملا۔ گنجان علاقوں میں واقع پارکوں اور باغات کو نہیں چھیڑا گیا۔ دنیا کے ہر زندہ معاشرہ میں باغات کو نہیں چھیڑا جاتا ان کے حسن کو مسلا نہیں جاتا اسے غارت نہیں کیا جاتا۔ حسن حسن ہوتا ہے اس کی حفاظت کی جاتی ہے نہ کہ اسے تاراج کیا جاتا ہے۔

اے کاش! میں نے بچپن میں لاہور کے جن باغات کو دیکھا انکے وجود اور ان کے حسن کو بحال رکھا جا سکتا تھا۔ اس دور کا لاہور بہت چھوٹا بہت مختصر اور بہت دلربا تھا اس کا اپنا ایک کلچر تھا جس کے سوتے ادب و ثقافت سیاست اور گوناگوں تحریکوں سے پھوٹتے تھے یہ تحریکیں دینی، مذہبی، سیاسی، اقتصادی، فکری، نظری، فقہی زندگی کے تمام شعبوں کو لپیٹے ہوتی تھیں ہر تحریک کے پیچھے عبقری علماء و مفکرین سے لے کر فقر و درویشی میں ڈوبے ہوئے افراد و عناصر کی ایک کہکشاں نظر آتی۔ جہاں علم اور تحقیق کے سوتے پھوٹیں گے۔ وہاں زندگی کے رعنائیاں اور قوم کی خوش بختیاں مسکراتی رہیں گی۔ انہی خصائص سے لاہور کو ممتاز و منفرد مقام حاصل ہو گیا۔

پرندوں کو جس طرح اپنے گھونسلوں کی تلاش رہتی ہے اسی طرح انسانوں کو بھی اپنے سر چھپانے کے لیے کسی نہ کسی جگہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی جگہ جسے وہ اپنا کہہ سکیں۔ یہی بات ہوگی کہ اچانک میرے والدین نے لاہور ریلوے سٹیشن کے قریب فیض باغ میں ساڑھے تین پونے چار مرلے کا ایک چھوٹا سا قطعہ اراضی حاصل کیا اس کی پہچان چاہ تمبا کو والا تھا اب نہ تو یہ کنواں رہا ہے اور نہ اس میں اگنے والے تمباکو کے پودے۔

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

فیض باغ چاہ تمبا کو والا سے ہم آہنگ پرانے طرز کا چھوٹے چھوٹے کوارٹروں پر مشتمل ایک حاطہ بھی تھا۔ جس میں مزدور پیشہ آبادی تھی۔ ریلوے سٹیشن اور فیض باغ کے درمیان صرف جی ٹی روڈ حائل تھی جو دو موریا پل سے ہوتی ہوئی باغبانپورہ اور شالامار باغ سے ملا دیتی تھی۔ ہمارے یہاں آنے کے بعد ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کی گئی اس کا نام مسجد قاضی رکھا گیا۔ یہ مسجد مرحوم قاضی زین العابدین نے تعمیر کرائی۔ قاضی صاحب مرحوم پنج وقتہ نمازی، پرہیز گار اور سنجیدہ مزاج بزرگ اور بڑے کٹڑ بریلوی تھے۔ اس لیے مسجد قاضی میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے عرس اور گیارہویں شریف کے ختم بڑی باقاعدگی سے ہوتے۔ ان ختموں کی سب سے بڑی وجہ کشش میٹھے چنے، پھلیاں اور مٹھائی کی تقسیم ہوتی۔ بالخصوص رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں افطاری کا لطف ہی کچھ اور تھا تمام محلے سے طشتریوں میں آراستہ سویاں مٹھائیاں اور دوسرے پکوان آتے۔ ہر شخص ان پکوانوں کو بڑے اہتمام سے لاتا۔ کھجوریں اور شربت بھی تقسیم ہوتے۔ شب برات، لیلۃ القدر اور ۲۷ ویں رمضان کو ہم بچے تمام شب جاگتے اور ایک لمحہ پلک نہ جھپکتے کیونکہ یہ عقیدہ عام تھا کہ اس مقدس رات کو ایک لمحہ ایسا آتا ہے جو بھی دعا مانگی جائے قبول ہو جاتی ہے اس نوعمری میں ہماری دعائیں ہماری آرزوئیں اور ہماری خواہشات کیا ہوسکتی تھیں ان کا کچھ علم نہیں۔ بات فیض باغ میں رہائش سے چلی اور براستہ جی ٹی روڈ گردش کرتی ہوئی رمضان المبارک کی افطاریوں تک جا پہنچی۔

فیض باغ کی اس نئی نئی آبادی کی خوبی اور اہمیت یہ تھی کہ اسے ریلوے سٹیشن کا قرب حاصل

تھا جو پورے ہندوستان کی ٹرینوں کی آمد ورفت کا مرکز تھا یہاں کے باسیوں میں ریلوے قلیوں کی بھی بڑی تعداد تھی ان کے سب سے بڑے ٹھیکدار جوان قلیوں کو ریلوے سٹیشن پر کام کا اجازت نامہ لے کر دیا کرتے تھے انہی کے گاؤں اور علاقے کے غریب غرباء، محنت مزدوری کرنے والے ہوتے ان کی شخصیت بڑی رعب دار تھی۔ ہر قلی کی وردی سرخ ہوتی تھی اور اسکے بازو پر پیتل کا ایک ٹھپہ بندھا ہوتا تھا جس پر قلی کا نمبر لکھا ہوتا تھا۔قلیوں کے لیے سرخ رنگ کیوں مخصوص کیا گیا تھا اس کی وجہ یہ ہوگی کہ انگریز بالشویک انقلاب سے لرزاں تھے اس لیے قلیوں کی وردی کے لیے سرخ رنگ کا انتخاب کیا گیا۔ یا شاید یہ رنگ...... شہداء کے خون کی تحقیر کے لیے منتخب کیا گیا ہو۔ انگریز اپنی برتری اور تفوق کے لیے بڑے بڑے نفسیاتی ہتھکنڈے استعمال کیا کرتا تھا۔ اس لیے محض تحقیر کے لیے اس رنگ کو قلیوں کی وردی کا رنگ قرار دے دیا گیا ہو لیکن انقلاب کبھی اس طرح ختم ہوا کرتے ہیں؟ خیر ریلوے سٹیشن کے قلیوں سے قطع نظر فیض باغ کے گردونواح کا علاقہ میری نگاہوں کے سامنے ابھر رہا ہے اور مجھے ایسے محسوس ہو رہا ہے جیسے میرے سامنے ہمارے چھوٹے سے مکان کی بنیادیں کھودی جا رہی ہیں اور اس کی بنیادوں میں میرے والد میرے پہلوٹھی کے کپڑے ''سنگ بنیاد'' یا ''خیر و برکت'' کے طور پر رکھوا رہے ہیں ان بنیادوں کو بجری اور سیمنٹ کے آمیزے سے بھاری آہنی دھموسوں سے کوٹ کوٹ کر پختہ کیا جا رہا ہے۔ بنیادیں خاصی گہری کھودی جا رہی ہیں کیونکہ بنیاد مضبوط ہوگی تو عمارت کا بوجھ سہار سکے گی۔ کچھ وقفے کے بعد ایک کمرے کی دیواریں کھڑی کر دی جاتی ہیں۔ اس پر چھت ڈال دی جاتی ہے اور ہم یہاں منتقل ہو جاتے ہیں ہوتے ہوتے یہ چھوٹا سا مکان تین چار سال میں اڑھائی منزلہ ہو جاتا ہے جس میں میرے والدین کی محنت شاقہ کا خون پسینہ شامل ہوتا ہے۔

اس دور کے مکانات زیادہ تر مضبوط مٹی کے گارے اور پختہ اینٹوں سے تیار کئے جاتے تھے جن پر سیمنٹ اور ریت کو ملا کر ''ٹیپ'' کر دی جاتی تھی یہ ''ٹیپ'' ان تمام درزوں، دراڑوں کو بند کر دیتی تھی جن سے کیڑے مکوڑوں کی در اندازی ہو سکتی تھی یا بارشوں کا پانی عمارتوں کو کمزور کر سکتا تھا۔ مکانات کے اندر سادہ سفیدی ہوتی تھی ابھی اس دور میں فیض باغ جیسے پسماندہ علاقوں میں ڈسٹمپر نگ کا رواج نہیں ہوا

تھا امرا کے محلات میں سنگ مرمر ضرور استعمال ہوتا ہوگا اور مسالہ بھی قیمتی لگایا جاتا ہوگا لیکن عام عمارتوں کی چنائی پختہ اینٹوں اور گارے مٹی سے ہوتی تھی۔ فی الاصل مضبوط سیمنٹ، بجری، ریت اور لوہے کے مسالے والی تعمیرات کے نئے دور کا تیزی سے آغاز دوسری جنگ عظیم کے بعد سے ہوا جب تعمیر و ترقی اور بین الاقوامی صنعتی و تجارتی روابط پھیلنے لگے۔ جس دور کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ غیر ملکی سامراج اور غربت و افلاس کے خلاف ایک سنگین لیکن طویل کشمکش کا عبوری دور تھا۔ اندرون شہر ہندوؤں اور سکھوں کی آبادیاں چھوٹے اور محدود محلوں تک پیچ در پیچ گلیوں اور تنگ و تاریک گلی کوچوں تک محدود تھیں۔ تمام منڈیوں پر ہندوؤں اور سکھوں کا قبضہ تھا مسلمان مزدور پیشہ اور بوریاں اٹھانے والے پانڈی ہوتے تھے اس لیے ان غیر مسلم آڑھتی اور دکاندار منڈیوں پر قابض سرمایہ داروں نے اپنی آسانی کے لیے اندرون شہر کے محلوں کو قلعہ نما بنا رکھا تھا لیکن بے پناہ دولت مندی کے باعث وہ ان پرانے محلوں سے باہر نکل رہے تھے ماڈل ٹاؤن، نسبت روڈ، بیڈن روڈ، مال روڈ اور اس کے گرد و نواح میں جدید عمارات تعمیر کرا رہے تھے۔ اس دور میں فیض باغ احاطہ تیزاب اور مصری شاہ متوسط اور نچلے متوسط درجے کے رہائشی علاقے تصور کیے جاتے تھے۔ جہاں صفائی ستھرائی کا کوئی تصور نہیں تھا ہر کوئی تنگ دامانی کے حال میں مست تھا ہمارے چھوٹے سے مکان کی نچلی منزل جب مکمل ہوگئی تو دوسری منزل پر دو کمرے ڈال کر نچلی منزل کرائے پر دے دی گئی ابھی دوسری جنگ عظیم نہیں چھڑی تھی اس لیے یہ recession کا دور تھا بے کاری اور بے روزگاری عام تھی جگہ جگہ مکانات کے باہر کرائے کے لیے TOLET..... ''یعنی مکان کرائے کے لیے خالی ہے'' کے کتبے آویزاں ہوتے تھے۔ ہمارے چھوٹے سے مکان میں ہر سال نومبر دسمبر میں کشمیر سے بھاری وزن اٹھانے اور محنت مزدوری کرنے والے مزدور جنہیں ہم ہاتو کہا کرتے تھے آیا کرتے تھے یہ محنتی اور جفاکش مزدور اڑھائی من کی بوری بآسانی اٹھا کر چل پڑتے تھے لیکن یہ سر پر وزن نہیں اٹھایا کرتے تھے۔ وہ اپنے ہمراہ کشمیر ہی سے مضبوط رسیاں لاتے۔ بوری کو اپنی پیٹھ پر لاد کر مضبوطی سے باندھ کر بآسانی کھڑے ہو جاتے اور چل پڑتے کیا محنتی اور پاکباز مزدور ہوتے تھے وہ لوگ.....! نہ کسی سے غرض نہ واسطہ آنکھوں میں شرم و حیا کی روشنی، ان کے مخصوص ٹھکانے ہوتے تھے مالکان مکانات کو علم ہوتا تھا کہ اکتوبر نومبر میں یہ

لاہور آئیں گے۔ لاہور میں صرف کشمیری ہی نہیں راجستھان سے بھی مزدور عورتیں سڑکوں پر پتھر کوٹنے کے لیے آتیں۔ گرمیوں کی قیامت کی دھوپ میں جب انسان کا جسم پگھل رہا ہوتا یہ آہن صفت عورتیں گھگریوں میں ملبوس سڑکوں پر تارکول ڈال رہی ہوتیں سڑک کو کوٹ رہی ہوتیں کبھی ایسا بھی ہوتا کہ انہوں نے بچے کو جنم دیا وہیں صفائی کر کے دوبارہ کام پر جت جاتیں۔ گویا بچے کی پیدائش ایسی ہی آسان ہوتی کہ وہ کوئی کھیل ہو۔ انسان کس قدر جفاکش اور فولاد کا بنا ہوا ہے راجستھان کی ان ناقابل تصور سخت جان سنگ اسود کی بنی ہوئی ان مزدور خواتین کے بارے میں بڑے بڑے شاعروں نے نظمیں لکھی ہیں جن میں ان کی محرومیوں اور مجبوریوں کا ذکر ہے۔

یہ صرف کشمیر اور راجستھان کے مزدوروں کی بات نہیں۔ سی پی تک کے علاقے سے بھی لوگ محنت مزدوری کے لیے لاہور آتے تھے سی پی کے علاقے کے ایک مزدور کا نام صاحب علی تھا۔ لمبا تڑنگا، سانولا رنگ، داڑھی۔ بات کرتا تو ہندی بولتا تھا۔ جسے ہم پوربی کہتے تھے۔ وہ جس علاقہ سے آیا تھا وہ ہندو آبادی کا علاقہ تھا۔ جہاں مسلمان تعداد میں آٹے میں نمک سے بھی کم تھے، اس لیے یہ مسلمان ان کی تہذیب اور معاشرت کا حصہ بن چکے تھے۔ مصری حفاظ اور قراء کو بھی ہم نے اپنی مساجد میں تراویح پڑھتے اور امامت کراتے دیکھا ہے ان حفاظ کا بہت احترام کیا جاتا تھا۔

کشمیری ہاتوؤں کی آمد سے پہلے مکانات کے چھوٹے چھوٹے کمرے کرائے کے لیے خالی کرا لیے جاتے تھے ہمارے مکان کی نچلی منزل بھی انہی نیک اور پارسا ''ہاتوؤں'' کے قبضہ میں رہتی تھی۔ ہر سال جب وہ آتے تو اپنے ہمراہ ہمارے لیے سیب اور اخروٹ بطور تحفہ لاتے ان سیبوں کی خوشبو اور شیرینی کام ودہن کے ساتھ ساتھ دل و دماغ کو معطر کر دیتی۔ یہ شیرنی اور یہ خوشبو دوبارہ دیکھنے کو نہیں ملی اس وقت جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں ان سیبوں کی خوشبو یادوں کے ایک عجیب معطر شیریں تاثر کو زندہ کر رہی ہے کہتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء کے بعد جب حکومتوں نے پیداوار بڑھانے کیلئے کھادوں اور جراثیم کش ادویات کا استعمال شروع کیا تو پیداوار میں یقیناً اضافہ ضرور ہوا لیکن ان کی خوشبو اور شیرینی جس کیلئے کشمیری سیب دنیا بھر میں مشہور تھے ناپید ہو گئے اس کا تلخ تجربہ مجھے ۱۹۸۴ء میں اس وقت ہوا جب مجھے

غیر جانبدار سر براہوں (NON-ALLIGNED SUMMIT) کی کانفرنس منعقدہ دہلی میں شرکت کا موقع ملا۔

ہم جس ہوٹل میں قیام پذیر ہوئے اس کے باہر کشمیری سیب فروخت ہو رہے تھے بچپن کی یادیں مجھ پر حاوی ہو گئیں میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ یہ سوچ کر کہ یہ نعمت غیر مترقبہ دوبارہ ہاتھ آئے یا نہ آئے پانچ کلو بڑے بڑے سرخ سیب خرید لیے لیکن جب کمرے میں آ کر نہایت ذوق وشوق سے ان کی قاشیں تیار کیں اور منہ میں ڈال کر چبایا تو ان میں نہ وہ رس تھا اور نہ خوشبو، بے حد افسوس ہوا اس پر مجھے پارہ چنار اور سوات کے سیب کہیں بہتر، لذیز اور خوشبودار دکھائی دیئے۔ قیام پاکستان کے بعد ہمارے ہاں آم، کینو، سیب اور انگور، امرود اور کیلے وغیرہ جس قدر عمدہ اور لذیذ ہیں ان کی ہم قدر نہیں کرتے۔

ماں کا اپنی اولاد سے کیا رشتہ ہوتا ہے؟ انسان ہی نہیں چڑیا اور بندریا سے لے کر درندوں تک کی مائیں کیسے اپنے بچوں کو اپنے سے چمٹائے دودھ پلا رہی ہوتی ہیں ان پر اپنی محبت نچھاور کر رہی ہوتی ہیں؟ یہ مناظر کس قدر دلکش ہوتے ہیں؟ کتنے پاکیزہ ہوتے ہیں ہر کوئی اپنی دقت نظر، بصیرت اور احساس کے مطابق ان سے آگاہ ہے۔ یہ وہ موضوعات ہیں جو صدیوں سے موضوع بحث بنے چلے آ رہے ہیں اور جب تک نسل انسان اس دھرتی پر موجود ہے یہ موضوعات مختلف رنگوں اور صورتوں میں زیر بحث رہیں گے ان سب محبتوں میں اگر کسی محبت کو اولیت اور ابدیت حاصل ہے وہ ماں کی بے لوث محبت ہے، بے باک محبت ہے، والہانہ محبت ہے، لامتناہی محبت ہے اور ہر طرح کے تحفظات سے بے نیاز محبت ہے۔

میں ایک عجیب وغریب بھیانک خواب دیکھ رہا تھا ایک ایسا خواب جس کے دھندلے ڈراؤنے مناظر میرے خیالات میں آج بھی فلمی مناظر کی طرح ایک دوسرے کے پیچھے بندھے پوری تیزی سے گزرتے چلے جا رہے ہیں۔ ایک منظر دوسرے منظر سے کہیں زیادہ دھندلا متحیر کن، حواس مختل کر دینے والا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ میں جنگلوں میں بھاگتا چلا جا رہا ہوں۔ میں مکمل خوف کی گرفت میں ہوں۔ مجھ پر حملہ آور ہونے کے لیے بھیڑیئے اور جنگلی جانور بھاگتے چلے آ رہے ہیں اڑتی خاک اور دھندلے تاریک لق ودق صحرا میں مجھے کوئی منزل دکھائی نہیں دے رہی پاؤں میں کانٹے چبھ رہے ہیں خون بہہ رہا ہے لیکن میں بھاگتا چلا جا رہا ہوں...... کس منزل کی طرف......؟ منزل موہوم کی طرف......

کس ندانست کہ منزل گہ مقصود کجا است   ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آئید

مجھے بھی اس ڈراؤنے خواب کی طوالت گمشدہ منزل کی طرف لیے چلی جا رہی تھی۔ یہ دلدوز نا آشنا منزل خواب آج بھی ۶۷ سال گزر جانے کے باوجود زندہ دکھائی دے رہا ہے آج کیا میں زندگی بھر اس خواب کو اپنے آپ سے الگ نہیں کر سکا۔ آخر کار اس خواب کا سلسلہ ٹوٹتا ہے مجھے نیند سے بیدار کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے۔

''تمہاری ماں فوت ہو گئی ہے!''

میری دنیا لٹ جاتی ہے اب سوچتا ہوں بلکہ تمام عمر سوچتا ہی رہا ہوں کہ یہ خواب دراصل ایک وارننگ تھی کہ زندگی کے مصائب جھیلنے کے لیے تیار رہو۔ اب تمہاری محبتوں اور حفاظتوں کا سہارا تم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ یہی ہوا تمام عمر حوادث سے ٹکراتے گاہ ہنستے اور گاہ غم واندوہ کی گھاٹیوں میں گرد و غبار کی طرح گزر گئی۔

افسانہ

نعیم فاطمہ علوی

لاوارث

بچپن یتیمی میں، نوجوانی محرومی میں۔ جوانی مایوسی میں اور ادھیڑ عمر آسانی میں...... اور پھر اسی آسانی میں یتیمی، محرومی، مایوسی اور کچھ آسانی ورثے میں چھوڑ کر وہ رخصت ہوا......

وہ ہمیشہ سے ہی لاوارث تھا۔ لاوارث وہ ہوتا ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو۔ نہ حاصل کرنے کے لیے...... نہ تقسیم کرنے کے لیے...... اس کی زبان بہت رنگین تھی...... بلکہ رنگ رنگیلی تھی...... اس کی زبان اور منفی سوچ نے ہمیشہ ان لوگوں کو اس سے دور رکھا۔ جن کو قریب ہونا چاہیے تھا...... جو قریب ہونا چاہتے تھے۔ وہ بھی اس کی کڑوی کسیلی گفتگو سن کر دور بھاگ جاتے...... اور پھر بھاگنے والے پیچھے مڑ کر کہاں دیکھتے ہیں...... دور پہنچ کر نہ صرف قوتِ سماعت مدہم ہونے لگتی ہے۔ بصارت جواب دینے لگتی ہے۔ بصیرت کی پرچھائیاں ساتھ چلتی ہیں۔ مگر یادیں معدوم ہونے لگتی ہیں۔ انسان کے پاس اتنی فرصت نہیں کہ وہ کانٹوں کو ساتھ لے کر مسافتوں کے سنگلاخ رستے طے کرتا پھرے......

زندگی گزارنے کا فن اس وقت آتا ہے۔ جب سورج غروب ہونے کو ہوتا ہے...... اس کی مہلت ختم ہونے کو ہوتی ہے...... وہ زادِ راہ ڈھونڈتا ہے...... مگر دامن خالی...... خوفزدہ...... اور بے بس......

ادھیڑ عمر باپ نے جب جوان لڑکی سے شادی کی...... تو اوپر تلے بچے ہونے لگے...... گھر میں یہ پانچواں بچہ تھا۔ شکل واجبی رنگ کالا...... پانچویں بچے کی خوشی تو بس اتنی ہی ہوتی ہے...... جیسے سڑک پر چلتے ہوئے پانچ روپے کا سکہ مل جائے۔ جب فیملی پلاننگ کا کوئی موئثر طریقہ نہ آزمایا جائے تو ہر سال ایک نئے بچے کی آمد کوئی غیر متوقع یا انہونی چیز نہیں ہوتی۔ بس اسی طے شدہ فارمولے کے تحت وہ اس دنیا میں آ گیا...... نہ ضرورت نہ خواہش۔ باقیوں کی طرح وہ بھی پلتا رہا۔ اس کے بعد بھی یہ سلسلہ ختم نہ ہوا۔ یکے بعد دیگرے دو فرزند اور آ گئے۔ بس وہ درمیان میں لٹک کر رہ گیا۔ آخری بچہ ابھی چند مہینوں کا تھا کہ

ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا...... چھوٹے چھوٹے سات بچے اور بوڑھی ماں ...... باپ پر تو جیسے پہاڑ گر پڑا۔ ریٹائرمنٹ ہوئے بھی کئی سال ہو گئے تھے۔ بیوی تھی تو اچھا بر اسلسلہ چل رہا تھا۔ رزق تو خدا کے ہاتھوں میں ہے۔ خدا کسی جاندار کے لیے رزق کے دروازے بند نہیں کرتا۔ وہ ہی رازق ہے...... ماں کے جانے کے بعد مزید بچوں کا سلسلہ تو بند ہو گیا۔ البتہ باپ نے ان سات بچوں اور بوڑھی ماں کے ساتھ اکیلے ہی جینے کا فیصلہ کر لیا۔

خودرو پودوں کی طرح ایسے حالات میں بچوں کی پرورش زمانہ خود ہی کر دیتا ہے۔ جو سخت جان ہوتا ہے وہ اپنی جڑوں کو مضبوط کر لیتا ہے اور ناتواں پودے ہمیشہ لڑکھڑاتے ہی رہتے ہیں۔ لڑکھڑاتے ہوئے پودے پل تو جاتے ہیں۔ پروان بھی چڑھ جاتے ہیں، مگر ہمیشہ توڑ پھوڑ کا شکار رہتے ہیں۔ وہ اپنی ٹوٹ پھوٹ کا الزام بھی کبھی معاشرے کو دیتے ہیں۔ کبھی رشتے داروں کو...... زندگی بس اس کا نام ہے۔ وقت گزرتا رہتا ہے...... اگر آپ وقت کو تابع نہیں کرتے تو وقت آپ کو تابع کر لیتا ہے۔ کامیابیاں تو انہی کے حصے میں آتی ہیں۔ جو ہنستے کھیلتے لڑتے جھگڑتے انہی محرومیوں میں ڈوب کر سیپ اور موتی چن لیتے ہیں۔

وہ پڑھائی میں چونکہ اچھا نہیں تھا...... لہٰذا اس کی مثال اس پودے کی طرح تھی جس کی جڑوں میں کیڑا الگ جاتا ہے۔ یہ کیڑا اس کی سوچ پر اس طرح اثر انداز ہوا کہ اسے منفی سوچ کا حامل بنا دیا۔ وہ ہر چیز میں سے منفی پہلو نکال لیتا تھا۔ اسے دنیا کی ہر چیز بری لگتی تھی۔ وہ عجیب خوفزدہ سا انسان تھا۔ گرد و پیش پر جب بھی بس چلتا طنز و تشنیع کے تیر چلاتا۔ سب سے زیادہ تو وہ باپ کو موضوعِ سخن بناتا۔ پھر بہن بھائیوں پر طبع آزمائی کرتا۔ پڑھائی میں کمزور تھا۔ لہٰذا باپ نے بارہا کوشش کی کہ کسی طرح پڑھ لے مگر وہ میٹرک سے آگے نہ پڑھ سکا۔ باپ کے پاس اور بہت سے محاذ تھے۔ لہٰذا اس نے تنگ آ کر اسے کالے پانی پہنچانے کا فیصلہ کر لیا۔

بچہ اپنے گھر سے ماموں کے گھر پہنچ گیا۔ جس بچے کی اپنے گھر میں جگہ نہ تھی اس کی دوسرے گھر میں کہاں جگہ بن سکتی تھی اور ویسے بھی ماں کے مرنے کے بعد ننھیال کا رشتہ تو برائے نام ہی رہ جاتا ہے۔ بھائیوں پر بہن کے زندہ ہونے کا جو تھوڑا بہت اثر تھا وہ مرتے ہی زائل ہو گیا۔

مگر باپ کی بھی مجبوری تھی۔ اسے چارو ناچار یہی راستہ بچے کو ٹھکانے لگانے کا نظر آیا۔ بچہ اپنی عادتوں اور ننھیال کے ناروا سلوک سے بہت زیادہ منتشر ہو گیا۔ اس نے خودکشی کی کوشش بھی کی۔ اس کا انتقام باپ کیلئے دگنا ہو گیا۔ وہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار تو تھا ہی۔ اس نئے حالات نے اس سے جینے کی امنگ بھی چھین لی۔ باپ بے سہارا چھوڑ گیا، بہن بھائی اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہے تھے۔ کسی کے پاس بھی اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ اس معصوم اور معاشرے کے ستم رسیدہ بچے کے پاس بیٹھتا کچھ اپنی سناتا کچھ اس کی سنتا......وہ تو بس سب کے لیے ایک فالتو چیز تھی۔ اسی وجہ سے اس کی زبان نے بھی کانٹے اگلنے شروع کر دیئے۔ اس نے معاشرے میں جو سمیٹا تھا وہی اگلتا رہا۔ وہ رشتے داروں کو گالیاں دیتا۔ بہن بھائیوں کو بھی گالیاں دیتا۔ حتٰی کہ باپ کو بھی گالیاں دیتا......اس کیلئے رشتے ناطے کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ اس نے رشتوں کی مٹھاس چُھو کر بھی نہیں دیکھی تھی۔ حالات کی تلخی اور رشتوں کی چبھن زہر بن کر اس کی رگوں میں پھیلتی رہی۔ بہرحال اسی اثناء میں اسے واہ فیکٹری میں نوکری مل گئی......یوں اس کی دال روٹی کا سلسلہ چل نکلا۔ وہ کبھی کبھار گھر آتا، مگر ماحول کی گھٹن اور رشتوں کی چبھن سے تنگ آ کر واپس بھاگ جاتا۔ نہ اس کے آنے پر کسی کو خوشی ہوتی اور نہ ہی اس کے جانے پر کوئی اداس ہوتا۔

محبت کے جذبوں سے ناآشنا یہ بچہ اپنی بقاء کی جنگ لڑتا رہا۔ وہ معاشرے کو کیا دیتا معاشرے نے اسے کیا دیا تھا، بہت سے لوگ بس یونہی خودرو پودوں کی طرح زندگی گزار کر چلے جاتے ہیں۔ نوکری کرتے ہوئے کچھ سال بیت گئے تو باپ نے سوچا اس کی شادی کر دی جائے......رشتے داروں میں کوئی اسے رشتہ دینے کیلئے تیار نہ تھا۔ معاشرہ، تہذیب، سوسائٹی تو اس کھوکھلے نظام کا حصہ ہے جس میں انسان کی پرکھ رنگ، روپ اور پیسے سے کی جاتی ہے......یہاں بھی وہ غریب ملعون ہی ٹھہرا۔ بدقسمتی جب کسی کا گھر دیکھ لیتی ہے تو پھر وہاں ٹھکانہ ہی بنا لیتی ہے۔ مختلف جگہوں سے ٹھکرائے جانے کے بعد بالآخر خاندان کے بزرگوں نے ایک گھر میں رشتہ طے کر دیا مٹھائی بانٹی گئی۔

تمام بزرگ خوش تھے کہ ہم نے بہت بڑا کام کر دیا۔ بہت بڑا معرکہ مار لیا۔ وہ کام جو ناممکن تھا کر دکھایا......وہ غریب جو محبتوں کے گداز سے ناآشنا تھا۔ خوشیوں کے ذائقے سے ناواقف۔ جس نے

زندگی میں محرومیوں کے سوا کچھ دیکھا ہی نہ تھا۔ اس نے اس خوشی کو اپنے اندر سمولیا۔ دبی دبی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے مچل مچل جاتی تھی۔ اس نے دوستوں کو کچھ فخر سے کچھ شرما کے کچھ دھیرے دھیرے بتایا۔ مکمل ہونے کا احساس اس کے بدن میں سرایت ہو ہی رہا تھا کہ اچانک اسے اپنے کزن کے رنڈوے ہونے کی خبر ملی۔ اسے بہت دکھ ہوا...... وہ لرز گیا۔ برے برے خیالات اس کے ذہن کو گھیرنے لگے۔ وہ سوچنے لگا کہیں ایسا نہ ہو میری خوشیوں کا محل بھی اسی طرح مسمار ہو جائے۔

اس نے پچھلے کئی مہینوں سے جو خواب دیکھے تھے۔ وہ لرزنے لگے۔ زندگی کی اکلوتی خوشی...... کہیں ایسا نہ ہو...... کہیں ویسا نہ ہو۔ وہ بہت گھبرایا۔ مگر جلد ہی کسی طاقت نے اسے سہارا دیا...... اور یکے بعد دیگرے بہت سے لوگ اس کی نظروں میں گھوم گئے۔ جو سالہا سال سے اپنی خوش بختیوں کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے...... اس نے تمام خیالات کو بری طرح جھٹک دیا۔ اور پھر سے اپنے کاموں میں مشغول ہو گیا۔ اب وہ ایک نارمل انسان بن گیا تھا۔ اس نے ہنسنا بولنا بھی سیکھ لیا تھا۔ وہ روز شیشہ دیکھتا اس پر نکھار سا آنے لگا۔ وہ آئینہ دیکھتا اور خود ہی مسکرا کر منہ دوسری طرف موڑ لیتا...... بہت سے خیالات جنم لیتے اور اسے گدگدی کر کے ہنسا دیتے۔

زندگی گزارنے کا فن تو بس وہ جانتا ہے جو چاہنے اور چاہے جانے کے فن سے آشنا ہوتا ہے۔ چاہتیں تو زندگی کے طور طریقے ہی بدل دیتی ہے۔ چاہت تو ایک ایسی طاقت ہے جو زندگی میں توازن رکھتی ہے۔ جو زندگی کو طوفانوں سے بچاتی ہے۔ جس کے پاس محبت کی طاقت نہیں وہ دیا کبھی بھی تیز ہواؤں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

اور پھر ایکدن...... وہ کیسا دن تھا۔ کیسی صبح اور کیسی جھلستی ہوئی دوپہر تھی۔ اس نے چاقو سے اپنے آپ کو زخمی کر کے شاید یہ جاننے کی کوشش کی کہ وہ زندہ ہے...... ہاں وہ زندہ تھا۔ یہ خبر سننے کیلئے اس کی منگیتر اس رنڈوے کزن کے ساتھ بیاہ دی گئی ہے۔ اس کی رگوں میں پھیلا ہوا زہر سانپ کی پھنکار بن کر اس کو جلانے لگا۔ وہ اکیلا اپنے کمرے میں پڑا اپنی جلتی ہوئی قسمت کا تماشا دیکھتا رہا...... ٹھکرائے جانے کا غم تو وہی جان سکتا ہے جو خود ٹھکرایا گیا ہو...... ٹھکرائے گئے وجود کی نہ تو آنکھیں ہوتی ہیں نہ دل نہ

دماغ۔ وہ تو ایک لاشہ ہوتا ہے۔ چلتا پھرتا لاشہ۔ اس نے کئی دفعہ سوچا کاش کوئی اس کے بدن کے ساتھ بارود باندھ دے اور وہ تمام دنیا کو جلا دے۔ مگر وہ زندہ رہا اسی لاشے کے ساتھ اسی جسم کے ساتھ...... اسی دھڑکن کے ساتھ۔ جلنا تو مقدر ٹھہرا مگر جلانے کے لیے جو ہمت درکار ہوتی ہے وہ اس میں نہ تھی۔ وہ بے بسی کا تماشا بن کر زندگی کا زہر پیتا رہا...... اور اس کی کڑواہٹ نے اسے تمام قریبی رشتوں سے محروم کر دیا...... وہ اپنے آپ کو لاوارث ہی سمجھتا رہا۔ لے دے کے ایک بہن تھی۔ جس سے کبھی کبھار وہ دل کی بھڑاس نکال لیتا تھا۔ بہن شادی ہو کر کراچی چلی گئی۔ اور پھر اسلام آباد آ گئی۔ یہ بہن چھوٹی سی وہ ماں تھی جس نے ننھے منے ہاتھوں سے روٹیاں پکا کر ان بھائیوں کو پالا تھا۔ اس نے اتنی چھوٹی سی عمر میں روٹیاں پکانی سیکھ لی تھیں جبکہ اس کی عمر کی لڑکیاں گڑیوں سے کھیلتی تھیں۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائیوں کو اپنے ننھے منے وجود کا حصہ بنا لیا اور جب پل کر جوان ہوئی تو ان کی پناہ گاہ بن گئی۔ وہ بھائیوں کیلیے ممتا نچھاور کرتی...... محبتوں کے پھول برساتی اور بوقت ضرورت پُل صراط کا کام بھی کرتی۔

وہ اپنے اس بھائی کے زخموں کو مٹا تو نہ سکی البتہ زخموں سے اٹھنے والی ٹیسوں کو مندمل کر دیا۔ اس کے آنے سے بیمار کو قرار سا آ گیا۔ بھائی کبھی کبھار اس کے گھر آ جاتا۔ اس کا ہنستا بستا گھر دیکھ کر کبھی تو خوش ہوتا اور کبھی جل بھن کر کباب بن جاتا۔ اسے کوئی بھی چیز منتشر کر دیتی، کوئی جملہ کوئی فقرہ، کوئی لفظ، کوئی خوشی، کچھ بھی...... بہن نے ممتا کا روپ نبھاتے ہوئے تمام بھائیوں کی شادی کر دی۔ بس ایک یہی بھائی تھا۔ جس کی شادی کرتے ہوئے وہ خوفزدہ ہو جاتی۔ نجانے اس کا ردِ عمل کیا ہو۔

اس کی عمر چالیس سال سے تجاوز کر گئی...... شادی کی امید بھی دم توڑنے لگی۔ اس کی ریٹائرمنٹ بھی قریب تھی کہ اچانک ایک جگہ بات چلی لڑکی بہت غریب گھر کی تھی۔ ان لوگوں نے سوچا چلو بہن بھائی اچھے ہیں۔ زمین جاگیر بھی ہے...... رشتہ طے ہو گیا...... بادل ناخواستہ بہن نے رشتہ کر دیا۔ مگر وہ ڈانواڈول تھی...... اندر سے گھبرائی اور خوفزدہ سی۔ نجانے کیا ہو۔

اب کی بار خوشی اسے بس چھو کر گزر گئی...... لڑکی والے خوش تھے۔ مگر لڑکے والے گھبرائے ہوئے خوفزدہ...... بے وفا خوشیوں کو سنبھالنا بھی بڑے دل گردے کا کام ہوتا ہے۔ لرزتی خوشیاں عجیب

کیفیت تھی اس غیر یقینی کی فضا میں وہ ابھی خوفزدہ ہی تھا کہ اچانک ایکسیڈنٹ میں اس کا ٹخنہ ٹوٹ گیا۔

لاچار بہن کے گھر آدھمکا...... بہن بیچاری کو اس نے اپنی محرومیوں اور مایوسیوں کی لپیٹ میں کچھ اس طرح لیا کہ وہ بیچاری تڑپ اٹھی...... وہ سمجھتا تھا میری محرومیوں کے وہ تمام لوگ ذمہ دار ہیں۔ جو خود خوش ہیں ......وہ مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب چکا تھا۔ اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا......

بہن نے چپکے سے لڑکی والوں کو فون کر دیا...... یہ رشتہ ختم سمجھیں کیونکہ میرے بھائی کا ٹخنہ ٹوٹ گیا ہے اور اب وہ چل نہیں سکتا۔ آپ ہماری خاطر لڑکی کو نہ بٹھائیں......

اور پھر کچھ دیر بعد ہی فون کی گھنٹی بجی......دوسری طرف سے نسوانی آواز تھی۔ مضبوط، باہمت اور باحوصلہ عورت کی آواز...... باجی میں نازیہ بول رہی ہوں...... یہ چھوٹا سا حادثہ شادی کی تاریخ نہیں بدل سکتا۔ مجھے عزیز ہر حال میں منظور ہے......

شادی کے دوسرے سال ایک ننھا منا ساوجود بیٹے کی شکل میں ان کے گھر میں خوشگوار اضافے کا باعث بنا...... شادی کے ڈھائی سال بعد...... وہ پیٹ درد کے لیے ہسپتال میں داخل ہوا...... تمام ٹیسٹ کروانے کے بعد پتہ چلا۔ اسے کینسر ہے اور کینسر پتہ چلنے کے ایک ہفتے کے بعد نازیہ اس کی لاش پر بین کرتی ہوئی کہہ رہی تھی......

میرے شوہر نے ڈھائی سال مجھے رانی بنا کر رکھا......اس نے مجھے میرے ماں باپ سے بھی زیادہ پیار دیا۔ وہ انسان نہیں فرشتہ تھا۔ میری ہر خواہش ہر ضرورت کو پورا کرنا اس کا ایمان تھا۔ کاش کوئی مجھ سے پوچھے وہ کیا تھا۔ کوئی شوہر اپنی بیوی سے اتنا پیار نہیں کرتا ہوگا۔ جتنا میرا شوہر کرتا تھا، اے اللہ صرف ڈھائی سال اس فرشتے کے ساتھ...... صرف ڈھائی سال...... کاش وہ دیکھ سکتا کہ وہ لاوارث نہیں تھا۔ پورا شہر اس کے جنازے میں شامل تھا۔ تمام بہن بھائی رو رہے تھے۔

ایک باب ختم ہوا اور دوسرا شروع، ایک ماں کی ممتا سے محروم تھا اور دوسرا شفقتِ پدری سے ......مگر زندگی پھر یوں ہی رواں دواں...... کیا موت اختتامِ زندگی ہے؟...... موت تو آزمائش ختم ہونے کا نام ہے۔ اور زندگی صرف آج ہے...... ایک تمام خواب اور ایک تمام کہانی۔

طاہر نقوی

''چوکیدار''

آج نوری نے اس سے غیر متوقع بات پوچھی۔
اس وقت وہ اپنے کام پر جانے کیلئے تیار ہو رہا تھا۔ اس دوران نوری کا رویہ حسبِ معمول بے دلی کا رہا۔
''رات کی ڈیوٹی کب تک کرو گے؟''
یہ سن کر وہ چونک پڑا، وہ نوری کے جذبات سے بخوبی واقف تھا۔ اس سے زیادہ اسے اپنے فرض اور ذمہ داری کا احساس تھا۔
''میرا کام ہی ایسا ہے''
''دن کی ڈیوٹی لگوالو''
''بے وقوف، چوکیداری رات کو ہوتی ہے۔ دن میں اس کی ضرورت نہیں''
''رات کو میں اکیلی ڈرتی رہتی ہوں''
''فضلو کی بیوی ہوتے ہوئے ڈرتی ہو'' اس نے قہقہہ لگایا۔
نوری نے برا سا منہ بنایا تو فضلو نے اپنائیت سے کہا۔
''علاقے کے سارے چور اُچکے میرے نام سے کانپتے ہیں''
اس جواب سے بھی نوری مطمئن نہیں ہوئی اور بے بسی سے بولی۔
''کبھی غیر حاضری کرلیا کرو''
''میں نہیں گیا تو کسی کا گھر لٹ سکتا ہے، کسی کی عزت''
''تم رات بھر جاگتے ہو، یوں کب تک چلے گا''
''میں جاگتا ہوں، تب ہی علاقے کے لوگ چین کی نیند سوتے ہیں''
جانے سے پہلے وہ نوری کو روزانہ اسی طرح سمجھایا کرتا تھا مگر اس کی ایسی باتوں سے نوری کو کبھی تسلی نہ ہوتی

اور کچھ کہتے کہتے رک جاتی۔ فضلو اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتا تو کہتی۔ ''کوئی بات خود بھی سمجھ لیا کرو''

فضلو کو پڑھنے لکھنے کا شوق کبھی نہیں تھا۔ چند ابتدائی جماعتیں پڑھ کر ہی تعلیم کی طرف سے اس کا جی اُچاٹ ہو گیا۔ وہ کسی چھوٹی موٹی نوکری کی تلاش میں گھومتا رہا مگر کوئی بات نہیں بنی، اس کی مایوسی بڑھتی رہی۔ تب اس کے باپ نے اسے اپنی جگہ اسی علاقے میں چوکیدار رکھوا دیا۔ اس کا باپ طویل عرصے سے اس علاقے میں اسی کام پر لگا ہوا تھا۔ اب بوڑھاپے کی وجہ سے اس کے قویٰ جواب دے چکے تھے۔ اسی نے فضلو کو اس کام کی اہمیت اور عزت کا سبق پڑھایا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ یہ کام جاں نثاری کا ہے۔ اسے انجام دیتے ہوئے دل میں کبھی بدنیتی یا بے ایمانی کی کھوٹ نہیں آنی چاہیئے۔ اپنے باپ کے انہی اصولوں سے متاثر ہو کر فضلو نے یہ بات اپنی گرہ میں باندھ لی تھی کہ چوکیدار چوکس ہو تو مکین سکون کی نیند سوتے ہیں۔ نوری سے اس کی شادی اس کے باپ نے مرنے سے کچھ عرصہ پہلے کر دی تھی۔ پھر وہ زیادہ دن زندہ نہ رہ سکا۔ فضلو نے اپنی ایمانداری اور ذمہ داری کے سبب وہاں کے رہنے والوں کے دل جلد جیت لئے۔ انہیں اس پر اپنے گھر کے فرد کا سا اعتماد ہو گیا تھا۔ وہ اکثر ان کے ذاتی کام کر دیتا۔ اس لئے وہ لوگ اس کے ساتھ اچھی طرح پیش آتے اور بہانے بہانے سے اسے رقم دینا چاہتے۔ وہ اسے اپنی خود داری کے خلاف سمجھتا اور لینے سے صاف انکار کر دیتا۔ رقم سے زیادہ وہ اپنے کام کی تعریف سے خوش ہوتا۔ اس کے کہنے سے پہلے ہی اسے سائیکل بھی دلوا دی گئی۔ البتہ عید اور بقر عید کے تہواروں پر وہ لوگ فضلو اور اس کی بیوی کو نئے جوڑے اور عیدی اصرار کر کے دیتے تھے۔ اس کے باوجود نوری، فضلو کی موجودہ نوکری سے خوش نہ ہوتی اور اٹھتے بیٹھتے دن کے وقت کی کوئی ملازمت حاصل کرنے کو کہتی رہتی۔ وہ اسے سمجھاتا کہ بھلا اتنے کم پڑھے لکھے کو نوکری کہاں ملے گی۔ اگر ملی بھی تو نہ اس سے زیادہ تنخواہ کی ہوگی، نہ اتنی عزت کی۔ وہ اس کے جواب پر محض جھنجلاتی رہی۔

اس علاقے میں فضلو کے چوکیدار کی حیثیت سے آنے کے بعد نہ کوئی چوری چکاری ہوئی تھی اور نہ ایسی ویسی واردات۔ اس لئے اس کا ضمیر مطمئن رہتا۔ تاہم نوری کی بڑھتی ہوئی ضد کے باعث اب وہ پریشان رہنے لگا۔ کوئی دن نہ جاتا جب وہ موجودہ نوکری کو ترک کرنے پر اصرار نہ کرتی۔ اس کے شدید رویے کے باعث فضلو مجبور ہو گیا۔ اس نے وہاں کے دو ایک با اثر افراد سے اس سلسلے میں بات کی۔ وہ

محض ہوں ہاں کر کے چپ ہو رہے۔ فضلو کا خیال یہی تھا کہ وہ لوگ اس جیسے مخلص چوکیدار کو کھونا نہیں چاہتے۔ اس نے یہ بات نوری کو اپنی تعریف کے رنگ میں بتائی تو اس نے تائید نہیں کی بلکہ اس کی ہنسی اُڑانے لگی۔ فضلو نے نوری کے اس ردِعمل کو سادگی اور کم فہمی سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔

سردی کے موسم میں محلہ جلد سنسان ہو جاتا تھا۔ بجلی کے کھمبوں کی کمزور روشنی دور تک نہ پہنچتی۔ ان دنوں فضلو لمحے بھر کیلئے بھی ایک جگہ نہ ٹکتا اور تیزی سے چکر لگاتا رہتا۔ رات کے سناٹے میں اس کی گرجدار آواز گونجتی تو علاقے کی ساری گلیاں جاگ اٹھتیں۔ ایک رات معمول کے مطابق اپنی ڈیوٹی انجام دیتے ہوئے اچانک اسے نسوانی چیخ سنائی دی۔ وہ وہیں ٹھہر گیا اور آواز کی سمت متعین کرنے لگا۔ آواز سامنے والے مکان سے آ رہی تھی۔ وہ لپک کر قریب گیا اور سن گن لینے لگا۔ اب نسوانی چیخوں کے ساتھ کسی مرد کی دھمکی آمیز کرخت آواز بھی سنائی دی۔ فضلو معاملے کی نزاکت کو بھانپ گیا۔ اس سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ دیوار پھاند کر اندر کود گیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک شخص، نوجوان لڑکی پر جھکا ہوا تھا۔ لڑکی ہاتھ جوڑے روتے ہوئے معافی مانگ رہی تھی۔ فضلو نے جاتے ہی اس درندے پر اپنی لاٹھی سے حملہ کر دیا۔ وہ حواس باختہ ہو گیا۔ اسے فضلو نے آسانی سے قابو کر لیا۔ کیونکہ چور اُچکے اور غنڈے میں کبھی حوصلہ نہیں ہوتا۔ لڑکی نے اپنے آپ کو سنبھالا، اپنے ماں باپ کے بندھے ہوئے ہاتھ پاؤں کھولے اور ان کے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکالا۔ لڑکی کے باپ نے فضلو کی موجودگی میں پولیس اسٹیشن فون کر کے پولیس کو بلوا لیا۔ پولیس اس غنڈے کو گرفتار کر کے لے گئی۔ لڑکی اور اس کے ماں باپ، فضلو کے احسان مند تھے۔ ان تینوں کی آنکھوں سے ندامت کے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔ وہ ان کی ڈھارس بندھاتا رہا۔ لڑکی کے ماں باپ اس کی مالی مدد کر کے احسان کا بدلہ چکانا چاہتے تھے۔ فضلو کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اسے تو بس یہ فخر تھا کہ اس نے کسی شریف لڑکی کی عصمت پر دھبہ نہیں آنے دیا۔ اس سارے معاملے میں سورج نکل آیا۔ تب ان لوگوں سے رخصت لے کر فضلو خوشی خوشی اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ اس کے گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ فوراً سمجھ گیا کہ آج دیر ہو جانے کی وجہ سے نوری دروازے پر کھڑی اس کی راہ تک رہی ہو گی، جاتے ہی وہ نوری کو سب سے پہلے اپنا آج کا کارنامہ سنانا چاہتا تھا۔ یہی سوچتے ہوئے وہ اندر داخل ہوا تو بوکھلا کر رہ گیا۔

نوری بستر پر لٹی پٹی پڑی تھی......!!!

افتخار عارف

لَبَّیکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیک

ربِّ کعبہ کی طرف اذن و عنایت سے گیا
شکرِ نعمت کو گیا، قصدِ زیارت سے گیا

وادیٔ شہرِ مکرّم سے مدینے کی طرف
والیٔ شہرِ مدینہ کی اجازت سے گیا

سارے اسباب تو پہلے سے بہم ہو چکے تھے
حکم کی دیر تھی، حکم آیا تو عجلت سے گیا

سجدہ ریزی کی مری مشق پرانی تھی، سو میں
سجدے کرتا ہوا ہر منزلِ طاعت سے گیا

میں غلاموں کی قطاروں میں کھڑا آخری شخص
بابِ رحمت کی طرف بابِ امانت سے گیا

کہیں گریہ کیا پیہم ادب آداب کے ساتھ
کہیں وارفتگی شوق کی شدّت سے گیا

چین دیتا ہے بہت دل کو قیامِ حرمین
دل کو آرام کی حاجت تھی، ضرورت سے گیا

کتنے دُشوار مراحل تھے وہؐ جب گزرے تھے
میں بہت سہل اُسی جادۂ ہجرت سے گیا

وہ مدینے میں جو دو باغ ہیں جنت کے، اُدھر
بیعتِ سلسلۂ نُور کی نیّت سے گیا

ایسا میں کون سا شاعر ہوں مگر میرے نصیب
مدحتِ سرورِ کونینؐ کی نسبت سے گیا

سید رفیق عزیزی

اَلحمدُ

تو نے تقدیر لکھ دی نفس در نفس
حکمرانی ہے تیری نفس در نفس
روزِ تخلیق ہی مُرتسم ہو گئی
تیری عالی جنابی نفس در نفس
تو ہے مُختارِ کُل، جو بھی چاہے کرے
اپنی مَسند سجالی نفس در نفس
ہم ہیں کیا، سر بسر اک تماشا ترا
اپنی لیلا رچالی نفس در نفس
ہے محاسب بھی اس کا فقط تُو ہی تُو
جو قلمرو ہے تیری نفس در نفس
سب کو مختارِ اعمال بھی کر دیا
اور عدالت لگا لی نفس در نفس
خود کہا:۔''نورِ ارض و سماوات ہوں''
رَمزِ وحدت چھپا دی نفس در نفس
اک تجلی فنا، اک تجلی بقا
چھَب یہ رکھی نرالی نفس در نفس
اے رفیق آپ کُن کہہ کے چُپ ہو گئے
اور ، یہ آواز گونجی نفس در نفس

سہیل اختر

حمدِ باری تعالیٰ

سوچ کی دھرتی نہیں کم اے خدائے ذوالجلال
ہاں ذرا نم ، ہاں ذرا نم اے خدائے ذوالجلال
پیاس سے جب ایڑیاں رگڑیں کسی معصوم نے۔
تو نے بخشا آبِ زم زم اے خدائے ذوالجلال
تو نے دنیا کے فلک پر قدر والی رات میں
نور کے لہرائے پرچم اے خدائے ذوالجلال
تختِ یکتائی منور ہے ترے ہی نور سے
اے شہنشاہِ دو عالم اے خدائے ذوالجلال
مثلِ قرآں ایک بھی سورت نہ کوئی لا سکے
ہر فصاحت کا ہے سرخم اے خدائے ذوالجلال
وقت کی تلوار سے رِستے ہوئے زخموں کا ہے
تیرا اِسم پاک مرہم اے خدائے ذوالجلال
جن دماغوں میں بھڑکتے ہیں تعصب کے شرار
قطرہ قطرہ ان پہ شبنم اے خدائے ذوالجلال
لاکھ فرعونی تکبر ہو کہ ابلیسی انا
تیرے آگے کس کا دم خم اے خدائے ذوالجلال
جب تری حمد و ثنا کا ذہن میں آئے خیال
دل میں بج اٹھتی ہے سرگم اے خدائے ذوالجلال

محمود رحیم

حمد

سرِ نیاز لئے جب طلوع کرتا ہوں
ترے حضور خضوع و خشوع کرتا ہوں

قیام کرتا ہوں پہلے دُعا کے لہجے میں
جبینِ عجز لئے پھر رکوع کرتا ہوں

بھٹکتا رہتا ہوں اکثر میں تیری دنیا میں
پھر اپنے سجدوں میں تجھ سے رجوع کرتا ہوں

میں دست بستہ ہوں تیرے جلال کے آگے
ترے جمال کے آگے رکوع کرتا ہوں

نہ باریاب ہوں کیونکر درِ رسائی تک
درود پڑھ کے دعائیں شروع کرتا ہوں

نعت

راحت ہے جہاں سینہ بہ سینہ تو مدینہ
دل اوج پہ ہو زینہ بہ زینہ تو مدینہ

رستے ہیں سوالی کہ سفر کون سی جانب؟
پہچان ہے جب میری مدینہ تو مدینہ

دن رات بنیں تیرے لئے سال مہینے
اور میرے لئے سال مہینہ تو مدینہ

کس راہ میں آسودہ ہوئے اہلِ زمانہ!
اربابِ محبت کا سکینہ تو مدینہ

اس خاک کی مدحت میں مرے حرف ہیں عاجز
کیا بات مدینے کی 'مدینہ تو مدینہ

ع۔ق۔آور

حمد

کمالِ عشق ہے تو، عشق کا مآل بھی ہے
تو لاجواب بھی ہے، اور لازوال بھی ہے

تو اپنی شان میں یکتا ہے، بے مثال بھی ہے
تو خود جواب ہے اپنا تو ہی سوال بھی ہے

کسی نظر میں نہیں تیریِ تابِ نظارہ
ہر ایک ذرّے سے ظاہر ہے، یہ کمال بھی ہے

تو لاشریک ہے تیرا نہیں کوئی ثانی
تو خود جمال بھی ہے عظمت و جلال بھی ہے

تجھے پڑھیں، تجھے لکھیں، تجھی پہ غور کریں
تو ہی ہے امر، تو ہی وجہ امتثال بھی ہے

تجھی کو چاہیں، تجھے سوچیں، تجھکو یاد کریں
ورائے فکر ہے تو، ماورائے قال بھی ہے

جو عشق کرنا ہے آور تو عشق اُس سے کرو
جو خود ہی غم بھی ہے اور غم کا اندمال بھی ہے

سید حبیب اللہ بخاری

حمد

خداوندا تُو ہر شے میں عیاں ہے
تری قُدرت مُحیطِ دو جہاں ہے

ستارے، چاند، سورج اور فضائیں
ہر اک تخلیق کا تیری نشاں ہے

گلوں کا رنگ، خوشبو اور نزاکت
یہ سب تیرا جمالِ ضوفشاں ہے

زمین و آسمان و کرسی و عرش
یہ سب تیرے مگر تو لامکاں ہے

ملائک حُور و غلماں اور جنّت
یہ ایقانِ بشر کا امتحاں ہے

مرا ہر سانس دیتا ہے گواہی
یہ تیرے حکمِ عالی سے رواں ہے

حبیب اک راز ہے شانِ الٰہی
تُو ذرّہ ہے وہ خلّاقِ جہاں ہے

عبدالعزیز خالد

حاط حاطؐ

صاحبِ معرکۂ بدر و حُنین
فخرِ کونین، رسولُ الثقلین

روشنی بخشِ شبستانِ وجود
قصرِ شش آئینہ کی زینت و زین

قاسمِ دین و قسیمِ دنیا
پیکر و پیکِ قرانُ السعدین

شیبۃ الحمد کے دل کی دھڑکن
سیدہ آمنہ کے نُور العین

کوئی جن سانہ بنی آدم میں
خالص النسل نجیب الطرفین

کون ان سانسب و نسبت میں
کون ان سا ہے کریم الاکوین

زندگانی کی طرح موت میں بھی
ہیں جلیس انکے جنابِ عُمرینؓ

سرِّ اسرار ہے کس پر روشن
کون آگاہِ مقامِ شیخینؓ

ان کے داماد علیؓ بابُ العلم
اور عثمان غنیؓ ذُوالنورین

خویشِ جملہ بنی نوعِ انساں
وہ ابُو الفاطمہؓ، جدِّ حُسنینؓ

اہلِ احساں کی سب اولادِ ذکور
شاملِ شرحِ لغاتِ سبطینؓ

جاہلیّت کا زوال ان کا ظہور
ان کی بعثت اجلِ شورش و شین

تزکیہ نفس کا ان کا مطمح
پاکیٔ فکر و نظر نصبُ العین

ان کی تقلید تتبّع ان کا
ضامنِ فوز و فلاحِ دارین

طرفۃُ العین میں پروازِ فلک
کُن کی قدرت کا اک اعجاز ہے عَین

فاصلہ عابد و معبود میں ہے
بس باندازۂ قاب قوسین

اور انوارِ تجلّی کے سوا
کوئی پردہ نہیں حائل مابین

ہوئے کیا راز و نیاز آپس میں
کس پہ مکشوف نہانِ طرفین؟

ان کے رُویا کو نگاہیں ترسیں
ان کی رُویَت کو نگاہیں بیچین

جانے کب آئے گا ہنگامِ وصال
ہوگی کب دیدِ جمالِ حرمین

کاش کعبے میں کبھی اور کبھی
پڑھوں طیبہ میں نمازِ عیدین

بے قراری ہے کہ ہے روز افزوں
مثلِ کوئل کے میں کُوکُوں دن رین

شرحِ اوصاف سے قاصر ہے زباں
جو نہ بیباق ہوا ایسا ہے یہ دَین

بڑھ کے اورنگِ شہی سے خالد
ان کی محفل کا مقامِ نعلین!

☆ زبور میں نامِ دلنوازِ حضورؐ ہے "حاط حاطؐ" (خالد)

سید رفیق عزیزی

نعت

عُز یہہ کیا ہے؟ سِرِّ شبستانِ مصطفےٰؐ
تشبیہ کیا ہے؟ صُبحِ درخشانِ مصطفےٰؐ

کونین کیا ہیں؟ عالمِ امکانِ مصطفےٰؐ
جنت ہے کیا؟ بہارِ گلستانِ مصطفےٰؐ

ہیں سلسبیل و کوثر و تسنیم جس کے نام
ہے آبجوئے بادہ فروشانِ مصطفےٰؐ

صہبائے عشق کی ہیں سبیلیں لگی ہوئی
سُنیے صلائے عامِ خُمستانِ مصطفےٰؐ

یہ غوث ہیں، وہ قُطب، یہ ابدال کی صفیں
اللہ رے جُلوسِ حسینانِ مصطفےٰؐ

گر یہ نہیں، تو طاعتِ حق معتبر نہیں
واجب ہوئی اطاعتِ فرمانِ مصطفےٰؐ

محرومِ زادِ راہ نہ رہ جاؤں یا کریم
لے کر چلوں یہاں سے میں ایمانِ مصطفےٰؐ

اللہ یہ شرف بھی عطا ہو رفیق کو
کہلائے یہ غلامِ غلامانِ مصطفےٰؐ

اختر علی خان اختر چھتاروی

سلامِ مکرّم

سلام اُن ﷺ پر جنہیں سب خواجۂ لولاک کہتے ہیں
سلام اُن ﷺ پر گدا و شاہ کو جو بھیک دیتے ہیں

سلام اُن ﷺ پر ہوں بے حد، شافعِ روزِ جزا ہیں جو
سلام اُن ﷺ پر جنہیں سب سرورِ کونین کہتے ہیں

سلام اُن ﷺ پر کہ جبریلِ امیںؑ ہیں نامہ بر اُن کے
سلام اُن ﷺ پر فرشتے جن کے در پر سجدے کرتے ہیں

سلام اُن ﷺ پر کہ جن کا نامِ نامی اسمِ اعظم ہے
سلام اُن ﷺ پر، بھرم جو نام لیواؤں کا رکھتے ہیں

سلام اُن ﷺ پر گنہگاروں کی جن کو فکر رہتی ہے
سلام اُن ﷺ پر جو رو کر عاصیوں کو بخشواتے ہیں

سلام اُن ﷺ پر سخاوت ختم ہے جن کے گھرانے پر
سلام اُن ﷺ پر جو بے مانگے ہوئے دامن کو بھرتے ہیں

سلام اُن ﷺ پر عطا جن کو ہوا ہے چشمۂ کوثر
سلام اُن ﷺ پر جو اپنے ہاتھ سے بھر بھر پلاتے ہیں

سلام اُن ﷺ پر درودِ حق کی بارش جن پہ رہتی ہے
سلام اُن ﷺ پر سلاموں کا جواب اختر جو دیتے ہیں

عبدالجبار اثر

نعت

رہتا ہے ربط جس کا درِ مصطفےٰ کے ساتھ
آئے مشامِ جاں میں وہ خوشبو ہوا کے ساتھ

ہو آرزوئے قُرب جو ربِ کریم سے
لازم ہے لَو لگائیں حبیبِ خدا کے ساتھ

کیا پوچھتے ہو رتبۂ محبوبِ کبریا
"رحمت خدا کی آئی ہے خیر الوریٰ کے ساتھ"

غارِ حرا سے نور کی پھوٹی تھی جو کرن
ہر دور میں رہے گی حرم کی ضیا کے ساتھ

سانسوں میں جاگتی ہے مدینے کی آرزو
خوشبو اُدھر سے آتی ہے جس دم ہوا کے ساتھ

نسبت جسے حضورؐ کے نقشِ قدم سے ہے
اے کاش میری خاک ہو اس گردِ پا کے ساتھ

خاصانِ کبریا میں بڑے محترم ہیں وہ
آتے ہیں جن کے نام حبیبؐ خدا کے ساتھ

یارب ہمارے ملک میں امن و امان ہو
کہتا رہوں میں نعتِ نبی اس دعا کے ساتھ

کتنا ہے خوش نصیب اثر ایسا راہ رو
سوئے مدینہ جائے جو صدق و صفا کے ساتھ

عرش ہاشمی

نعت

وہ نعت لکھوں کہ ارفع صفات لکھی جائے
پسند انھیں بھی جو آئے ، وہ بات لکھی جائے

جو عبد کامل واکمل، خطا سے ہے معصوم
وہ ایک ذات ،وہی ایک ذات لکھی جائے

ہیں جمع حسن کے سب رنگ ان کے اُسوے میں
انھیں کی ذات جمیع الصفات لکھی جائے

جو نعتِ پاک بیاں ہو چکی ہے قرآں میں
اسی کی شرح ، اسی کی لغات[1] لکھی جائے

انہی کے صدقے، اسی نور سے بنائی گئی
تو ان کے نام نہ کیوں کائنات لکھی جائے !

ہم ان کے ہیں،تو جو کہتے ہیں، کیوں نہیں کرتے
عمل بھی چاہیے اس پر ،جو بات لکھی جائے

انہیں کے نطق کے جوہر مکارمِ اخلاق
کہ حرف حرف لکھیں بات بات لکھی جائے

نفس نفس ہو مرا مدحِ مصطفےٰ میں بسر
اُنہیں کے نام یہ ساری حیات لکھی جائے

یہ آرزو ہے کہ جو عرش میری بخشش ہو،
تو نعت لکھنا ہی وجہ نجات لکھی جائے

---

[1] لغت بمعنی بولی۔زبان۔لفظ (جمع) لغات بمعنی فرہنگ (لغات کی کتاب) صیغۂ واحد مونث میں مستعمل ہے۔ (عرش)

سید تابش الوری

نعت

رخ اپنا معین ہے مرنا ہے کہ جینا ہے
دل میں مرے کعبہ ہے کعبے میں مدینہ ہے

اللہ نے بخشی ہیں دیدار کو دو آنکھیں
اک آنکھ میں مکّہ ہے دوجی میں مدینہ ہے

مخلوق دوعالم ہے اور پار اترنا ہے
وہ نوح کی کشتی تھی یہ اُن کا سفینہ ہے

سرکارؐ کی صورت ہی کونین کا محور ہے
سرکارؐ کی سیرت ہی معراج کا زینہ ہے

انوار محمد ﷺ سے باطن میں چراغاں ہیں
یہ دل کا خزینہ ہے اور سینہ بہ سینہ ہے

تخلیق دوعالم ہی سرکار کے دم سے ہے
ان کیلئے مرنا ہے ان کیلئے جینا ہے

عظمت کی سبھی راہیں طیبہ سے نکلتی ہیں
یہ شہر مدینہ ہے افلاک کا زینہ ہے

کس کس کی طرف دیکھوں بس اسکی طرف دیکھوں
اک سمت دوعالم ہیں اک سمت مدینہ ہے

تابش کے دل وجاں پر خود نعت اترتی ہے
جو لفظ اُبھرتا ہے جذبوں کا نگینہ ہے

سلمان رضوی

شہید کا نشان

تمدّنِ دینِ مصطفےٰؐ میں جو جان ہے وہ حسینؑ سے ہے
لہولہو بزمِ عاشقاں میں جو شان ہے وہ حسینؑ سے ہے

چٹان تو اک پہاڑ تودے کا نام ہے ہر لغت میں لیکن
چٹان کے لفظ میں جو مخفی چٹان ہے وہ حسینؑ سے ہے

درست ہے آج بھی زمانے میں حریت کیش صف بہ صف ہیں
مگر نمازِ جہاد کی جو اذان ہے وہ حسینؑ سے ہے

نشانِ حیدر تو عہدِ حاضر کے غازیوں کا نشان ہوگا
''ولا تقولو'' شہید کا جو نشان ہے وہ حسینؑ سے ہے

میں اپنے سر کو نثار کرنے میں علم و عرفان کا مقلّد
مگر مری جاں سپردگی میں جو مان ہے وہ حسینؑ سے ہے

بدن حویلی کو موسموں نے نحیف بوڑھا بنادیا ہے
مگر مودّت کی آرزو جو جوان ہے وہ حسینؑ سے ہے

نہ جاننا عذرِ ناروا ہے مگر جسے علم ہے وہ قائل
کہ طائرِ لامکاں کی جو اُڑان ہے وہ حسینؑ سے ہے

ہر ایک تخلیقِ حرفِ صادق ببانگِ سلمان کہہ رہی ہے
کہ ترجمانِ کلامِ حق جو زبان ہے وہ حسینؑ سے ہے

خالد یوسف (آکسفورڈ۔ برطانیہ)

بحضور سرورِ کونینؐ

جہاں پہ دھاک ہے نمرود کی خدائی کی
جگر پہ چوٹ ہے یاروں کی بیوفائی کی
رسولِ پاکؐ ضرورت ہے رہنمائی کی

وہ آندھیاں ہیں کہ جائے پناہ کوئی نہیں
ہم ایسے بے سروسامان اب کہاں جائیں
زمانہ ساز رفیقوں کے اژدہام میں بھی
رہے جو دل سے مسلمان اب کہاں جائیں

جہاں پہ اب بھی مسلط ہے زرگری کا نظام
کہ انقلاب کی تدبیر کارگر نہ ہوئی
نہ زندگی کی ضمانت نہ منصفی کی امید
طلسمِ روس بھی ٹوٹا مگر سحر نہ ہوئی
قدم قدم پہ لٹیروں نے کبریائی کی
رسولِ پاکؐ ضرورت ہے رہنمائی کی

بتانِ غرب کے پالے ہوئے شیوخِ حرم
ہزیمتوں کی علامت یہ سرنگوں پرچم
یہ ظلمتوں کے پیمبر یہ پستیوں کے نقیب
یہ سامراج کے مُہرے یہ سامری کے حبیب
ڈبو کے شرم و حیا نیل کے سمندر میں
درِ رقیب پہ دھونی رما کے بیٹھے ہیں
بلا سے انکی جو مٹ جائیں کابل و بغداد
مزے سے قبلۂ اوّل گنوا کے بیٹھے ہیں
خودی کا دور گیا قدر ہے گدائی کی
رسولِ پاکؐ ضرورت ہے رہنمائی کی

فروغِ رزق کی تدبیر ہم کریں تو بُرے
فصیلِ شہر کی تعمیر ہم کریں تو بُرے
گلہ بھی جرم ہوا اپنی ناتمامی کا
سوالِ جنتِ کشمیر ہم کریں تو بُرے

سنا رہے ہیں شیاطیں نظامِ نو کی نوید
اُدھر زمانہ اِدھر صرف مشعلِ امید
ہر ایک سمت حکومت ہے بے حیائی کی
رسولِ پاکؐ ضرورت ہے رہنمائی کی

زمانے بھر کو یہ خیرات بانٹنے والے
خیالِ سود و زیاں سے گزر نہیں سکتے
غریب قوموں کی آزادیوں کے سوداگر
ہوس کو عشق پہ قربان کر نہیں سکتے

نہ جانے ہم پہ اجالوں کی کب نظر ہوگی
میں سوچتا ہوں کب اسؔ رات کی سحر ہوگی
ہزار جشن منائے معیشتِ بازار
تضادِ محنت و سرمایہ کیسے حل ہوگا
عوام خاتمۂ ظلم و جور مانگیں گے
عوام حق و صداقت کا دور مانگیں گے

بتانِ دیر و حرم سے تو لوگ باز آئے
نظر علامتِ توحید کی تلاش میں ہے
قدم قدم پہ ملی گمرہی ستاروں سے
زمانہ پھر کسی خورشید کی تلاش میں ہے
کوئی تو بات کرے درد آشنائی کی
رسول پاکؐ ضرورت ہے رہنمائی کی

افتخار عارف

☆

تری شوریدہ مزاجی کے سبب تیرے نہیں
اے مرے شہر ترے لوگ بھی اب تیرے نہیں

میں نے ایک اور بھی محفل میں انہیں دیکھا ہے
یہ جو تیرے نظر آتے ہیں یہ سب تیرے نہیں

یہ بہ ہر لحظہ نئی دُھن پہ تھرکتے ہوئے لوگ
کون جانے کہ یہ کب تیرے ہیں کب تیرے نہیں

تیرا احسان کہ جانے گئے، پہچانے گئے
اب کسی اور کے کیا ہوں گے یہ جب تیرے نہیں

دربدر ہو کے بھی جو تیری طرف دیکھتے تھے
وہ ترے خانماں برباد بھی اب تیرے نہیں

اب گلہ کیا کہ ہوا ہو گئے سب حلقہ بگوش
میں نہ کہتا تھا کہ یہ سہل طلب تیرے نہیں

ہو نہ ہو دل پہ کوئی بوجھ ہے بھاری عارف
بات کہنے کے یہ انداز، یہ ڈھب تیرے نہیں

اکبر حیدر آبادی (آکسفورڈ۔ برطانیہ)

☆

اگرچہ دشت میں سودائے برگِ تر تھا مجھے
سفر امید کا کب رائگاں سفر تھا مجھے

پڑاؤ ڈالتا میں اس زمین پر کیسے
جہاں قیام بھی خود صورتِ سفر تھا مجھے

طرح طرح کے مصائب بدن سے تھے منسوب
بدن ہی سب سے بڑا بوجھ جان پر تھا مجھے

سنی ہیں باتیں سب اس کی مروتاً میں نے
اک اختلاف مگر بات بات پر تھا مجھے

نہ تھا نگاہ میں اندیشۂ غنیم کوئی
کہ اپنے آپ سے تھا جس قدر بھی ڈر تھا مجھے

ہوئی نہ خشک ترے خط کی روشنائی کبھی
ہر ایک لفظ ترا سرمۂ نظر تھا مجھے

لہو میں جل اٹھے جیسے کئی چراغ اکبر
کہ جیسے دل مرا اک روشنی کا گھر تھا مجھے

مرتضٰی برلاس

☆

کوئی نغمہ خوشی کا ہو رقم کیا
یہاں اب ہے بجز رنج و الم کیا

جوازِ خامشی بس بے بسی ہے
ہے مظلوموں کی حدِ ضبطِ غم کیا

جو تم کو بھی ملے، تم سا ہی کوئی
تو پھر سمجھو گے ہوتا ہے ستم کیا

بڑھیں حیرانیاں جتنا بھی سوچا
ہماری آگہی کیا اور ہم کیا

چلے گا کون اب ان راستوں پر
تو ہم چھوڑیں یہاں نقشِ قدم کیا

ستم گاروں کے ہیں جتنے قبیلے
ہیں بے حس ان کے سب اہلِ قلم کیا

کسے سب حسبِ خواہش مل سکا ہے
کریں پھر اپنی محرومی کا غم کیا

☆

جو دشمنِ جاں ہم کو مٹانے میں لگے ہیں
ان لوگوں کے ہم ناز اٹھانے میں لگے ہیں

گردن ہے کہ اب تن سے جدا ہونے لگی ہے
اور ہم ہیں کہ دستار بچانے میں لگے ہیں

دشمن کی خوشی ٹھیک کہ جیت اس کی ہوئی ہے
ہم ہار کے کیوں جشن منانے میں لگے ہیں

مانا ہے ہوا تیز، مگر دکھ ہے تو یہ ہے
پروانے بھی اب شمع بجھانے میں لگے ہیں

مسمار تو کر سکتے ہو پل بھر میں یہ لیکن
برسوں ہمیں اس گھر کے بنانے میں لگے ہیں

وہ لوگ جو محرومِ سماعت ہیں ان ہی کو
ہم قصۂ غم اپنا سنانے میں لگے ہیں

نیند اڑ گئی جن لوگوں کی آنکھوں سے انہیں آپ
فردا کے حسیں خواب دکھانے میں لگے ہیں

پروفیسر سحر انصاری

☆

کون کسی کا ساتھ نبھائے کس کو اتنی فرصت ہے
اپنی اپنی دوزخ ہے اور اپنی اپنی جنت ہے

برف میں کتنی آگ چھپی ہے، ہم ہی بتائیں گے یہ بھی
ہم کو ہے اندازہ صاحب لفظ کی کتنی حُرمت ہے

دل کو تسلی ہو جاتی ہے لب پہ نہیں آتا شکوہ
کچھ تو بھلا چاہا تھا اُس کا جس کو ہم سے عداوت ہے

کس کو پذیرائی ملتی ہے چاک گریباں ہونے سے
بستی بستی دشت ہے اور صحرا صحرا وحشت ہے

کوئی دھوپ میں بیٹھ کے خوش ہے، کوئی سایے میں آ کر
اپنا اپنا موسم ہے اور اپنی اپنی طبیعت ہے

ہم کو کیا جو حال بتاتے جائیں کسی کے سجدوں کا
اُس کا خدا ہی واقف ہوگا جس کی جیسی عبادت ہے

کوئی نیا اندازِ تخاطب ہاتھ نہیں آتا ہے سحؔر
یہ کہنا بھی مشکل ہے اب "مجھ کو تم سے محبت ہے"

ڈاکٹر خیال امروہوی

☆

ہر اک مقام پہ عنواں مرا جلی تو رہا
میں جس طرح بھی رہا پیروِ علی تو رہا

ہر ایک فرد نے دہرائے میرے افسانے
مرے گناہ کا چرچا گلی گلی تو رہا

خلوص جل تو گیا نفرتوں کے شعلوں میں
وہ پائیدار تھا خوشبو میں صندلی تو رہا

جمال ہاتھ نہ آیا گرفت ڈھیلی تھی
حدودِ ذہن میں اک رنگ مخملی تو رہا

نہ آئی مصلحت اندیشیوں میں بے باکی
غلامِ عہد کا دستور بزدلی تو رہا

شراب نوش تھا بدنام ہی رہا غالبؔ
وہ اپنے دورِ خدا مست میں ولی تو رہا

سید مشکور حسین یاد

☆

ایسی فراخ کب ہوئی عرصۂ دُوں کی مملکت
آج ہے جس طرح وسیع حالِ زبوں کی مملکت

اتنی تو آدمی کی خاک اڑنے نہ پائی تھی کبھی
دیکھی ہے ہم نے دربدر جتنی دروں کی مملکت

وحدتِ رنگ کا کرے ہم سے تقاضا کیا غضب
لحظہ بہ لحظہ گُل فشاں گردشِ گوں کی مملکت

اور ذرا نہ بھیگ پائے دامنِ جدّتِ خیال
اور درُوں پہ بار بار برسے بروں کی مملکت

اس کے خرامِ ناز کا ساتھ ہمیں نہ دے سکے
کیا کیا نہ عشوہ زن رہی کُن فیکوں کی مملکت

حرکتِ صد ستارۂ عزم سے باریاب ہے
عُزلتِ اضطراب میں محو، سکوں کی مملکت

عالمِ اِلاّ ہُو کو یاد دیکھتے جایئے ضرور
لا کے ہجوم میں ہو لاکھ اپنے جنوں کی مملکت

☆

عالم بالا سے والا اعلیٰ سے اعلیٰ زاد سفر ہے
اُس کے حضور میں جانا جو ٹھہرا عرشِ معلیٰ زادِ سفر ہے

کہنے کو تو صحرا صحرا دریا دریا زادِ سفر ہے
بس یوں سمجھو خشک و تر کا ایک اک حصہ زادِ سفر ہے

کس کو چھوڑیں کیسے نہ چھوڑیں ہم سے یہ دیکھا نہیں جاتا
اسی لئے تو اپنے جلو میں ساری دنیا زادِ سفر ہے

ضو پر ضو ہے اپنی زد میں رو پر رو ہے ظلم کی زد میں
اب ہمیں کا ہے کی فکر ہو جبکہ دیدۂ بینا زادِ سفر ہے

ہم پھر کیسے بھٹک سکتے ہیں جاناں! ظلمت کی راہوں میں
جبکہ ہمارے ساتھ تمہارا چاند سا مکھڑا زادِ سفر ہے

اب تو جیسی بھی چاہیں گے ویسی چال چلیں گے یارو!
بیگم بادشہ رہ گئے پیچھے حُکم کا یکّا زادِ سفر ہے

ہم سے بڑھ کر کوئی رئیس مسافر کیا ہو گا مشکور
جتنا جتنا چاہئے ہم کو ساتھ میں اُتنا زادِ سفر ہے

مضطر اکبرآبادی

☆

اُدھر وہ ہیں کہ جنھیں کچھ مرا خیال نہیں
اِدھر یہ حال کہ مقدورِ عرضِ حال نہیں

میں جانتا ہوں کہ جو دل شکن ملے گا جواب
اسی لئے مرے لب پر کوئی سوال نہیں

عروج ہے کہ بدستور ہے زوال پذیر
زوال ہے کہ جسے کچھ غمِ زوال نہیں

ٹلی ہے موت کب انساں کی چارہ جوئی سے
یہ ہے وہ زخم جو محتاجِ اندمال نہیں

غمِ زمانہ بھی فرسودہ ہو چکا ہے بہت
غمِ زمانہ بھی اب میرے حسبِ حال نہیں

ترے خیال کی جنت کی بن سکے جو حریف
زمیں پر ایسی کوئی جنتِ خیال نہیں

یہ انقلابِ زمانہ نہیں تو پھر کیا ہے
جو کل تھے آج وہ دنیا کے خدّ وخال نہیں

سفر میں صدیوں سے مصروف یہ زمانہ ہے
ذرا بھی رخ پہ مگر، گردِ ماہ و سال نہیں

مزاجِ یار میں شامل ہے اور تو سب کچھ
اگر نہیں ہے کوئی شے تو اعتدال نہیں

وہی ہیں دیدہ و دل آج بھی مگر ان پر
وہ عکس ریزیٔ آئینۂ جمال نہیں

مرے لیے تو ہے مضطر یہ ایک عام سی بات
شکستِ دل کا ذرا بھی مجھے ملال نہیں

پروفیسر خیال آفاقی

☆

پہلے زمینِ شوق میں عزمِ سفر اُگا
پھر کہکشاں کے جیسی کوئی رہگزر اُگا

ذات و انا کی بڑھتی ہوئی فصل کاٹ کر
عجز و نیاز و خُلق کے شیریں ثمر اُگا

ویران شب کی اونگھتی بنجر زمین میں
مرجھا سکے نہ دھوپ جسے وہ سحر اُگا

یا بڑھ کے آسماں سے ستاروں کو توڑ لے
یا اپنی ہی زمین میں شمس و قمر اُگا

اِک شہرِ بے فصیل اُگا اپنے آس پاس
یا قریۂ نظر میں نئے بام و در اُگا

محلوں کے خواب کس لئے کرتا ہے تخم ریز
مٹی کا آدمی ہے تو مٹی کے گھر اُگا

اندر سے پھوٹنے دے تصوّر کی کونپلیں
آئینۂ خیال میں عکسِ نظر اُگا

مردے بھی جس کی چھاؤں میں بیٹھیں تو جی اٹھیں
دشتِ جنوں میں کوئی تو ایسا شجر اُگا

سادہ سے لفظ اڑنے لگیں بن کے تتلیاں
رنگِ نگارشات میں خونِ جگر اُگا

سن کے خمیر دشت بھی ہو جائے باغ باغ
اپنی نوا میں ایسا بھی کوئی اثر اُگا

بے گریہ پھولتی ہے کہیں کشتِ جاں خیالؔ
تو لاکھ اپنی ذات میں تخمِ ہنر اُگا

سید نواب حیدر نقوی راہی

☆

منزل کی راہ لیں کہ ٹھہر جانا چاہیے
اے کاروانِ شوق کدھر جانا چاہیے

گر حرفِ شکر نوکِ زباں تک نہ آ سکے
اک نغمۂ فغاں ہی بکھر جانا چاہیے

جب گر ہی جائے ہاتھ سے جامِ مئے حیات
دیوانہ وار جی سے گزر جانا چاہیے

چہروں پہ اعتبارِ سحر کا سماں رہے
تہذیب جاں کو اور سنور جانا چاہیے

راہِ مراد میں شجر اشجار گر نہیں
پھر دھوپ کو بھی سر سے اُتر جانا چاہیے

آوارگیٔ شوق کا کیا کیجیے اہتمام
کوچے میں اس کے خاک بہ سر جانا چاہیے

راہی سراب دشتِ طلب میں ہیں جا بجا
اور لو ہے ہمکو لوٹ کے گھر جانا چاہیے

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد

☆

دل کو کسی گمان میں رکھا نہیں کبھی
تیر ستم کمان میں رکھا نہیں کبھی

شوقِ نمو کو ہم نے بکھرنے نہیں دیا
خوفِ زوال اُڑان میں رکھا نہیں کبھی

خود کو قتیل فتنۂ ہجراں سمجھ لیا!
تُجھ کو تو امتحان میں رکھا نہیں کبھی

صحرا کو تیرے ذکر سے سرشار کر دیا
خوشبو کو گلستان میں رکھا نہیں کبھی

تیرا خیال نقشِ تمنا بنا رہا!!!
دُنیا کو ہم نے دھیان میں رکھا نہیں کبھی

پھرتے رہے تلاشِ محبت میں کو بہ کو
خود کو کسی مکان میں رکھا نہیں کبھی

حرفِ دُعائے وصل کو جو معتبر کرے
وہ ذائقہ زبان میں رکھا نہیں کبھی

محشر زیدی

☆

دلِ مضطر کہیں کس سے کہ ارمانوں پہ کیا گزری
سِلے تھے جن کے لب ان سوختہ جانوں پہ کیا گزری
وہ اہلِ دل جہانِ لفظ و معنی جن کے تابع تھا
جو دارائے قلم تھے ان سخندانوں پہ کیا گزری
قدم جنکے زمیں پر تھے وہ ہر تلخی کے شاہد تھے
پریزادوں کو کیا معلوم انسانوں پہ کیا گزری
خدا کی مملکت میں آئے تھے یادِ خدا کرنے
کہو! اس کشورِ ایماں میں ایمانوں پہ کیا گزری
وہی، فطرت نے جنکو روشنی سے عشق بخشا تھا
سو اے شمعِ وطن۔ اُن تیرے پروانوں پہ کیا گزری
بتا! آدھی صدی کے اقتدارِ باغبانی سے
مری صبحِ وطن تیرے گلستانوں پہ کیا گزری
گئے تھے گھر سے ناموسِ وفا کی لاج رکھنے کو
خبر تو لاؤ ان غیرت کے دیوانوں پہ کیا گزری
جو زندہ آج پیرِ میکدہ ہوتا تو بتلاتا
صراحی کا ہوا کیا حشر، پیمانوں پہ کیا گزری
بجا دل میں ترے سارے جہاں کا درد ہے محشرؔ
بتا کم بخت تو بھی تیرے ارمانوں پہ کیا گزری

خالد یوسف (آکسفورڈ۔ برطانیہ)

☆

وہ تیرگی ہے سرِ رہگزر خدا کی پناہ
خود اپنی ذات ہے نا معتبر خدا کی پناہ
چراغِ دل کو نہیں خوف آندھیوں کا مگر
مقابلے پہ ہیں شمس و قمر خدا کی پناہ
نہ جانے کیسے بُرے وقت گھر سے نکلے تھے
ہرا ہے آج بھی زخمِ سفر خدا کی پناہ
وفا نے جن کو تراشا تھا اپنے ہاتھوں سے
بکھر رہے ہیں وہ دیوار و در خدا کی پناہ
خدا کا خوف تو اب بھی نہیں اسے لیکن
قدم قدم پہ رقیبوں کا ڈر خدا کی پناہ
جنابِ شیخ فرشتوں سے بڑھ گئے اُب تو
فریب کھائے کہاں تک بشر خدا کی پناہ
کیا جو مہرِ درخشاں کا تذکرہ ہم نے
رقیب ہو گئے شام و سحر خدا کی پناہ
زمیں جواب نہ دیتی تو صبر آجاتا
شجر ہزار مگر بے ثمر خدا کی پناہ
قدم قدم پہ قیامت ہے شہر میں خالدؔ
ہر آفتاب کا نیزے پہ سر خدا کی پناہ

انور شعور

☆

ایسی نوازشات کہاں تھیں بھلا کبھی
ہم سے نہیں ہوئے تھے وہ اتنے خفا کبھی

اُس بت کو دیکھ کر ہمیں اللہ کے سوا
آتا نہیں خیال کسی اور کا کبھی

ہوتا ہے سب کے ساتھ کوئی حسنِ اتفاق
لیکن ہمارے ساتھ نہیں ہو سکا کبھی

توبہ پہ کاربند رہیں گے تمام عمر
ہم سے یہ نیک کام اگر ہو گیا کبھی

کرتی ہے مشتعل تمہیں ہر بات کیوں شعور
ٹھنڈے دل و دماغ سے تم سوچنا کبھی

☆

جناب کے رُخِ روشن کی دید ہو جاتی
تو اس فراق کے مارے کی عید ہو جاتی

کہاں کھُلا وہ دریچہ مگر نہیں دیکھا
کہ چشمِ شوق کبھی نا اُمید ہو جاتی

مشاہدے کے لیے فاصلہ ضروری ہے
قریب آ کے وہ صورت بعید ہو جاتی

زمین کو نہ بناتی بہشت نوعِ بشر
تو نیک بخت جہنم رسید ہو جاتی

اگر شعور کو میں رازِ دل بتا دیتا
تمام خلقِ خدا مستفید ہو جاتی

اویس جعفری (سیاٹل۔امریکہ)

☆

گل، قفس، صیاد، گلچیں، آشیاں، گلشن، بہار
بیڑیاں، زندان، مقتل، حرفِ حق، منصور، دار

عشق، صحرا، سنگ، منزل، پاؤں، چھالے، دشت، خار
سر، جنوں، سودا، الم، آشفتگی، سینہ فِگار

آنکھ، کاجل، زلف، بادل، چاندنی، رُخسار، یار
وَصل، آنچل، رنگ، خوشبو، ناز، زیبائی، نگار

جام، مینا، میکدہ، خُم، تشنگی، ساقی، قرار
کیف، صبا، شوق، مستی، بے خودی، توبہ، خمار

رت جگے، ہمجولیاں، عہدِ وفا، قول و قرار
رخصتی، بندھن، پیا، سہرا، ملن، ڈولی، کہار

آرسی، آویزے، پائل، آئینہ، سولہ سنگھار
چشم، ترکش، تیغ، ابرو، دل ہدف، شاعر شکار

یاد، آہٹ، رات، فُرقت، یاس، جاناں، انتظار
درد، بیتابی، تصور، غم، اُویس، اُختر شمار

صابر عظیم آبادی

☆

نبھانے کا ارادہ ہے تو وعدہ کر لیا جائے
چلو مل کر غمِ اُلفت کو آدھا کر لیا جائے

اندھیری شب کا خطرہ ہے تو ایسا کر لیا جائے
کسی جگنو کی بانہوں کو سہارا کر لیا جائے

یہاں کانٹے بھی اُگتے ہیں، یہاں کلیاں بھی کِھلتی ہیں
انہیں کے درمیاں رہ کر گزارا کر لیا جائے

گلابی رُت بھی آئے گی کِھلیں گے پھول بھی لیکن
ابھی اس زرد موسم کا نظارہ کر لیا جائے

یہ شہرِ اجنبی ہے تو چلو ہم ایسا کرتے ہیں
کسی بھی شخص کو اپنا شناسا کر لیا جائے

بھروسے کے نہیں لائق کوئی انسان ہے پھر بھی
یہ دنیا ہے تو لوگوں پر بھروسا کر لیا جائے

لگایا جائے اندازہ اندھیری رات کا پہلے
پھر اسکے بعد اشکوں کو ستارہ کر لیا جائے

(نوٹ) جناب اویس جعفری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی تہذیب و معاشرت اور تعلیم و تربیت کا ایک نقشِ جمیل بن کر گزشتہ کئی دہائیوں سے ریاست ہائے متحدہ میں رہائش پذیر ہیں، اُردو شعر و ادب سے والہانہ تعلق کے سبب ادبی سرگرمیوں بالخصوص عالمی سطح کے مشاعروں کا محور و مرکز سمجھے جاتے ہیں جن کی منظوم نظامت اُن کا منفرد اعزاز ہے جیسا کہ زیرِ نظر غزل اُنکے فکر و فن کی غماز بھی ہے اور ان کے ادبی مقام و منصب کا نشانِ امتیاز بھی۔ (ادارہ)

محمود رحیم

☆

شب گزشتہ عجب طور انہماک رہا
کہ رُوح چاک بنی، جسم آب و خاک رہا

پھر ایک دائرہ در دائرہ سفر ٹھہرا
جو گاہ چاک پہ تھا، گاہ زیرِ چاک رہا

میں اپنے ہونے نہ ہونے کی اک الجھن میں
اور ایسا ہونا نہ ہونا بھی دردناک رہا

برا ستارہ تھا میں منظروں کے گھیرے میں
رفاقتوں میں بھی وہ شخص بے تپاک رہا

بہم نہ ہو سکی قالب سی بے خودی مجھ کو
نفس ٹھیک جینے کا نسخہ تھا، وہ بھی خاک رہا

☆

کیا تمنا کروں نباہنے کو!
میری یہ عمر کم ہے چاہنے کو

آ حدِ ممکنات پار کریں
وقت کو چھوڑ دیں کراہنے کو

اہلِ ثروت تو باشرف ہی رہیں
مفلسی رہ گئی اُلاہنے کو

توڑ دی اس نے عدل کی زنجیر
رہ گئی کیا اساس چاہنے کو

باطل اک آن میں بپا ہو رحیم
عمریں درکار ہیں سراہنے کو

امین راحت چغتائی

☆

تسلیم ہمیں، وہ کہ ہیں ہر کام سے واقف
بس ایک نہیں اپنے ہی انجام سے واقف

اِس گردشِ ایام کا ادراک اُنہیں کیا
جو صبح سے واقف نہ کسی شام سے واقف

پیمانِ رفاقت میں دلائل بھی تھے حائل
ہم فرشِ زمیں سے، وہ رہے بام سے واقف

جو شاخِ شجر سے کبھی اترے نہ زمیں پر
کیا ہوتے وُہ ہم رنگِ زمیں دام سے واقف

اب اُن سے تعارف بھی اگر ہو تو بھلا کیا
وہ نام سے واقف نہ مرے کام سے واقف

چپ چاپ چلا جا کسی جنگل کی گپھا میں
راحت ہے یہاں کون ترے نام سے واقف

☆

جو فقط اپنے نام سے واقف
وہ رموزِ کلام سے واقف!

وہ بھی کہلائے میرِ میخانہ
جو صراحی نہ جام سے واقف

اِک تنگ و دو ہے بس مراتب کی
کون اب کس کے کام سے واقف

دیکھ کر رزق وہ اتر آئے
کب پرندے تھے دام سے واقف

اہلِ محفل میں کوئی تو ہوتا
گردشِ صبح و شام سے واقف

بس یہی ایک جرم تھا اپنا
ہم کہ تھے اپنے کام سے واقف

کرامت بخاری

☆

شہرِ خوباں کی خبر لائے گا کون
بعد میرے اس طرف جائے گا کون

جُز تحیّر کچھ نہیں کون و مکاں
ہاں مگر یہ راز سمجھائے گا کون

دِل کے اندر بھی اندھیرا ہے بہت
روشنی اے روشنی لائے گا کون

آئینہ ہے مصلحت سے بے نیاز
آئینے سے جھوٹ بلوائے گا کون

گِھر گیا ہوں اپنے گھر کے درمیاں
اب مری امداد کو آئے گا کون

وسعتوں کی قید میں آزاد ہوں
میری آزادی سمجھ پائے گا کون

☆

جب ہُمائے سخن نے پر کھولے
زندگی رو رہی تھی سر کھولے

ریگ زارِ جنوں میں یاد اُس کی
مُجھ پہ آسائشِ سفر کھولے

وہ اگر ہے کہیں تو دے آواز
پھر رہا ہوں میں چشم تر کھولے

طائرانِ طلب ہیں خوابیدہ
اپنی منقار زیرِ پر کھولے

کُچھ نہ پائے گا جو تحیّر کے
رازِ ہستی اگر بشر کھولے

دِل سے چاہوں کہ میرے دِل کی گرہ
کوئی آئے اور آن کر کھولے

احتشام ادیب

☆

میرے اندر چھپا میری ہی ذات سے بدگماں کون ہے
راز کھلتا نہیں کہ پسِ پردۂ جسم و جاں کون ہے

ختم ہو گا کبھی یہ سفر یا نہیں کچھ پتہ تو چلے
تیرے پیشِ نظر اے مرے صاحبِ کارواں کون ہے

عکس در عکس یہ رقص میں کون ہے بولتا کیوں نہیں
پڑ رہی ہیں یہ دیوار پر کس کی پرچھائیاں کون ہے

یہ سماعت میں رس گھولتی پے بہ پے کس کی آواز ہے
یہ نہاں خانۂ روح میں جاگزیں نغمہ خواں کون ہے

دھیرے دھیرے مری سمت بڑھتی ہوئی کیسی آہٹ ہے یہ
بڑھتی جاتی ہیں کیوں یہ مرے دل کی بے چینیاں کون ہے

کس کے ہاتھوں کا آنکھوں پہ یہ لمس ہے کس کی خوشبو ہے یہ
تُو نہیں ہے اگر تو مرے پاس اے جانِ جاں کون ہے

منظور ہاشمی (علی گڑھ، انڈیا)

☆

رت بدلنے کا یقیں اور حوصلہ رکھ آئے تھے
سوکھتی شاخوں پہ اک پتہ ہرا رکھ آئے تھے

جانی پہچانی ہوئی شکلیں، کہاں گم ہو گئیں؟
ہم اندھیرے راستوں میں بھی دیا رکھ آئے تھے

دور تک پھیلا ہوا تھا عرصۂ ہجر و وصال
دید و دوری، سلسلہ در سلسلہ رکھ آئے تھے

اور تھا بھی کیا، ہمارے پاس، دینے کے لئے
گھر سے چلتے وقت اک حرفِ دعا رکھ آئے تھے

زخم بھرتے بھی گئے کچھ اور کھلتے بھی گئے
وحشتوں میں اس کے دامن کی ہوا رکھ آئے تھے

تھا سوالوں کا جواب، اس راستے ہی میں مگر
درمیاں اک حجرۂ دشتِ بلا رکھ آئے تھے

عقیل دانش (لندن)

☆

فغاں بلبل غم بیگانگی سے آج بھی ہیں
خود اپنے شہر میں ہم اجنبی سے آج بھی ہیں

نظر سے دور ہوئے کتنے سال بیت گئے
تصورات کے رشتے کسی سے آج بھی ہیں

شکستہ قلب و شکستہ نظر سہی لیکن
کئی امیدیں اسی آدمی سے آج بھی ہیں

جنوں نے کتنے چراغوں کو روشنی بخشی
ہزار فتنے مگر آگہی سے آج بھی ہیں

نہیں ہے جرأتِ خندہ لبی ابھی دانش
کہ ان کے رخ پہ گہر شبنمی سے آج بھی ہیں

☆

خوشی کے رنج کے آثار کم نہیں ہونگے
یہ اور بات کہ دنیا میں ہم نہیں ہونگے

ہمیں یقیں ہے کہ ہم پر ستم تمام ہوئے
ہمارے بعد کسی پر ستم نہیں ہونگے

دلوں کا خون فراہم کرو چراغوں کو
کہ یوں اندھیرے کے آثار کم نہیں ہونگے

جو مسئلے غمِ جاناں سے پرورش پائیں
وہ مسئلے غمِ دوراں میں ضم نہیں ہونگے

یہ چار تنکے نشیمن کے چُن رکھو دانش
یہ چار تنکے بھی شاید بہم نہیں ہونگے

سید صفدر حسین جعفری

☆

اور مجھے کتنا جینا ہے سوچتا ہوں
کتنا زہر مجھے پینا ہے سوچتا ہوں

اس کے بعد نہیں ہوں یا ہوں کیا معلوم
جانے کونسا یہ زینہ ہے سوچتا ہوں

میں نے تجھے اور تو نے مجھے کب جانا ہے
دل اندھا ہے یا بینا ہے سوچتا ہوں

بینائی کی باتیں سنگ وحشت کے ساتھ
نابینا تو نابینا ہے سوچتا ہوں

عکس کے اندر کیا ہے کچھ معلوم نہیں
آئینہ تو آئینہ ہے سوچتا ہوں

جانے کیا صورت نکلے تکمیل کے بعد
تخمینہ تو تخمینہ ہے سوچتا ہوں

سنگ وحشت مجھے اب ایک سے لگتے ہیں
یہ جہلم [1] ہے یا دینہ [2] ہے سوچتا ہوں

ساری بلائیں ایک سی لگتی ہیں صفدرؔ
یہ جُولی ہے یا جینا ہے سوچتا ہوں

سلیم زاہد صدیقی

☆

چلو مانا کہ جو کچھ آج ہے وہ کل نہیں ہوگا
تو کیا زنداں نہیں ہوں گے، کوئی مقتل نہیں ہوگا

نہ پانی بند ہوگا تشنہ کاموں پر لب دریا
تفنگ و تیر کی زد پر کوئی چھاگل نہیں ہوگا

ہر اک چہرہ دمکتا چاند ہوگا۔ پھول سا تازہ
پریشانی سے ماتھے پر کسی کے بل نہیں ہوگا

مقابل پھر یہاں سہراب و رستم ہونے والے ہیں
مگر میں شرطیہ کہتا ہوں یہ دنگل نہیں ہوگا

پرندے روٹھ جائیں گے، درندے پھاڑ کھائیں گے
اماں بستی نہ پائے گی اگر جنگل نہیں ہوگا

زمیں کی تشنگی گر خون اور آنسو بجھا دیں گے
ابد تک آسماں پہ پھر کبھی بادل نہیں ہوگا

گلابوں پر کبھی بارود کی تہہ جم گئی لوگو
کسی کے دکھ پہ کوئی دل کبھی بیکل نہیں ہوگا

بہت ممکن ہے یہ سب ہو بھی جائے ایک دن لیکن
یقیں کر لیجئے زاہد کہ یہ سب کل نہیں ہوگا

---

[1] [2] پاکستان کے صوبہ پنجاب میں جہلم ایک ضلعی صدر مقام اور دینہ تحصیل کی سطح کا قصبہ ہے۔ "سنگ وحشت" اس خطے کے کہساتی تشخص کے اظہار پر مبنی علامتی الفاظ ہیں۔ (ادارہ)

حسیر نوری

☆

اجنبی شہر میں تھا، کوئی تو رشتہ نکلا
پیاس جب حد سے بڑی دشت میں دریا نکلا

جب جلانے لگی سورج کی تپش جسم مرا
میرا ہمدرد مرے جسم کا سایہ نکلا

اپنے ہونے کا بھی احساس بھلا کیونکر ہو
گھر جو اک ہم نے بنایا تھا گھروندا نکلا

پیش گوئی مری کرتا نہیں کوئی تسلیم
میں نے جو حرف لکھا بعد میں سچا نکلا

آگ، میں دل میں چھپائے ہوئے پھرتا تھا مگر
کیا کروں آہ بلب دل سے بگولا نکلا

منکشف مجھ پہ ہوا ہے تو مجھے حیرت ہے
جو ہے دشمن مرا دیرینہ شناسا نکلا

آئینہ دیکھا تو اندازہ ہوا مجھکو حسیر
آئینے میں تو کسی اور کا چہرہ نکلا

ثمر بانو ہاشمی

☆

کوئی بھی درد آشنا نہ ملا
دل ملا دل کا مدعا نہ ملا

خود سہارا دیا اسے تو نے
جس سفینے کو ناخدا نہ ملا

آپ کی بزم کے چراغوں کا
دل کے داغوں سے سلسلہ نہ ملا

ہم دل افسردہ جس چمن میں گئے
کوئی غنچہ کھلا ہوا نہ ملا

ہم نے دل پر نظر نہ کی جب تک
تیری منزل کا راستہ نہ ملا

دلِ ناکام ' دیدۂ پرنم
آدمی کو جہاں میں کیا نہ ملا

اے ثمر! زندگی ہے یا فریاد
کوئی بھی ساز بے صدا نہ ملا

ضیاء الحسن ضیاؔ

☆

ہر چند زیست مقتلِ شام و سحر میں ہے
جینے کا شوق پھر بھی خمیرِ بشر میں ہے

وہ صبحِ نُور تیری جبیں سے جو ہو طلوع
خود اس کا انتظار، دلِ ہر سحر میں ہے

اِس طرح دیکھنے سے تو بنتی نہیں ہے بات
ہاں ہاں تری نگاہ بھی میری نظر میں ہے

یہ اور بات قصد ہی پَرواز کا نہ ہو
یک گونہ حوصلہ تو مرے بال و پر میں ہے

کیا ہیں حوادثات کسی کو خبر نہیں
اک آرزوئے زیست دلِ ہر بشر میں ہے

ہر پیڑ کو ہے اپنے ہی سائے کی آرزو
سایہ ہے اور کوئی نہ پتا شجر میں ہے

کُچھ تم ہی معتبر تو نہیں ہو بقدرِ فن
کُچھ آبرو ضیاؔ کی بھی اہلِ ہُنر میں ہے

ڈاکٹر مظہر حامد

☆

کرب و غم میں پھر وہی زخمِ جگر تازہ کریں
پھر عذاب گردشِ شمس و قمر تازہ کریں

آسماں کی گردشِ بے نام کا کیا اعتبار
طاقتِ پرواز پھر بے بال و پر تازہ کریں

وہ دعائیں بھول کر بھی لب پہ جو آتی نہیں
اب انہی بھولی دعاؤں کا اثر تازہ کریں

بیٹھ جانا راہ میں تو ہے شکستِ زندگی
اٹھ کہ پھر اے ہمسفر عزمِ سفر تازہ کریں

آسماں کی گردشِ پیہم سے جی گھبرا گیا
اب کوئی خورشید تازہ اور قمر تازہ کریں

تم اجازت دو تو آدابِ محبت کی قسم
اب کوئی سجدہ تمہارے نام پر تازہ کریں

شام تو ڈوبی ہے مظہرؔ اس کا ہم کو غم نہیں
سوچنا یہ ہے کہ کیسے اب سحر تازہ کریں

محمد افسر ساجد

☆

خستہ پا ہم نے قدم جب ترے در پر رکھا
تو نے پھر بھی نہ خیالِ دلِ مضطر رکھا

وہ گیا وقت تھا واپس نہ کبھی لوٹ سکا
اُس کو پانے کا یقیں ہم نے خبر پر رکھا

شب کی تنہائی میں اکثر جو اُسے یاد کیا
دل کی بے تابی کا الزام سحر پر رکھا

جاں ہتھیلی پہ رہی، سر نہ جھکایا ہم نے
اپنا کاسہ نہ ابھی تک کسی در پر رکھا

تھا جو اک شخص زمانے میں تری جاں کا رقیب
ہم نے اُس شخص کو ہر حال میں برتر رکھا

بسکہ اک قطرۂ خوں بھی نہ تھا تیری تقدیر
کس نے اے دل یہ ترا نام سمندر رکھا

سیف الرحمٰن سیفی

☆

کیا حقیقت ہے کیا فسانہ ہے
راز اب تک یہ کس نے جانا ہے

دیکھنا تجھ کو، تجھ کو دیکھے بغیر
تیرا دیدار غائبانہ ہے

خوشبوؤں سے ہوا ہے لپٹی ہوئی
بس کہ تم کو یہاں پر آنا ہے

رات بھر اپنے جاگنے کا سبب
شام کو صبح سے ملانا ہے

آ کے دنیائے دوں میں مت بھولو
لوٹ کر بھی یہاں سے جانا ہے

جو بھی اخلاص سے ملا سیفی
ہم نے اپنا اسی کو جانا ہے

سید مشکور حسین یاد

کربلا، کربلا

لہو کا کرشمہ
روشنی کے قلم نے لکھا ہے
صفحۂ علم و عرفان پر
عینِ حق کی
جدو جہدِ صداقت
سلسبیلِ شجاعت
ہمتوں کے چراغاں کی تابندہ ضو
کاروانِ شہادت کی پائندہ رو
جس کی زد میں
ازل اور ابد کی ہر اک آرزو
جس سے کونین کی ہر انا سرخرو
نازجو
یعنی......ابنِ آدمؑ کی تاریخ کا
ایک مشعل بجاں لمحہء بے کراں
عینِ حق کی......جدو جہدِ صداقت
جس پہ قربان ہے
غیرتِ دو جہاں
کربلا......کربلا

اکبر حیدرآبادی (آکسفورڈ برطانیہ)

سانحۂ عظیم

عجب طرح سے یہ ہجری کا سالِ نو آیا
سیاہ چشم ہے دن تو سیہ لبادہ رات
زبانیں گنگ ہیں، تارِ نظر ہے ژولیدہ
بجائے اشک ہے آنکھوں سے خون کی برسات

وہ تاجدار تھا کیسا خلیفۂ ملت
جو زاہدوں کی عبادت سے خوف کھاتا تھا
وہ ''دین دار'' تھا کیسا محافظِ ایماں؟
جو حرفِ حق کی اشاعت سے خوف کھاتا تھا

کسے خبر تھی پسِ رحلتِ رسولؐ کریم
اک ایسا وقت کڑا مومنوں پہ آئے گا
وہ زور پکڑے گا سیلاب فتنہ و شر کا
کہ عافیت کا ہر اک بند ٹوٹ جائے گا

ہے کُل جہاں کے لیے غور و فکر کا لمحہ
کہ چہرہ وقت کا کس کے لہو سے رنگیں ہے؟
یہی تو سب سے بڑا سانحہ ہے ملت کا
کہ خود خلیفۂ اسلام دشمنِ دیں ہے!!

سپاہِ شام کا اقدام روک سکتا کون
حسینؑ ابنِ علی گر کھڑے نہیں ہوتے
نشاں بھی ہوتا کہاں دین کا، حسینؑ اگر
بقائے دین کی خاطر لڑے نہیں ہوتے

امین راحت چغتائی

دخمہ

وہ جو مل جائے مسافت میں بھی منزل کے مزے
کتنی دشواریاں لمحات کی آساں ہو جائیں
اور اُٹھ جائیں سبھی شام و سحر کے پردے
چھاؤں اشجار کی تا حدِ نظر پھیلی ہو
اور اٹھکیلیاں کرتے ہوں صبا سے پتے
تالیاں جیسے بجاتے ہوں خوشی سے بچے
چلتے چلتے کہیں ستانے کو جب جی چاہے
اپنے قدموں میں لبِ جوئے تمنا آ جائے
بیٹھ کر سنتے رہیں آبِ رواں کے نغمے
روح سرشار ہو اور ذوقِ سماعت نکھرے
پھول لہرا کے جھکیں، کلیاں سمٹتی جائیں
موجیں اُچھلیں تو کناروں سے لپٹتی جائیں
پھر اُٹھیں، پھر سے چلیں، راہگزر کوئی ہو
ساتھ اُس کا ہو تو پھر خواہشِ منزل کیسی
شوق راہی کو سدا رکھتا ہے سرگرمِ سفر
سیرِ افلاک بھی آسان اِسی کے دم سے
دل بھی آماجگہِ حرکتِ پیہم اِس سے
ورنہ دل، دخمۂ افکار و حوادث کہہ لیں

☆ گورخانہ، گبران

سلمان رضوی

سردیوں کی دُھوپ

یہ سردیوں کی دھوپ کی کیسی بہار ہے
اک عافیت کا سانس ہے دل کا قرار ہے
چلنا بھی خوشگوار ٹھہرنا بھی خوشگوار
اور بیٹھنا تو سب سے سوا خوشگوار ہے
چلتی ہوا کی لہر میں برفیلی چٹکیاں
ٹھہری ہوئی ہوا میں لپکتا شرار ہے
بچے نہا کے دھوپ میں نکلے تو یوں لگا
دنیا نگار خانۂ شمس النہار ہے
سارے بدن سے چوس رہی ہے فضائے گرم
بلّی کی بند آنکھ فسانہ نگار ہے
ننگے بدن پہ تیل کی مالش کی لذتیں
جیسے ہوا میں رقص کُناں سبزہ زار ہے
جھڑیوں کے بعد دھوپ میں مٹی کی پرورش
چمکیلی زندگی میں مگن کاشتکار ہے
سلمان کو بہار کیوں انتظار ہو
دل میں بہار ہے تو جہاں میں بہار ہے

اویس جعفری

میں آرہا ہوں

فضا کی پہنائیوں سے آکر
زمیں کے چرنوں کو چھونے والے
فلک کے افتادہ پا مسافر
تمازتوں کے سفیر سورج
حرارتوں کے خبیر سورج
ذرا ٹھہرنا
میں آرہا ہوں

لپٹ کے خاشاک وخار وخس سے
شکستہ ایواں کے سنگِ در سے
اُداس ودلگیر جانے والی
نحیف وآزردہ حال کرنو
ذرا ٹھہرنا
میں آرہا ہوں

سلگتی یادوں کو ساتھ لے لوں
اور اُن گھروندوں کو توڑ ڈالوں
جہاں مری آرزو کی پریاں
نہ لے سکیں سانس زندگی کا
حیات کے تسمہ پا جالوں کو ڈسنے والو
مہیب اندھیرو، گھنیرے سایو
ذرا ٹھہرنا
میں آرہا ہوں

—

گزرتے لمحو
خزاں رسیدہ جوان پیڑوں کے زرد پتو
رُکو! پئے التفات ٹھہرو
سنو! ذرا میری بات ٹھہرو
ستم کشانِ حیات ٹھہرو
الم نصیبانِ ذات ٹھہرو
گذر نہ جائے یہ رات ٹھہرو
میں آرہا ہوں
میں آرہا ہوں

ترجمہ: آفاق صدیقی

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ

ارمغانِ لطیف

(حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے مجموعہ کلام "شاہ جو رسالو" کے چند سُروں (ابواب) سے کچھ ابیات کا منظوم ترجمہ)

صدا اور اس کا پلٹ کے آنا ذرا انہیں پہچان
ایک حقیقت ہے دونوں کی الگ الگ مت جان
(سُر کلیان)

جیسے کاتب لام الف کو ملا کے ایک بنائے
سجن کو اپنی روح میں سکھیو ایسا لیا سجائے
(سُر یمن کلیان)

بلا رہی سُولی سکھیو! کون چلے گا ساتھ
کھینچ رہا ہے مجھ کو میرے من بسیا کا ہاتھ
(سُر کلیان)

سچے موتی قدر نہ پائیں کانچ کے ٹکڑے ہوں مقبول
کروں میں کیا؟ جھولی میں میری سچائی کے پھول
(سُری راگ)

بیچ میں احمد اور احد کے آئی ہے جو میم
سوچ میں ڈوبا ہوا ہے عالم کیسے ہو تفہیم
(سُر یمن کلیان)

تو نے سر مانگا ہے چارن حاضر ہے یہ دان
میں تو سارا ملک ہی تجھ پر کرتا ہوں قربان
(سورٹھ)

حرف الف کا پڑھ لے باقی سارے ورق وسار
من اجلا گر نہیں تو سب کچھ پڑھا ہوا بیکار
(سُر یمن کلیان)

مر جاؤں تو مجھ دُکھیا پر اتنا ترس تو کھانا
جہاں ہیں پیارے مارو میری لاش وہیں پہنچانا
(عمر ماروی)

چاہے جتنی پڑھیں کتابیں حرف تو ہے بس ایک
بسم اللہ ہی بہت ہے تجھ کو نظر رہے جو نیک
(سُر یمن کلیان)

عمرؔ! میں تیرے محل کا پانی پیئوں نہ کھانا کھاؤں
بھوک پیاس کے مارے چاہے تڑپ تڑپ مر جاؤں
(عمر ماروی)

دیور، اونٹ، پہاڑ نے مجھ کو کیا کیا دُکھ پہنچائے
نھل کی آس میں سب دُکھ میں نے سمجھ کے سُکھ اپنائے

(دیسی)

جھیل کا اُجلا پانی کوے اور بگلے گھر لائیں
لاج کے مارے ہنس بچارے اودھر بھلا کیا آئیں

(کارائل)

یہاں اب ایک بھی ہنس نہیں سب مر گئے مُور بچارے
گدھ اور کوے باقی رہ گئے کینچھر جھیل کنارے

(کارائل)

پنچھی تال میں تنہا ہے اور گھات میں ہیں صیاد
آس اسے اللہ کی ہے سو دل رہتا ہے شاد

(کارائل)

کلمہ گو کہلائے مگر کب اس پر ہے ایمان
دعا ہے تیرے دل میں تو ہے مُشرک اے نادان
ظاہر میں تُو ہوا مسلماں باطن میں شیطان

(آسا)

لاکھ بھی سر ہوتے شانے پر اے چارن مہمان
کر دیتا ان سروں کو تجھ پر خوشی سے میں قربان
پھر بھی تو انمول ہی رہتی تیرے ساز کی تان

(سورٹھ)

گھاس کنارے کی تھامے تو ڈوبنے سے بچ پائے
کہے لطیف کہ یہ غیرت کا کیسا سبق سکھائے
بچا نہ پائے ڈوبتے کو تو اکھڑ کے ساتھ ہی جائے

(سوہنی)

بُھلا کے میری ہر کوتاہی ساجن لوٹ کے آ جا
اور بھی ہونگی تری چہیتی دھیان بھی ان کا ہو گا
لیکن پیارے مجھے تو ہے بس ایک سہارا تیرا

(مومل رانو)

منظوم ترجمہ: سہیل اختر

رابرٹ براؤننگ

مُحبِّ وطن

میری راہوں میں گل پاشیاں بھی ہوئیں
بام و در پر ہجوم خلائق بھی تھا
جگمگاتے تھے گرجا گھروں کے کلس
جن پہ رقصاں تھے سرمستیوں کے علَم
آج کے روز بس اک برس پیشتر

گھنٹیوں کی طرب خیز آواز سے
چار جانب ہوائیں گرانبار تھیں
نعروں کے شور سے، خلق کے بوجھ سے
ڈولتے تھے کہن سال دیوار و در

گر میں ان سے یہ کہتا مرے دوستو!
مجھ کو اس شور و غوغا کی حاجت نہیں
میری تو آرزو ہے کہ تم چرخ سے
توڑ کر رکھ دو سورج مرے ہاتھ پر
تو سبھی بول اٹھتے کہ ہاں کیوں نہیں
بلکہ کچھ اور مانگو تو حاضر کریں

آہ! وہ کون تھا، میں تھا جس نے کبھی
شمس کی عظمتوں کو مسخر کیا
کس کی خاطر؟ ان اہل وطن کے لیے
ایسے ایسے اہم کام میں نے کیے
جو کسی اور انساں کے بس میں نہ تھے
اور اب جبکہ گزرا ہے بس اک برس
میری محنت کا مجھ کو صلہ کیا ملا
میری حالت پہ عبرت کی ڈالو نظر

شہر کے بام و در آج سنسان ہیں
چند رعشہ زدہ مرد و زن کے سوا
کھڑکیوں میں نظر کوئی آتا نہیں

ہاں مگر آج دروازۂ شہر پر
خلقتِ شہر کا ایک سیلِ رواں
بڑھ رہا ہے بس اس قتل گہ کی طرف
مجھ کو مصلوب کرنے کی خاطر جہاں

کس قدر بھیڑ ہے کس قدر شور ہے
باد و باراں بھی مجھ کو ہے گھیرے ہوئے
رسیوں سے مری بانہیں زخمی بھی ہیں
خلقتِ شہر کی بارش سنگ سے
میرے ماتھے سے بھی جوئے خوں ہے رواں
یہ سزا ہے ان اعمال کی غالباً
میرے اہلِ وطن کی طبیعت پہ جو
ایک ہی سال میں بار گزرے بہت

بزمِ ہستی میں آیا تھا کس شان سے
وقتِ رخصت مگر میرا کیا حال ہے
کامرانی کے عالم میں بھی بارہا
لوگ سُوئے عدم گامزن ہو گئے
مل گیا جس کو دنیا میں اپنا صلہ
وہ خدا سے بھلا مانگ سکتا ہے کیا
گو زمانہ نہ کچھ بھی مجھے دے سکا
مجھ کو حاصل ہے لیکن یہ تسکین دل
میرا اللہ مجھے دے گا مری جزا

قلمی معاونین سے التماس

ہماری بہترین کوشش کے باوجودالاقرباء کی سطور میں حرفی ولفظی اغلاط کہیں کہیں رہ جاتی ہیں جس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں تاہم ان اغلاط کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہاتھ سے لکھے ہوئے مسودات کے پڑھنے میں اکثر دشواری پیش آتی ہے ہم از حد ممنون ہونگے اگر ہمارے فاضل قلمی معاونین اپنے مسودات ٹائپ شدہ صورت میں ارسال فرمائیں۔ (ادارہ)

عبدالعزیز خالد

رباعیات

نسخہ نہ ملا قبولیٔ خاطر کا
ابنُ الوقتی کا نہ ہمیں ڈھنگ آیا
آثار بہا فزود ہونے کے نہیں
بے سود ہے کاہشِ کساد کالا!

انسان ہے بالطبع حریصِ ممنوع
آدم سے یہ سرشت ہوتی ہے شروع
چاہے ہر مخفی کو ہویدا کرنا
ہر عقدۂ لانحل اس کا موضوع!

قدرت کی طرف سے ملے توفیق و سداد
اس کے لیے لازم ہے مگر استعداد
بتلائے یہ حکمِ اعملو اما شئتم!
وہ کام کرو پاؤ جسے حسب مراد!

لے دے کے بس یہ ہے بخششِ آزادی
سالوسی و زرق و ایمن و سنیادی
سب قدریں پرانی ہیں زوال آمادہ
ہے رُوبہ ترقی تو فقط آبادی

آزادہ روی ہے اب نئی پود میں عام
کرتی ہے موبائل پہ وہ دلخواہ کلام
"جو قول و قسم تجھ سے کرے کیا معلوم
اور اس کے کہاں کہاں ہیں پیغام و سلام"

کرتے ہیں سوال خستہ و درماندہ عوام
کب آئیں گے ایامِ خجستہ فرجام؟
دعووں کے سوا کچھ نہیں حکّام کے پاس
ہیں کھوکھلی باتیں ان کی بے مغز کلام!

ایسوں سے پڑے قدم قدم پر پالا
ہاتھوں میں عصا جن کے، گلے میں مالا
ٹھگتے ہیں جو پُرفریب باتیں کر کے
بُنتے ہیں جو جال اور پُورتے ہیں جالا!

گو حلقۂ احباب میں مے کش بھی تھے
جو لازمۂ شعر سمجھتے تھے اسے
افتادِ مزاج کے طفیل ہم لیکن
رسم و رہِ خُم کشی سے بیگانہ رہے!

صابر عظیم آبادی

رباعیات

پردہ رخ روشن سے اٹھاؤ جاناں
مدہوش زمانے کو بناؤ جاناں
بینائی کو ہے دید کی خواہش کب سے
اک بار تجلّی تو دکھاؤ جاناں

لمحاتِ مسرّت کو مسرّت نہ سمجھ
تُو مال و زر و سیم کو عشرت نہ سمجھ
ہر پھول ہے کانٹوں کا لبادہ اوڑھے
دھرتی کے حسیں باغ کو جنت نہ سمجھ

مانا کہ ہر اک در سے گزر جاؤ گے
ہے خوف کا آسیب جدھر جاؤ گے
یہ رات مرے ساتھ گزارو جاناں
برسات کا موسم ہے کدھر جاؤ گے

یہ کس نے کہا منظرِ گل ریز نہیں
موسم کا کوئی رنگ دل آویز نہیں
آجاؤ ملاقات کو کیوں ڈرتے ہو
حالات موافق ہیں ہوا تیز نہیں

بیتے ہوئے لمحوں کی کہانی ہے کہاں
تحویل میں رکھی وہ نشانی ہے کہاں
ستر کی بہاریں ہیں گزرنے والی
وہ زور وہ طاقت وہ جوانی ہے کہاں

وہ بات کرو راہ دکھانے والی
انسان کو انسان بنانے والی
جب کام زمانے میں کرو گے اچھا
گُن گائے گی جو نسل ہے آنے والی

بلبل کی صدا سن کے چمن جاگ اٹھا
کجلائی ہوئی رات کا من جاگ اٹھا
اس شان سے لہرائی صبا وقت سحر
خوابیدہ گلابوں کا بدن جاگ اٹھا

مت دیکھو تمہیں بدلے میں کیا ملتا ہے
دنیا ہے یہاں اچھا برا ملتا ہے
منزل کے تجسس میں رہو سرگرداں
جو ڈھونڈتا ہے اس کو خدا ملتا ہے

عقیل دانش (لندن)

قطعات

سفر حیات کا تاریکیوں میں گزرا ہے
نئے چراغِ تمنا جلائیں گے ہم لوگ
جو سال گزرا مداوانہ تھا کسی غم کا
یہ سالِ نو ہے اسے آزمائیں گے ہم لوگ

وقت کا ہر گریز پا لمحہ
سالِ نو کی نوید لاتا ہے
دیکھیں دانش دکھوں کی دنیا میں
یہ نیا سال کیا دکھاتا ہے

بے یقینی کے دور میں دانش
پھر نگارِ امید آئی ہے
گل بداماں ہو کاش مستقبل
سالِ نو کی نوید آئی ہے

اس صدی میں یہ بھلا ممکن ہے
صاحب عقل ہو کیا چاہتے ہو
سر پہ بندوق کی نالی رکھ کر
ہم سے پیمانِ وفا چاہتے ہو

حسیر نوری

قطعات

بندے جو ہیں وہ ہو گئے پروردگار سب
حیرت زدہ ہیں چہرے کے نقش و نگار سب
یہ فتنہ یہ فساد یہ غارت گری و قتل
شاید بنا رہے ہیں فضا سازگار سب

خشک پتوں کی صدا اور ہُو کا عالم بھی نہیں
میرے آنگن میں ابھی تو دکھ کا موسم بھی نہیں
سو رہا ہوں اوڑھ کر میں اپنی تنہائی کی رات
شہر میں میرے اگرچہ روشنی کم بھی نہیں

چند سکّوں کے عوض قدر کو کھونے والے
نیند گہری ہے نہ جاگیں گے یہ سونے والے
کتنے نادان ہیں یہ اہلِ تمنا بھی حسیرؔ
گل طلب کرتے ہیں یہ خار کے بونے والے

کچھ نہ ہونے کا یہ احساس کہاں تھا پہلے
لب پہ آہیں تھیں نہ یہ اشک رواں تھا پہلے
اب تو آئینہ احساس بھی ویراں ہے حسیرؔ
مجھ سے چھپ کر بھی کوئی مجھ میں عیاں تھا پہلے

تبصرہ کتب

نقد و نظر

کتاب : جہانِ تخلیق کا شہاب

مصنف : ڈاکٹر طاہر تونسوی

مبصر : سید منصور عاقل

ناشر : شہاب دہلوی اکیڈمی، بہاولپور

قیمت : دوسو روپے

ڈاکٹر طاہر تونسوی نے جو خود بھی ایک معروف اہلِ قلم ہیں ایک ایسی ہستی پر قلم اٹھایا ہے جس کی فکری وفنی جہتوں کا احاطہ کرنا، تجربہ ومشاہدہ کی وسعتوں اور تنوعات پر کمند افگنی کرنا نیز ایک مخصوص تمدن و معاشرت اور تہذیب وثقافت کی نمائندہ و نامور شخصیت کے خدوخال کو اجاگر کرنا ایک تحقیقی عمل ہی نہیں بلکہ ایک تخلیقی چیلنج بھی ہے۔ سید مسعود حسن شہاب دہلوی اپنی ذات میں ایک انجمن بھی تھے اور دبستانِ عصر بھی۔ ان کا عہدِ نگارش نصف صدی سے بھی متجاوز مدت پر محیط ہے جس میں ادبی صحافت، نظریاتی سیاست اور شعری فصاحت نمایاں سنگ ہائے میل کی حیثیت رکھتے ہیں، ادب وسیاست کا سنگم ان کا محبوب جریدہ 'الہام' تھا جس کا آغاز عروس البلاد دہلی میں ۱۹۴۰ء میں ہوا اور ۱۹۹۰ء تک موسس و مدبر اور 'الہام' کے ''دیدۂ معنی نگراں'' کی حیثیت سے جناب شہاب حرف حرف اور سطر سطر کے خالق وامین بنے رہے ہایں ہمہ:

'پیغامبری کردو پیمبر نتواں گفت'

قیامِ پاکستان کے بعد دہلی سے بہاولپور ہجرت کے دوران 'الہام' بھی رفیق سفر رہا اور اپنے نئے جغرافیائی سیاق وسباق میں بہاولپور کے ادب وصحافت کو نئی اقدار اور رجحان ساز نئے زاویہ ہائے فکر ونظر سے ہمکنار کر گیا۔ یہی نہیں شہاب دہلوی نے اپنے وطن ثانی کی خدمت کا حق جس طرح ادا کیا اس کا نقشِ دوام

شعر وادب، تاریخ وثقافت اور بہاولپور کی تہذیب ومعاشرت پر ثبت ہو چکا ہے جس کا بین ثبوت ان کی تخلیقی وتحقیقی نگارشات ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب کے پیش لفظ میں مولف نے اس آرزو کا اظہار کیا ہے کہ شہاب مرحوم کو سرکاری اعزاز سے نوازا جانا چاہئے تھا لیکن ہماری دانست میں ان کی شخصیت اور فکر وفن ایسے تمام مقتضیات سے بے نیاز وماوراتھے ہر چند کہ اس ضمن میں سرکار کی جانب سے انہیں 'تمغۂ خدمت' کے اعزاز سے نوازنے کا تکلف بھی کیا گیا تھا تاہم جامعہ اسلامیہ بہاولپور میں ان کے حوالے سے جو تحقیقی کام ہوا ہے وہ نسل نو کو ان کے تفویض کردہ ورثے کی تفہیم وتعیم میں مددگار ثابت ہونا چاہیے ہماری خواہش تھی کہ ڈاکٹر مزمل بھٹی کا پی ایچ ڈی مقالہ بعنوان ''شہاب دہلوی...... فن اور شخصیت'' ہمیں مطالعے کے لیے دستیاب ہوتا۔ بہر حال ڈاکٹر تونسوی کی زیر نظر تالیف کا خیر مقدم کیا جانا چاہیے کہ یہ قدر شناسی کی مظہر ہے۔ مولف نے اپنے نصف درجن ایسے مضامین کو شریک اشاعت کیا ہے جو مقامی طور پر بعض اخبارات ورسائل میں شہاب دہلوی کی مختلف تخلیقات پر بطور تبصرہ شائع ہو چکے ہیں انہوں نے اپنے ممدوح کی نظم ونثر کی تخلیقات سے بھی انتخاب پیش کیا ہے اور مشاہیر ادب کی آراء کے بھی حوالے دیئے ہیں جو نہایت اہم ہیں خصوصاً نظم و نثر کے بارے میں ڈاکٹر وفا راشدی اور شان الحق حقی (یہ حضرات بھی مرحومین ہو چکے ہیں) کے نقطہ ہائے نظر نہایت جامع اور برمحل ہیں ملاحظہ ہوں:

> ''شہاب صاحب کی شاعری ان کی زندگی سے پوری طرح ہم آہنگ ہے وہ میر کی طرح زندگی کو کرنے اور غالب کی مانند زندگی کو برتنے کا سلیقہ رکھتے تھے'' (ڈاکٹر وفا راشدی)

....

> ''نمائندہ نثر نگاری عبارت تھی میر امّن، غالب، سر سیّد، خواجہ حسن نظامی، مرزا فرحت اللہ بیگ اور شاہد احمد دہلوی کی تحریروں سے۔ میں شہاب صاحب کو اسی زمرے میں خیال کرتا ہوں''۔ (شان الحق حقی)

اس میں شک نہیں کہ شہاب دہلوی کی نظم ہو یا نثر اس میں دلّی کی زبان کی رعنائی اور 'اُردوئے معلیٰ' کی سطوت وعظمت نمایاں تھی غزل میں وہ کلاسیکی روایت کے امین بھی تھے اور اقدار نو کے نقیب بھی،

حضرت حیدر دہلوی سے شرف تلمذ حاصل تھا جنہیں 'دلی کی آبرو' سمجھا جاتا تھا اور 'خیام الہند' کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ ملاحظہ ہوں مولف کے انتخاب سے درج ذیل اشعار:

کتاب دل میں جہاں درد کا حوالہ ہے وہیں سے ملتی ہے کچھ روشنی محبت کی

آتشِ غم کا فضاؤں میں دھواں ہے ابتک سائے آلام کے تا حدِ نظر پھیلے ہیں

اپنے ایک مضمون میں مؤلف نے شہاب دہلوی کے مذہبی جذبات بالخصوص حُبِ رسولؐ پر ارتکازِ فکر کیا ہے اس ضمن میں درج ذیل نعتیہ اشعار شاعر کی ادب طراز عقیدتوں کے مظہر نظر آتے ہے۔

وفا کے دشت میں ہے میرِ کارواں کی طرح مسافرانِ رہ عشق کے لئے وہ ذات

ہمارے دل کی بھی ہیں دھڑکنیں اذان کی طرح غلام ہم بھی ہیں ان کے بلالؓ کی صورت

نعت گوئی نے مری بخشش کا ساماں کر دیا حق تو کیا ہوتا ادا مدحِ رسالت کا شہاب

زیر تبصرہ کتاب میں جناب شہاب سے متعلق کوائف نامے میں ان کی ایک درجن سے زیادہ تالیفات و تصانیف مندرج ہیں جو ادب و شعر تاریخ و ثقافت، سیاحت و سوانح اور تنقید و تحقیق کے موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں، ان کے علاوہ دو تراجم "لطائف سیریہ" اور "تکملہ، سیر لاولیاء" بھی شامل ہیں جو صرف موضوعی مواد ہی نہیں بلکہ اپنے قارئین کو ایک وسیع فکری پس منظر مہیا کرنے پر بھی قادر ہیں۔ خطہء بہاولپور کے لیے مرحوم کی خدمات کے پیشِ نظر اور خود سرزمین بہاولپور کی تاریخ و ثقافت اور معارف و دانش کو مستقبل کی نسلوں سے متعارف کرانے کے لیے ضروری ہے کہ جامعہ اسلامیہ بہاولپور "شہاب چیئر" کا اہتمام کرے تا کہ ماضی کے چراغوں کی روشنی مستقبل کو منور کرتی رہے۔

کتاب ہذا کی اشاعت کا اہتمام چونکہ شہاب دہلوی اکیڈمی کی جانب سے کیا گیا ہے لہٰذا ہمیں توقع ہے کہ علمی کتب کی تدوین و اشاعت علمی تسامحات سے قطعاً مبرا ہوگی۔ یہ احتیاط زیر نظر کتاب میں کما حقہٗ نہیں برتی گئی اور سالہا سال کی جگہ صرفی و نحوی اعتبار سے "برس ہا برس" جیسی غریب المعانی تراکیب متونِ کتاب میں در آئی ہیں جن سے اجتناب لازم تھا۔

کتاب : ہنر نازک ہے (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)

مصنف : عزیز احسن

مبصر : سید منصور عاقل

ناشر : نعت ریسرچ سنٹر، کراچی

قیمت : ۱۵۰ روپے

عزیز احسن ایک صاحبِ بصیرت اہل قلم، وسیع المطالعہ نقاد اور محتاط و مؤدب نعت گو شاعر ہیں۔ زیر نظر تصنیف ان کے تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے جو نعتیہ شاعری کی مختلف الجہت نزاکتوں، لطافتوں اور باریکیوں کا احاطہ کرتی ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مصنف نعتیہ شاعری میں نہ صرف حزم و احتیاط بلکہ صنفِ نعت کی تقدیس و تحریم کے پیش نظر ایمان و ایقان، ارادت و عقیدت اور اعلیٰ شعور و ادراک کے ساتھ شاعر کے لئے وزبان و کلام کی لفظی و معنوی نزاکتوں پر مرتکز فکر و احساس کو لازمی قرار دیتے ہیں کہ

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر   نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

غالب کے شعر سے ماخوذ "عرض کیجئے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں" کے زیر عنوان اپنے تحریر کردہ دیباچے میں ایک جگہ رقمطراز ہیں:

"نعت گو شعراء جو روح عصر سے اپنا رشتہ جوڑنے کے لیے حضورؐ کی ثنا میں مصروف ہیں ان کی ذمہ داریاں گوناں گوں بڑھ گئی ہیں وہ نعت کہہ کر نہ صرف الحادی قوتوں کو للکار رہے ہیں بلکہ وہ نعت کے نام پر ہونے والی بے راہ روی کے سیلاب کے آگے بند باندھنے کے لیے بھی کوشاں ہیں۔"

عزیز احسن جہاں نعت گوئی کو فکر و نظر کی بعض جامع و مربوط شرائط سے مشروط ٹھہراتے ہیں وہیں وہ نعتیہ تنقید کیلئے بھی جو ایک واضح رجحان کے طور پر ماضی قریب میں منصۂ شہود پر آیا ہے صنفِ نعت کی تفضیلِ نفسی کیلئے معیارات کا تعین بھی کرتے ہیں جن کا اظہار انہوں نے زیر تبصرہ کتاب میں ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے۔

"تنقید نعت کا عمل عقیدے کی پختگی، رائے کی اصابت، عقیدے کے اعتدال،

زبان کی فصاحت کے شعور، بیاد کی لطافت کے ادراک اور سخن فہمی کا متقاضی ہے"۔

چنانچہ اپنی تازہ ترین تصنیف میں جو ان کے آٹھ عدد تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے اور جو مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں عزیز احسن خود اپنے اشعار کو اپنے ہی معیارِ تنقید پر پرکھتے ہوئے اصلاح و ترمیم کی ضرورتوں کو احترامِ نبوتؐ کے تقاضوں کے پیش نظر واضح کرتے ہیں۔ ان کی نعت کا ایک مصرعہ کچھ یوں تھا کہ:

نعت کہنا ہی مرا مشغلہ بن جائے عزیز

اس میں لفظ "مشغلہ" کی طرف جب ان کی توجہ دلائی گئی تو انہوں نے محسوس کیا کہ یہ لفظ تو تفریحی مقاصد کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو نعت کی تحریم و تقدیس کے منافی ہے چنانچہ انہوں نے ایک موزوں متبادل لفظ تلاش کیا اور ان کی نعت کا مقطع جس کے مصرعہ اول میں لفظ مشغلہ استعمال ہوا تھا ترمیم کے بعد علاوہ معنویت سے ہمکنار ہو گیا:

نعت کہنا ہی وظیفہ مرا بن جائے عزیز جب لکھوں لذت دیدار چشیدہ لکھوں

عزیز احسن کی اپنی نعت گوئی کا معیار اس لیے بھی ان کے تنقیدی معیار سے ہم آہنگ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حُبِّ نبیؐ کی دولتِ لازوال سے سرفراز فرمایا ہے اور فکر و فن کے اوصاف بھی عطا فرمائے ہیں۔ زیرِ نظر تصنیف کے پہلے ہی مضمون میں انہوں نے ایک حمدیہ نظم کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے اور قمر جمیل کی اس نظم کو نہایت متوازن و مدلل تنقید کا سزاوار ٹھہرایا ہے فرماتے ہیں:

"قمر جمیل کی یہ نظم مذہبی روایت کی بازگشت، متصوفانہ شعری رویے کی گونج اور محکم نظام فکر سے انسلاک کے باوجود دینی شعریت کی باز آفرینی کی ایک اچھی مثال اور تجدید متن کا بہتر نمونہ ہے"۔

مصنف کی دیگر تصانیف بھی جن میں "اردو نعت اور جدید اسالیب (۱۹۹۸ء) تیرے ہی خواب میں رہنا (شعری مجموعہ ۲۰۰۰ء) "نعت کی تخلیقی سچائیاں" (۲۰۰۳ء) اور "کرم و نجات کا سلسلہ" (مجموعۂ نعت ۲۰۰۵ء) کے علاوہ نصف درجن تالیفات بھی شامل ہیں۔ مصنف کی بحیثیت شاعر اور بحیثیت نقاد ژرف نگاہی کی مظہر ہیں اور شعر و ادب میں ان کے نظریاتی استحکام کی عکاس، عزیز احسن نے زیر تبصرہ

تصنیف میں معروضی تنقید کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے انہوں نے نعت گو شعراء کی ایک بہت بڑی تعداد کو جو بزمرۂ متقدمین و متوسطین اور متاخرین ہی نہیں بلکہ جن میں معروف و غیر معروف معاصرین بھی شریک ہیں ان کی نعت گوئی کے سیاق وسباق میں پرکھا ہے۔ مصنف کے ان ہی اوصاف کی نشاں وہی معاصر اہل علم نے بھی کی ہے جن میں دیگر کے علاوہ پروفیسر ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، پروفیسر ڈاکٹر سید وحید اشرف اور پروفیسر ڈاکٹر اسلم فرخی شامل ہیں۔ ملاحظہ ہوں چند اقتباسات۔

''عزیز احسن کا جدید اور قدیم ادب کا مطالعہ بہت وسیع ہے وہ مشرقی اصولِ تنقید سے بھی باخبر ہیں اور مغربی تنقید کے بھی رمز شناس ہیں''۔ (پروفیسر ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی)

''عزیز احسن کا اردو نعتیہ شاعری کا مطالعہ وسیع بھی ہے گہرا بھی، وہ نعتیہ شاعری کے لئے زبان و بیان کے آداب سے بھی واقف ہیں اور شعری محاسن پر بھی نظر رکھتے ہیں اردو کی نعتیہ شاعری پر ان کا تحقیقی مطالعہ بھی ہے اس موضوع پر نقد و نظر کے اصولوں سے بھی وہ بڑی حد تک واقف ہیں اور خود ایک خوش گو شاعر بھی ہیں''۔ (پروفیسر ڈاکٹر سید وحید اشرف)

''عزیز احسن ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جس نے متانت سنجیدگی، دیدہ وری اور فکری و فنی آگہی کی روشنی میں نعت رسولؐ کے ذخیرے، تاریخ اور جدید امکانات کا جائزہ لیا اور فکر و فن کے نئے تقاضوں کے تناظر میں نعت گوئی کا بحیثیت صنف محاکمہ کیا ہے''۔ (پروفیسر ڈاکٹر اسلم فرخی)

کثیر الاطراف فکری، نظری اور علمی صلاحیتوں نے عزیز احسن کو ذکی الحس ہونے کا وصف بھی عطا کیا ہے چنانچہ وہ اپنے گرد و پیش سے بھرپور اثرات بھی قبول کرتے ہیں اور پورے انتقادی اخلاص و صداقت کے ساتھ دوٹوک اور برملا اظہار بھی کرتے ہیں چنانچہ ایسے ہی کردار جو ان کی صداقتِ احساس سے متصادم ہوئے ان کا ہدفِ تنقید بنے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ وہ اپنے رقم کردہ دیباچے کے آغاز ہی میں کہتے ہیں۔

''ہر بار یش گویا اپنے آپ کو نعت خواں کی بجائے نعت گو شاعر بھی منوانے پر مصر ہے اور بعض ٹی وی چینلز ایسے نعت خوانوں کو مسلسل متعارف کروا کے شہرت دے رہے ہیں میں ایسے نعت خوانوں کو تنقید کے قابل بھی نہیں سمجھتا''۔

نام کتاب	اسلام دینِ امن وسلامتی
مصنف	سید محمد سلیمان
تبصرہ	شہلا احمد
ناشر	دی ٹائمز پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ کراچی
قیمت	۔/۳۰۰ روپے

ہر دور کے اپنے معاشرتی، معاشی، سماجی اور تاریخی تقاضے اور چیلنج ہوتے ہیں۔ زیرِ نظر تصنیف ''اسلام دینِ امن وسلامتی'' اُمتِ مسلمہ کے خلاف دشمنانِ اسلام کے متعصبانہ پروپیگنڈے کا توڑ کرنے کیلئے تحریر کی گئی ہے، جس میں دینِ اسلام کو بدنام کرنے اور مسلمانوں کو دہشت گرد کے روپ میں پیش کرنے کی مذموم مہم سرفہرست ہے۔ مصنف سید محمد سلیمان، عظیم عالمِ دین، محدث اور صاحبِ تصانیف بزرگ، جناب سید مسعود احمد رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ حدیث، تفسیر، سیرت، فقہ، تاریخ اور دیگر علوم پر ان کا مطالعہ وسیع اور معلومات وسیع ہیں۔ جس کا عکس ہمیں ''اسلام دینِ امن وسلامتی'' میں نمایاں نظر آتا ہے جہاں مصنف نے قرآنِ حکیم میں ارشاداتِ ربانی اور احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ دینِ اسلام ایک سچا مذہب ہے۔ جو پیار محبت، ہمدردی، امن وسلامتی، رواداری اور انسانیت کا احترام سکھاتا ہے۔ خالق کائنات جو قادرِ مطلق ہے لیکن رحمٰن اور رحیم ہے اس نے پیغمبر اسلام رسولِ مقبول ﷺ کو نہ صرف مسلمانوں بلکہ کل جہانوں کیلئے رحمت بنا کر بھیجا۔ چنانچہ آپؐ خود فرماتے ہیں:

''اے لوگو! میں تو (اللہ کی طرف سے) تحفے میں دی گئی رحمت ہوں''۔

آپؐ کی رحمت وشفقت کی عظمت کے بارے میں سید محمد سلیمان، شیخ الاسلام سید مسعود احمدؒ کے حوالوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رسول ﷺ کی صفتِ رحمت کی تو غیر مسلم اُدباء اور فضلاء بھی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ بی اسمتھ نے اپنی کتاب محمدؐ اینڈ محمڈن ازم'' میں اعتراف کیا ہے۔ ''جب مسلمین نے یروشلم فتح کیا تو وہ یہ ثابت کر رہے تھے کہ محمد ﷺ دنیا کے لئے فضل ورحمت بن کر آئے ہیں اس کی صرف

ایک وجہ ہے کہ تعلیماتِ محمدی کی روح جاری وساری ہے۔ موثر اور ابدی ہے"۔ ڈی۔ ایس مارگولیوتھ اور لین پول نے بھی اپنی تصانیف میں بڑے عمدہ الفاظ میں آپ ؐ کی بے مثال شخصیت کو جو سراپا رحمت تھی خراجِ تحسین پیش کیا ہے...... غیر مسلم ادباء کے یہ اعترافات ثابت کرتے ہیں کہ وہ پیغام جو رحمت اللعالمین نوعِ انسانی کیلئے لے کر آئے وہ "پوری انسانیت کیلئے رحمت ہے۔ اسی میں دنیا کے تمام مسائل کا حل ہے۔ یہ عدل وانصاف اور مساوات کا پیغام ہے اور اسی پر عمل کرنے میں دنیا کی نجات ہے۔ یہی پیغام دنیا کے لئے امن کی ضمانت ہے"۔

لیکن مصنف اس بات پر اظہار افسوس کرتے ہیں کہ دشمنانِ اسلام نے اس پیغام کی اصل روح کو بالکل مسخ کر دیا اور آپ کی تعلیمات وخلق عظیم کے خلاف منفی پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں مصنف پروفیسر خورشید احمد کے مضمون "موڈریٹ اسلام کی تلاش" (روزنامہ جنگ راولپنڈی مورخہ ۴، جنوری ۲۰۰۳ء) اور "رسالہ اسباب منافرت از جناب جیون خان (روزنامہ جنگ راولپنڈی مورخہ ۱۶، جون ۲۰۰۳ء) کا حوالہ دیتے ہیں جو اسی تناظر میں تحریر کیے گئے۔ ان تحاریر میں جناب پروفیسر خورشید احمد اور جناب جیون خان نے امریکی صدر بش کے پالیسی ایڈوائزرز اور دفاعی پالیسی بورڈ کے رکن کینتھ ایڈلین، جیری فال ویل، فرینکلن گراہم اور پروٹیسٹنٹ چرچ کی شاخ "Evangelical" کے پادری اور نائب صدر رچرڈ کی ناپاک زبان کو بے نقاب کیا ہے جو وہ رسولِ مقبول ﷺ اور دینِ اسلام کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ گیارہ ستمبر کے بعد سے تو ان کی نظر میں "گویا ہر مومنِ باعمل ممکنہ دہشت گرد" ہو گیا ہے۔

سید محمد سلیمان نے اس تصنیف میں ہر بات اور ہر واقعہ تفصیلاً لیکن نہایت احتیاط اور حوالوں کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ زیادہ تر حوالے صحیح مسلم اور صحیح بخاری سے نقل کیے ہیں کہ جن کی صحت مستند ہے۔ اس کے علاوہ دوسری کتابوں سے بھی کچھ احادیث نقل کی ہیں۔ لیکن ان کو مستند ثابت کرنے کیلئے دوسری بہت سی کتابوں کے حوالے دیئے گئے ہیں تاکہ نفسِ مضمون کی صحت برقرار رہے۔ ہمیں اس تصنیف میں اسلام کے مخالفین کی ان سازشوں کا ذکر بھی ملتا ہے جو وہ شروع ہی سے اسلام اور نبی کریم ﷺ کو نقصان پہنچانے کیلئے کرتے رہے۔ لیکن دین اسلام کی صداقت اور سچائی نے انہیں کامیاب نہ ہونے دیا۔ اس کی

تائید میں مصنف نے صحیح بخاری کے حوالے سے روم کے بادشاہ ہرقل کا قصہ بیان کیا ہے، کہ جس کو آپ ﷺ نے ''تبلیغی نامۂ مبارک'' بھیجا تھا اور تجارتی قافلہ کے قائد ابوسفیانؓ جو اس وقت مسلمان نہ ہوئے تھے۔ جن کے اسلام کے حوالے سے آپس میں سوال و جواب ثابت کرتے ہیں کہ اس دین کی صداقت و حقانیت کے وہ معترف تھے۔ اس کے علاوہ مصنف نے ان تدابیر کا ذکر بھی اس کتاب میں کیا ہے جو کفار اور اہلِ کتاب نے کبھی منافقوں کے روپ میں تو کبھی پیغمبر اسلام سے غلط قسم کی باتیں منسوب کر کے دینِ اسلام کو نقصان پہنچانے کیلئے کیں جس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہو گئے۔ یہاں تک کہ آپ کو بت پرست مشہور کر دیا گیا۔ اس سلسلے میں وہ این میری شمل Anne Marie Schimmel کی کتاب، "And Muhammad is His Messanger" سے حوالے دیتے ہوئے اہل مغرب کی متعصبانہ ذہنیت کی نشان دہی کرتے ہیں: ''مشکل سے کوئی برائی ایسی ہوگی جو مغربی دنیا نے محمد ﷺ کی طرف منسوب نہ کی ہو، جنہوں نے اس زمین پر کامیاب ترین مذہبی تحریکوں میں سے ایک تحریک کا آغاز کیا''۔

وہ اسی کتاب کے صفحہ ۵ پر لکھتی ہیں: ''یورپ میں اسا اوقات محمد ﷺ کو ایک بت پرست سمجھا جاتا ہے یا ان کو مہاوند یعنی تاریکیوں کی روح سمجھا جاتا ہے''۔ نعوذ باللہ

اس سلسلے میں مصنف علامہ شبلی نعمانی کی تحریر کا حوالہ دیتے ہیں۔ جس میں علامہ فرانسیسی مصنف کانت ہنری دی کاستری کی کتاب 'الاسلام' کا ذکر کرتے ہوئے ان مسائل کی نشان دہی کرتے ہیں جن پر یورپی مصنفین ہمشیہ نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں۔ سید محمد سلیمان نے قارئین کی معلومات کیلئے مقالات شبلی کے خاص خاص اقتباسات رقم کئے ہیں جن میں کاستری کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں مسلمانوں کے خلاف کس طرح کی افترا پردازیاں کی گئیں۔ عیسائیوں کے مذہبی پیشواؤں نے قومی گیتوں کے ذریعے مسلمانوں کے خلاف منافرت پھیلائی اور یوں کروسیڈ کی لڑائیوں نے جنم لیا۔ اور مسلمانوں کے خلاف ہرزہ سرائیاں کچھ اور بڑھ گئیں......

تصنیف ''اسلام دینِ امن وسلامتی'' اس لحاظ سے ایک بہترین کتاب ہے کہ اس میں ہمیں جہاں ان غلط کار اور متعصب عیسائی راہبوں اور مصنفین کا ذکر ملتا ہے جنہوں نے اسلام اور پیغمبرؐ اسلام کے

خلاف بے ہودہ روایات وخیالات کو اس وقت کی جاہل اقوام کے دلوں میں جاگزیں کیا وہیں گوئٹے، تھامس کارلائل، اینی بیسنت، جارج برنارڈ شا اور مائیکل ہارٹ جیسے دانشوروں کا ذکر بھی ملتا ہے جنہوں نے اسلام کی حقانیت، برتری اور صداقت کی برملا تائید کی۔ چنانچہ جارج برنارڈ شا قمطراز ہے:

''میں محمد ﷺ کے دین کو اس کی جامعیت کی بنا پر بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ یہ واحد دین ہے جو حالات اور زمانے کی تبدیلیوں کو اپنے اندر سمونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور ہر نسل کو اپیل کرتا ہے۔ محمد ﷺ کے دین کے متعلق میں پیشنگوئی کرسکتا ہوں کہ یہ مستقبل میں ایسا ہی مقبول ہوگا جیسا یہ آج یورپ میں مقبول ہو رہا ہے......''۔

دینِ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ ہی وہ سچا مذہب ہے جو ہمیں ایک مہذب، شریفانہ اور امن و آشتی کی عکاس زندگی گزارنے کے آداب سکھاتا ہے۔

دس ابواب پر مشتمل اس خوبصورت تصنیف میں سید محمد سلیمان نے نہایت کامیابی سے مختلف شعبہ ہائے زندگی کے ہر ہر پہلو پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ قرآن وسنت اور اسوۂ حسنہ کے حوالوں کے ذریعے انہوں نے ثابت کیا کہ دینِ اسلام تمام انسانوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تعلیم دیتا ہے۔ عفو و درگذر، رحم و نرمی، دوسروں کی تکلیف و آرام کا خیال رکھنا، رفاہِ عامہ کے کاموں کو فروغ دینا، ظلم و زیادتی سے اجتناب، یتیموں اور بیواؤں کا خیال رکھنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ حیوانوں کے ساتھ شفقت، ان کے ذبح کرنے کے آداب ہمیں دینِ اسلام سکھاتا ہے۔ قتل و غارت، فتنہ و فساد، خودکشی دین محمدؐ کی تعلیمات کے خلاف ہیں۔ جہاد کے بارے میں احکامات اور جنگی قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کے بارے میں مصنف نے نہایت تفصیل سے قرآنی احکامات کی وضاحت کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ خودکش حملے مسلمان کی شان نہیں بلکہ خودکشی حرام ہے۔ اسلام اعلیٰ اخلاقی و معاشرتی اقدار کا پابند بناتا ہے۔ تمام رشتوں کا تقدس و احترام سکھاتا ہے جس کی دلیل سورۃ النساء کی آیت نمبر ۳۶ سے ملتی ہے۔

''اور عبادت کرو اللہ کی اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور نیکی کرو والدین

کے ساتھ، رشتہ داروں کے ساتھ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اور ہم نشین کے ساتھ اور مسافروں اور غلاموں کے ساتھ بے شک اللہ اِترانے والوں، فخر کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا''۔

زیرِ تذکرہ تصنیف کے بنظرِ غائر مطالعہ کے بعد یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ مصنّف اپنی کاوش میں کامیاب رہے ہیں۔ انہوں نے احکاماتِ قرآنی، احادیث مبارکہ اور واقعات وشواہد کے ذریعے ثابت کر دیا ہے کہ اسلام کی تعلیمات اخلاقی ومعاشرتی اعتبار سے بے مثال، پاکیزہ اور ارفع واعلیٰ ہیں۔ اس پر دہشت گردی، انتہا پسندی اور بنیاد پرستی کا لیبل عالمی پریس، انتہا پسند یہودیوں اور عیسائیوں کی متعصبانہ ذہنیت کی اختراع ہے۔ اسلام تو فتنہ وفساد تشدد ودہشت گردی کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے اس دین میں فتنہ وفساد پھیلانے والوں سے لڑنے اور انہیں سخت سے سخت سزائیں دینے کا حکم ہے۔ سید محمد سلیمان اس ضمن میں اور بہت کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ ابھی ان کی تشنگی برقرار ہے۔ چنانچہ رقمطراز ہیں:

''یہ ایک ایسا موضوع ہے جس کیلئے ایک مستقل تصنیف درکار ہے۔ اوپر تو ہم نے صرف چند نمونے بیان کئے ہیں۔ جن سے ایک منصف مزاج قاری بہ آسانی اندازہ لگا سکتا ہے کہ اسلام پیار اور محبت کا دین ہے۔ امن وسلامتی کا دین ہے۔ ہمدردی وخیر خواہی کا دین ہے۔ اعتدال اور رواداری کا دین ہے''۔

آج کے دگرگوں حالات کے تناظر میں دیکھا جائے تو مصنّف قابلِ ستائش ہیں کہ انہوں نے وقت کے ایک اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ میں ان کی اس رائے سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے اپیل کرتی ہوں کہ مخیّر حضرات وملکی وغیر ملکی اشاعتی ادارے اس کارِ خیر میں اپنا حصّہ فرض سمجھتے ہوئے ڈالیں گے اور اس کتاب کا انگریزی اور دیگر بین الاقوامی زبانوں میں ترجمہ کروا کر شائع کرائیں گے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے فیض یاب ہوسکیں اور دشمنانِ اسلام کی کمر ٹوٹ جائے۔ مصنف اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ مسلم ممالک کے اپنے ٹیلیویژن چینلز ہونے چاہئیں جن کے ذریعے دنیا کو اسلام کی حقیقی تعلیمات سے آگاہ کیا جاسکے۔ ایک اہم نکتہ جس کی طرف میں جناب سید محمد سلیمان کی توجہ مبذول کرانا چاہتی

ہوں...... کتاب کے کچھ صفحات (۶۶۔۶۷۔۷۰۔۷۱۔۷۴۔۷۵۔۷۸۔۷۹) پر طباعت نہیں ہو سکی جس سے مضمون کا تسلسل کافی حد تک متاثر ہوا اور ربط قائم نہ رہ سکا۔ گو یہ غلطی مطبع کی ہے۔ لیکن مصنف کو اس غلطی کی نشان دہی ضرور کرنی چاہیے تھی تاکہ مالکان مطبع اپنی غلطی کا احساس کر کے اس کا ازالہ کرتے......!!!

کتاب : ہمہ جہت (نثری مجموعہ)

مصنف : حامد برگی

تبصرہ : نعیم فاطمہ علوی

پبلشر : برٹش پبلشر۔ اسلام آباد

قیمت : ۱۵۰ روپے

کتاب تبصرے کیلئے ملی تو میں نے اسے دو نشستوں میں پڑھا کیونکہ یہ میری مجبوری تھی...... وگرنہ ہمہ جہت ایک ایسی کتاب ہے جو کافی کے گھونٹ کی طرح...... جاڑے کے خوبصورت موسم میں لطف لیکر اور مزے لیکر پڑھنی چاہئے۔ یہ کتاب نہ صرف معلومات میں اضافہ کرتی ہے بلکہ اِن کے انشائیے قاری کیلئے سوچ کے ایسے ایسے در کھولتے ہیں۔ کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ حامد برگی صاحب نے اچھا کیا اپنا پیسہ اچھے کام پر صرف کیا اور صدقہ جاریہ میں حصہ ڈالا۔

ایک منجھے ہوئے ادیب کی کتاب پر تبصرہ کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ کیونکہ میں کئی دن سوچتی رہی اس مکمل کتاب پر کیا لکھوں۔ اس کتاب کے تین حصے ہیں۔ بیشتر کتاب ان کے خوبصورت انشائیوں پر مبنی ہے۔ تنقیدی مضامین اور ایک سفر نامہ بھی اس کتاب میں شامل ہے۔ انشائیے کے بارے میں ایک خوبصورت۔ مربوط اور معلومات سے بھرپور مضمون بھی اس کتاب کا حصہ ہے میرا خیال ہے کہ کتاب کے مطالعے سے پہلے اگر وہ مضمون پڑھ لیا جائے تو ان کے انشائیوں کو سمجھنے میں بہت مدد مل جاتی ہے۔

حامد برگی کے انشائیے سیلابی پانی کے بہاؤ کی طرح قاری کے ذہن کے ہر گوشے میں پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ اندازِ بیان سادہ۔ دلائل مضبوط اور مربوط۔ انوکھے انداز میں فرحت کا سامان پیدا کرتے

ہیں۔ نظر انداز کر دینے والے معمولی موضوعات چونکا دینے والی صلاحیت رکھتے ہیں۔

''شور وغل'' میں فرماتے ہیں: ''پانی بھی ٹھہراؤ کے سبب کائی زدہ ہو جاتا ہے اور ہزاروں حشرات کا مسکن بن جاتا ہے۔ گرد وپیش کو آلودہ کرنے لگتا ہے۔ اگر یہی پانی دریا کی موج اور سمندر کی طغیانی کی صورت شوریدہ سر ہو آلودگی اُس کے پاس نہ پھٹکے''۔

کسی بھی معمولی موضوع کو تفکر کے ذریعے ارفع و اعلیٰ مقام پر دلائل وشواہد کی روشنی میں پہنچا دینا حامد برگی صاحب کا کمال ہے۔''رٹو طوطا'': ''وہ پہاڑے جو مولا بخش کی تھاپ کے ساتھ بچپن میں ہی اپنے سُر تال سمیت ہمارے ذہنوں میں محفوظ کر دیئے گئے تھے۔ اب بغیر کاوش کے ہمارے روزمرہ زندگی کے کام آتے ہیں رٹنے کی صلاحیت انسان کو کمپیوٹر کی طرح خود کار بنا دیتی ہے''۔''ہار'': میں خیالات کی جولانیاں دیکھئے لفظ ہار کے رنگارنگ موتیوں سے مالا پرو دی۔ اسی طرح ''انسانی رشتے'' میں کچھ جملے ضرب المثل کا درجہ لئے ہوئے ہیں۔

انشائیے کا موضوع اور نفسِ مضمون قاری کو فرحت عطا کرتا ہے۔ وہ کچھ دیر کیلئے قاری کی توجہ پر قابض ہو جاتا ہے اُس کو اپنے ساتھ لیکر چلتا ہے۔ اور پھر فرحت وشادمانی کا تحفہ دیکر رخصت کر دیتا ہے۔ مسکرانا بھی تو ایک نیکی ہے۔ مسرت پہنچانا اور قاری کو نفسیاتی دباؤ سے کچھ دیر کیلئے نکال کر ہلکا پھلکا کر دینا بھی ایک نیکی ہے۔ حامد برگی صاحب نے اس نیکی کو خوب نبھایا ہے۔ ''ہنسی'' کے یہ جملے دیکھئے!!! ''مسکراہٹوں کی آمیزش اُس معصوم چہرے پر بھی دیکھی جا سکتی ہے جو بھوک اور تکلیف سے بلبلاتے ہوئے ممتا کی ذرا سی توجہ پر اپنے گوشۂ چشم میں موٹے موٹے آنسو تھامے یک لخت مسکرانے لگے''۔

الفاظ دیکھئے شبیہیں بناتے نظر آتے ہیں۔ تصویر کشی کی ایسی مثالیں خال خال ہی ملتی ہیں۔ ''ہار'' پر لکھا ہوا انشائیہ تجسس کے در کھولتا ہوا فرحت وشاداں ماحول میں آپکو ساتھ لیکر چلتے چلتے فکر کی ایسی وادی میں چھوڑ دیتا ہے جہاں پہنچ کر ذہن کے سینکڑوں در کھل جاتے ہیں۔ اسی طرح ''کھلونے'' ہمیں بچپن کی میٹھی میٹھی یادوں کے گتھیوں کو سلجھانے کے راستے پر گامزن کر کے غائب ہو جاتا ہے اور قاری اُسی میں کھو کر رہ جاتا ہے۔

''قناعت'' کے یہ جملے ملاحظہ فرمایئے: ''سوچا جائے تو جلنے کڑھنے اور بے اطمینان ہونے کی کیفیتیں بڑی مثبت کیفیت ہیں''۔ ''اپنی حالت پر صبر اور محرومیوں پر قناعت زندگی کی دوڑ میں انسان کی رفتار کو سست کر دیتا ہے بلکہ حقیقتاً روک دیتا ہے''۔ ''چھت'' کا یہ جملہ دیکھئے: ''آج کا انسان چھت سے ہی نہیں نیلی چھت والے سے بھی کٹ رہا ہے'' جھگڑے کا پہلا پیراگراف دیکھئے ''جو آپکو بے ساختہ قہقہوں کی دنیا میں لے جاتا ہے اور آپ بے اختیار دیر تک ہنستے رہتے ہیں۔ اس طرح ''جھگڑے'' انشائیہ ایک دیرپا اثر رکھتا ہے۔ کیسے کیسے خیال پھوٹتے ہیں۔ رجائی پہلو ملاحظہ فرمایئے:

''خیالات کے مدو جزر۔ دماغ کے سمندر میں تغیر برپا کرتے ہیں''۔ ''جھگڑیں'' پر لکھا ہوا انشائیہ پڑھیں تو یوں لگتا ہے جھگڑے جیسے ناپسندیدہ لفظ کو معنی اور مفہوم کی خوبصورت قبا پہنا کر اَمر کر دیا ہے اس سے پہلے قاری کے ذہن میں اس لفظ کے ایسے ایسے مفہوم کبھی پیدا نہیں ہوئے ہونگے۔ اب آخر میں ''گھنٹی'' کے یہ جملے پیش کر کے اجازت چاہوں گی۔

''اب عمر کی سترویں دہلیز پر قدم رکھتے ہوئے پرے کانوں میں ایک خاموش خطرے کی گھنٹی بجنے لگی ہے۔ پر سوچتا ہوں۔ اسے خطرے کی گھنٹی کیوں کہا جائے خوش آئند وقت کا علامیہ کیوں نہ کہا جائے؟ شامِ زندگی کو صبح دوام زندگی سے تعبیر کیوں نہ کیا جائے؟ زندگی کو اداسیوں، محرومیوں اور مایوسیوں سے نکال کر مسرت کے لمحوں میں لے جاتا ہے''۔

کتاب : مسافتوں کی تھکن (ناول)

مصنفہ : عذرا اصغر

تبصرہ : نعیم فاطمہ علوی

ناشر : عزیز پبلیشرز۔ اردو بازار۔ لاہور

قیمت : ۲۵۰ روپے

مسافتوں کی تھکن اتارنے کے لیے عذرا اصغر کے ذہن نے جس کہانی کو جنم دیا...... وہ ایک

روایتی کہانی ہے، جو روایتی انداز میں چلتی ہوئی مثبت اندازِ فکر کے ساتھ آگے بڑھتی ہے...... راشد کی بارہ سالہ جلاوطنی کو اگر ایک طرف رکھ لیا جائے تو سب اچھا ہی اچھا نظر آتا ہے...... یہ ان کی سوچ کا رجائی پہلو ہے، جو ناول میں نمایاں ہے۔

ہمارے معاشرے کے رہن سہن کی ایک اہم بات، حسد، بغض اور دوسروں کو نیچا دکھانے کی کوشش اور لالچ ہے جس کو عذرا اصغر نے اپنے ناول میں نمایاں طور پر دکھانے کی کوشش کی ہے...... کہانی پر گرفت مضبوط اور مربوط ہے، مگر چونکا دینے والی بات صرف یہ تھی کہ اس دفعہ ولن ہیروئن کا باپ نہیں بلکہ ہیرو کا باپ تھا...... ہیرو کے کردار کا اہم پہلو یہ ہے کہ وہ خاموشی سے بغیر کسی حیل وحجت یا بحث مباحثے کے اچانک بارہ سال کے لیے منظر سے غائب ہو جاتا ہے۔ اور پھر بارہ سال کے بعد اچانک وہ یوں گھر چلا آتا ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ یہ کردار کے کمزور پہلو کی نشاندہی کرتا ہے۔ ناول کے بیچ میں حالاتِ حاضرہ پر ان کے تبصرے اور مختلف موضوعات پر اظہارِ خیال لاجواب ہے۔

''یوں بھی مسلمانوں کو خلقِ خدا کے فائدے کی توفیق شاذ ہی ہوتی ہے وہ اپنے ذاتی فائدے سے آگے نہیں سوچتے۔ آخرت میں جنت کے حصول کے لیے مسجدیں تعمیر کراتے ہیں اور داڑھی رکھ کر بخشش کی سند اپنے طور پر حاصل کر لیتے ہیں۔ مغل شہنشاہوں نے باغات لگوائے یا مقبرے بنوائے اپنے جاہ وجلال اور تحفظ کے لیے قلعے تعمیر کرائے اس کے برعکس ہندو سرمایہ داروں نے ہسپتال کالونیاں بنائیں، کنویں کھدوائے''۔

''اور مسلمان تو بس ہیں ہی اس طرح کے...... اپنے اسلاف کے کارنامے کتابوں کے قبرستان میں دفن کر کے ان پر فخر کرتے ہیں۔ مسجدیں تعمیر کر کے اپنے تئیں جنت میں گھر بنا لیتے ہیں اور مسجدوں کو ویران چھوڑ دیتے ہیں یا فساد اور آپس کی تخریب کاری کیلئے استعمال میں لاتے ہیں ہماری بنیادی خصوصیات غیر قوموں نے اپنالی ہیں''۔

بہرحال مجموعی طور پر یہ ایک تفریحی ناول ہے جو اپنے قاری کو منفی دباؤ سے نکال کر کچھ دیر کے لیے فرحت وشادمانی کے ماحول میں لے جاتا ہے۔

کتاب : دردکالمس

مصنفہ : شبہ طراز

تبصرہ : نعیم فاطمہ علوی

ناشر : عزیز پبلیشرز، اردو بازار۔ لاہور

قیمت : ۱۵۰ روپے

زندگی ایک کہانی ہے، انسان ازل سے ابد تک کہانیاں بنتا، لکھتا، سوچتا اور کبھی کہانی کا جیتا جاگتا کردار بن کر ملنے والی مہلت کو پورا کر کے اپنے پیچھے ایک کہانی چھوڑ کر چلتا بنتا ہے۔ اور یوں حیاتِ انسانی کا سلسلہ کہانی کے ارتقاء میں بدلتا چلا جاتا ہے۔ تغیر پذیر زندگی کا حسن اسی ارتقاء کا ایک خوب صورت سلسلہ ہے۔ جس طرح نسل انسانی اپنی شکل وشباہت، عادات وخصائل، نشست و برخاست اور عقل وتدبر میں ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اسی طرح کہانی سوچنے، کہنے، لکھنے والے کا نقطۂ نظر ذہنی اتار چڑھاؤ، اور گرد وپیش کے حالات وواقعات کو محسوس کرنے کا بھی اپنا ہی انداز ہوتا ہے...... جو کہانی میں حسن بھرتا ہے اور ہر کہانی کار اپنے الگ اور انوکھے زاویے سے چیزوں کو دیکھ کر اس کے مختلف رنگوں سے اپنے قاری کو آشنا کرواتا ہے......

درد کو چھو کر اس کو محسوس کرنے والی شبہ طراز کی کہانیوں میں بھی ایک انوکھا زاویہ انوکھا رنگ اور انوکھا ذائقہ ہے...... ان کی کہانیاں مختصر مگر جامع اور مربوط ہیں۔ کتاب کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ان کا دائرہ فکر بتدریج آگے بڑھتا ہے ...... ان کے افسانوں کے نام بہت دلچسپ ہیں۔ جہاں تک کردار نگاری کا تعلق ہے ان کی کہانیوں میں کردار اپنے اوصاف اور حرکات وسکنات سے ایک شبیہہ بناتے چلے جاتے ہیں۔ یعنی وہ مخفی بھی ہیں اور عیاں بھی......

کتاب کی پہلی کہانی ''زندگی کے لفافے میں بند لمحے'' ایک مربوط کہانی ہے جس میں زندگی کو چند لفظوں میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے ''ادھورے خواب، غربت کے کفن میں لپٹی ہوئی لاش صادق ایسے شخص کی کہانی جو خوابوں کو حقیقتوں کا روپ دھارتے ہوئے دیکھتے ہیں مگر اپنی آنکھوں اور اپنی زندگیوں میں نہیں

دوسرے لوگوں کی زندگیوں میں اور ان کے اپنے خواب ہمیشہ ادھورے ہی رہتے ہیں......

''ایک اداس شام'' ایک خوب صورت خیال، خوبصورت کہانی...... ''شبنم اور آنسو ایک ہی چیز ہیں...... پانی کا قطرہ...... اور بس...... اور ایک اداس شام دبے پاؤں، میرے ساتھ چلنے لگی'' اسی طرح ''اندیشوں کی اڑان'' ایک علامتی کہانی ایک بے ضرر پرندے کی زبان سے اشرف المخلوقات کے متعلق یہ جملے آپ کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

''بہت نیچے گندے پانی کے نالے میں لال لکیر پھیلتی جا رہی تھی۔ انسانوں کی بستی بہت پستی میں تھی اور میں اوپر آسمانوں میں راستے تلاش کر رہا تھا''۔

انسانی نفسیات کی ترجمانی مفاہمت میں بڑی ہی کامیابی سے بیان کی گئی ہے یہ ان لوگوں کی کہانی ہے جو دوسرے لوگوں پر قابض ہو جاتے ہیں اور صرف اپنی ہی نہیں دوسروں کی زندگی بھی جیتے ہیں۔ بعض کہانیاں ایسی بھی ہیں جو دلچسپ تو ہیں مگر دیرپا اثر نہیں چھوڑتیں۔ کتاب کے آخری چند افسانوں کو تو میں شاہکار افسانے کہوں گی، جن میں خیالات کی بلندی...... بیان کی قدرت، مختصر مگر جامع خیال پر مضبوط گرفت نظر آتی ہے۔ مثلاً ''چپ کے تالے'' نمائندہ افسانہ ہے جس میں فکر کی گہرائی دل پر دستک دیتے ہوئے جملے اور ارفع خیالات کے ساتھ منجھی ہوئی ادیبہ نظر آتی ہے...... اسی طرح ''بے انت''۔ ''زندگی کا برزخ''۔ ''موت کا بائی پاس''۔ ''بدلتی رتیں'' تمام افسانے ایسے افسانے ہیں جن میں کہیں رویوں کا ادھیڑ پن۔ کہیں رشتوں میں گھل مل جانے والی تلخی کہیں معاشرے کا کھوکھلا پن...... کہیں کرداروں کا سچا اور کھرا پن۔ ہمیں اپنے گرد و پیش پھیلی ہوئی تمام سچائیوں کا عکس دکھاتا ہوا نظر آتا ہے۔

کتاب : ادبی بیٹھک

مصنف : ڈاکٹر سید شبیہ الحسن

تبصرہ : نعیم فاطمہ علوی

ناشر : اظہار سنز۔ ۱۹ اردو بازار۔ لاہور

''صحافیوں اور کالم نگاروں کو اعزازات و انعامات سے نواز کر پوری قوم کو کالم نگار

بننے کی ترغیب دی جا رہی ہے اور ادب سرِعام رسوا ہو رہا ہے۔ اگر یہ صورت حال
چند برس مزید جاری رہی تو ہمارے معاشرے میں ادب ادیب کی وقعت ختم ہو
جائے گی اور ہمارا معاشرہ بے ادبی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ڈوب کر اپنی
شناخت کھو بیٹھے گا''۔

''میں ہمیشہ خود ساختہ اور مخصوص طرز کے کالم نگاروں کے خلاف لکھتا رہا ہوں اور
اب خود مجھے کالم لکھنے پڑ گئے''۔

ادبی بیٹھک کا مطالعہ کرتے ہوئے ان جملوں نے مجھے چونکا کر رکھ دیا۔ اور میں سوچنے پر
مجبور ہوگئی۔ صبح کے اخبار میں چھپنے والے ادبی کالم شام کو باسی اخبار کی طرح باسی ہو جاتے ہیں اور پھر کیا
کتابی صورت دینے سے وہ امر ہو جاتے ہیں؟ یا امر ہو جانے چاہئیں؟

ڈاکٹر شبیہ الحسن جیسی ہمہ گیر شخصیت جس نے ہر صنف ادب میں اپنی اہمیت اور قابلیت کا لوہا
منوایا ہے۔ وہ ادبی کالم لکھنے پر مجبور کیوں ہوا؟ کہیں ایسا تو نہیں اپنی بات عام لوگوں تک پہنچانے کے لیے
جتنے بھی فورم ہیں ان سب میں اہم اور پُر اثر فورم اخبار ہی ہے۔ انتہائی مصروفیت کے باوجود صبح اٹھتے ہی
اخبار دیکھنے اور پڑھنے کی عادت ابھی تک لوگوں میں قائم ہے۔ کالم کی کتابی صورت میں چھپنا بھی اس کی
مقبولیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ مشہور مقولہ ہے ''زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو'' کے مصداق کبھی نہ کبھی ادبی
کالم ادب کے کسی کونے کھدرے میں جگہ پا ہی لیں گے اور یوں تحقیقی، تخلیقی مضامین جو کالم کی صورت میں
لکھے گئے ہیں انمول ہو جائیں گے۔ بہرحال کالم نگاری کو ادبی حیثیت دینا اور دلوانا میرا کام نہیں...... مجھے
تو ادبی بیٹھک کا مطالعہ کرتے ہوئے بہت سے مضامین میں یہ امکانات نظر آئے...... جو باسی یا متروک
ہونے والے نہیں ہیں...... ڈاکٹر شبیہ الحسن کی ادبی بیٹھک نورتنوں سے مزین ہے۔ میں تو اسی بیٹھک کو ادبی
کیٹلاگ کا نام دوں گی جو اخبار کی طرح باسی نہیں ہو سکتی بلکہ ہر دم تروتازہ مہکتی ہوئی...... جوان امنگوں کے
ساتھ دمک رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بہت سارے نیک کام کیے ہیں۔ وہ ایک جگہ فرماتے ہیں ''مجھے کالم
لکھنے کی ترغیب معروف کالم نگار اور صحافی جناب حافظ شفیق الرحمٰن نے دی'' انہوں نے اس ترغیب کو ایمانداری

سے اگلی نسل کے حوالے کر دیا۔ حوصلہ افزائی اور سچی تعریف و تحسین سے کوئی بھی جوہری نہ صرف جوہر کی تلاش کرتا ہے بلکہ اس کی تراش خراش کا کام بھی کرتا ہے۔ انہوں نے یہ کام بڑی ہی خوبی سے کیا ہے۔

وہ ایک جگہ فرماتے ہیں "یہ کالم کم اور مختلف شذرے زیادہ ہیں" میں یہ کہوں گی کہ یہ صرف شذرے نہیں ہیں بلکہ تخلیق کار کی تخلیقی صلاحیتوں کا فنی عکس بھی ہیں...... صرف شذرے تو بے معنی سی چیز ہو کر رہ جاتے ہیں...... ویسے اگر ادبی بیٹھک کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ان کی نوکِ قلم کی زد میں آنے والے تمام تخلیق کار شریف خاندانی اور اعلیٰ حسب و نسب سے تعلق رکھنے والے ہیں...... مجھے کسی کی بھی انفرادی شخصیت جسے خاندانی جاہ و جلال سے علیحدہ کر کے دیکھا جائے بہت کم نظر آئی...... کیا انفرادی شخصیت اپنے ذاتی خدوخال اور اپنے ذاتی اوصاف کے بغیر ادھوری ہے؟

ادبی بیٹھک میں ایک اور اہم چیز مجھے ان کا رجائی انداز جگہ جگہ جھلکتا نظر آتا رہا ایک طرف تو معاشرے میں ادب کی بے ادبی...... اخلاقی قدروں کا زوال...... ادبی رسالوں کا فقدان اور ان کی مناسب پذیرائی نہ ہونے کا رونا روتے نظر آتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ وہ نامساعد حالات کے باوجود موتی چنتے اور مالا پروتے نظر آتے ہیں...... اپنے گرد و پیش سے چن چن کر اہل علم و ہنر کے سر پر دستِ شفقت رکھتے ہوئے اور محبت کے پھولوں سے دامن بھرتے ہوئے نظر آتے ہیں......

ادبی بیٹھک کے مضامین کو شبیہ الحسن صاحب نے مختلف عنوانات میں تقسیم کر دیا ہے جسے رفتگاں، سائبان، کہکشاں، ہمرہاں اور امکاں کا نام دیا ہے۔ اپنے تنقیدی مضامین میں، فنی محاسن کی تلاش بڑی عمدگی سے کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ ایک لاجواب جوہری ہیں جو ہیرے کی تلاش بھی کرتے ہیں ان کی تراش خراش کا فرض بھی سرانجام دیتے ہیں مگر حیرت ہے انہیں پروین شاکر اور فہمیدہ ریاض کی شاعری میں فنی محاسن کیوں نہیں نظر آئے۔ جوہری کی ایک اور خوبی جس کا میں نے کہکشاں میں مطالعہ اور مشاہدہ کیا وہ یہ کہ انہوں نے اپنے تنقیدی اور ادبی کالموں میں تذکیر و تانیث کے فرق کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا...... انہوں نے خواتین کی تعریف صرف خواتین سمجھ کر نہیں کی بلکہ ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے کسی بھی جانب داری یا تعصب کا مظاہرہ نہیں کیا۔ سچی سچی اور کھری کھری باتیں کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''بعض ناقدین نے گل روشاعرات کے دیدہ زیب شعری مجموعوں پر جو آراء پیش کی ہیں وہی ان کی حیثیت اور مقام کو مجروح کرنے کا سبب بنی ہیں''۔

اسی کتاب میں جس بات کا اظہار تکرار کے ساتھ کیا گیا ہے وہ یہ کہ بہترین ادب، مذہب یا عقیدے کی کوک سے جنم لیتا ہے...... یا پھر مذہب یا عقیدہ سمت نمائی کا موجب بنتا ہے۔ یہاں پہنچ کر ڈاکٹر شبیہ الحسن صاحب مسلک کے اعتبار سے مبلغ بن جاتے ہیں...... ڈاکٹر وحید الحسن ہاشمی اپنی کتاب ''جدید فن مرثیہ نگاری'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں، ''آپ جانتے ہیں مرثیوں میں بڑے بڑے مبالغے کیے گئے ہیں اور شہدائے کربلا کے مکالمات میں اپنی طرف سے قیامت کے تصرفات سے کام لیا گیا ہے''۔

اب جہاں مبالغہ آرائی ہو، وہاں تاریخ مسخ ہوتی نظر آتی ہے جہاں تاریخ مسخ ہو وہاں سچائی کی جگہ تصنع اور جھوٹ اپنی جگہ اس طرح بنا لیتا ہے کہ سچ کا گماں ہوتا ہے۔ بہر حال اگر اسی ادبی بیٹھک کو چند لفظوں میں سمیٹ دیا جائے تو میں کہوں گی ڈاکٹر شبیہ الحسن ایک حساس، محبت کرنے والے صاف اور کھرے گرد و پیش اور حالات کی نبض پر مضبوطی سے ہاتھ رکھنے والے انسان ہیں۔ جن کے دل میں، ادب، ادبیت اور اہل قلم کے لیے محبت اور ہمدردی کے چشمے پھوٹتے ہوئے نظر آتے ہیں...... وہ قلم قبیلے کا ادبی پرچم تھامے ان تھک سفر پر رواں دواں ہیں...... کسی بھی تحریک کی کامیابی کا راز ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جو سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر برابری کی سطح پر ہمت اور حوصلے سے کام کرتے ہیں۔ اللہ کرے وہ اپنا امیج برقرار رکھ سکیں۔

کتاب : زنجیر خواب (شعری مجموعہ)

مصنف : بشیر زیدی اسیر

مبصر : ناصر زیدی

ناشر : ابوالقلم اکیڈمی

قیمت : ڈھائی سو روپے

''زنجیرِ خواب'' کے ساتھ بشیر زیدی اسیرؔ خاصی تاخیر سے واردِ مُلکِ سخن ہوئے ہیں۔ وہ یہ مجموعہِ کلام اُس وقت لائے ہیں، جب اُن کے ساتھ کے اکثر و بیشتر سخن طراز اِس دُنیائے فانی سے عالمِ

جاودانی کو سدھار چکے۔ بقولِ داغؔ دہلوی، یہی کہا جا سکتا ہے

نہ جانا کہ دُنیا سے جاتا ہے کوئی ۔۔۔ بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

بشیر زیدی اسیر کون ہیں؟ کیا ہیں؟ کیوں ہیں؟ اِن سوالوں کا جواب اُنہوں نے نئی نسل کے لئے اپنے تحریر کردہ دیباچے ''خواب در خواب'' کے عنوان کے تحت بخوبی دے دیا ہے۔ فی الوقت ذاتی حوالوں سے مجھے یہ کہنا ہے کہ بشیر زیدی اسیرؔ جو ریڈیو پاکستان سے بطور کنٹرولر ریٹائر ہوئے، آج سے لگ بھگ چالیس برس قبل جب جواں سال، جواں عزم بشیر زیدی اسیرؔ ریڈیو لاہور کے پروگرام آرگنائزر تھے تو اُن کا کمرہ ''شعراء واُدبائے لاہور'' کی آماجگاہ ہُوا کرتا تھا۔ اکثر باہر سے آنے والے اہلِ علم و دانش بھی اُن کے کمرے میں رونقِ محفل بنتے۔ یہ ریڈیو لاہور کا سنہری دور تھا۔ اس زمانے میں صوفی غلام مصطفےٰ تبسم اور ناصر کاظمی جیسے ''لیجنڈ'' شاعر بطور اسٹاف آرٹسٹ ریڈیو لاہور سے مُنسلک تھے۔ اس لئے اُن کا قُرب تو بشیر زیدی اسیر کو ہمہ وقت میسّر تھا ہی، لیکن جب انہوں نے ہر ہفتے ایک مشاعرہ نشر کرنے کی بنا ڈالی تو لاہور کے تمام ہی اہم شعراء کے ساتھ ساتھ مضافات کے بعض اہل شعراء بھی اُن کی نظرِ التفات سے فیض یاب ہونے لگے۔ ان میں مُلک کے مقتدر ادبی رسائل کے مُدیر شعراء و ادبا بھی تھے۔

ان کے مرجع خلائق کمرے میں صوفی تبسم اور ناصر کاظمی کی مستقل موجودگی سے قطعِ نظر وقتاً فوقتاً اور اکثر و بیشتر آنے جانے والے ''شعرائے لاہور'' میں حضرتِ ابوالاثر حفیظ جالندھری، سید عابد علی عابد، احسان دانش، احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، عبدالحمید عدم، زیبا ناروی، قیوم نظر، عارف عبدالمتین، قتیل شفائی، وقار انبالوی، ابوظفر نازش رضوی، ہوش ترمذی، عظیم قریشی، حفیظ تائب، شہرت بخاری، طفیل ہوشیار پوری، سجاد باقر رضوی، انجم رومانی، کلیم عثمانی، ثاقب زیروی، علامہ لطیف انور، زکی کیفی، شاد امرتسری، عظیم مرتضٰی، منیر نیازی، شائق زیدی، نور بجنوری، سیف زلفی، عمر فیضی، احمد راہی، عبدالحمید بھٹی، عالمِ واسطی، رشید کامل، سرور مجاز، اکبر کاظمی، صدیق افغانی، حشمت آرا حجاب، شاعرہ وحید اور منور سلطانہ لکھنوی بھی ہُوا کرتی تھیں......!!!ان سب شعراء وشاعرات کے علاوہ ادیب، نقاد، محقق، ماہرین تعلیم، اداکار، صداکار، صحافیوں اور دانشوروں کی فہرست اس سے بھی طویل ہے مگر کیونکہ اس وقت ذکر شعر و

شاعری کا ہے، اس لئے یہ بتا رہا ہوں کہ اپنے عہد کے کیسے کیسے نابغۂ روزگار شعرائے لاہور کے جھرمٹ میں بشیر زیدی اسیرؔ مرکز و محور بنے ہر ایک کی پذیرائی کرتے پائے جاتے۔

بشیر زیدی اسیرؔ کے زیرِ نظر مجموعہ کلام ''زنجیرِ خواب'' کے بالا استیعاب مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ وہ اپنے دور کے جدید اور صاحبِ فن شاعر رہے ہیں۔ انہیں کے بقول

ہم سخن جب نہ رہا حلقۂ یاراں میں کوئی　　دل نے سیکھا در و دیوار سے باتیں کرنا

پوری توجہ سے ''زنجیرِ خواب'' کو پڑھتے ہوئے ایک بات جو بڑی نمایاں ہو کر سامنے آئی وہ یہ ہے کہ ان کے ہاں بعض لفظیات کا استعمال بالکل ان کا اپنا ہے۔ ایسا اپنا کہ جس کی مثال عہدِ موجود کی اُردو غزل میں ذرا کم کم ہی دیکھنے کو ملے گی۔ مثلاً یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ایسی نحوست اس شہر میں یارو پہلے کس نے دیکھی تھی　　اب تو ایک انار پہ ہر سُو انبوہ بیماراں ہے

ہم بھی اسیرؔ اب حیرتیوں میں سر نہوڑائے بیٹھے ہیں　　دورِ ناپرساں ہے یارو! اور مرگِ خودداراں ہے

وہ جب بھی نرغۂ اغیار میں نظر آئیں　　ہماری سمت ضرور ادبدا کے دیکھتے ہیں

ابھی کچھ اور بھی باقی ہے دیکھنے کو اسیرؔ!!!　　یہ لااُبالی سی باتیں یہ عادتیں کب تک؟

چاہنے والوں میں اُس کے یارو!　　ہو گیا خود ہی تقرر اپنا

چشم کی پُرآبیاں کب تک اسیرؔ　　کچھ رگ و پے میں لہو بھی چاہیئے

مجھے بارگاہِ جمال میں وہ ادائے درگزری ملی......!!　　مری چشمِ چشمۂ خشک کو کسی آب جُو کی تری ملی

وہ جو خاک دخوں سے گزر گئے انہیں خاک دخوں میں ملا دیا　　وہ جو حزبِ غیر کے ساتھ تھے انہیں کیسے معتبری ملی؟

ہم چھپاتے ہی رہے اپنی شکستہ حالیاں　　اس کا کیا کیجے کہ سب کچھ مشتہر آنکھوں میں ہے

فنِ سخنوری میں بشیر زیدی اسیرؔ کا باقاعدہ ایک شجرۂ ادب ہے یہ دوسری بات ہے کہ محض کسرِ نفسی یا طنزِ خفی کے طور پر وہ یوں اظہار کریں:

چرچا تھا ہر اک سُو ہُنر بے ہُنری کا سو ہم بھی ہوئے شاملِ دُنیا اُسے کہنا

''زنجیرِ خواب'' میں جن شعروں نے میرے دامنِ دل کو اپنی طرف شدّت سے کھینچا، وہ آپ بھی سن لیجئے:

جب یقیں آ گیا دل کو کہ وہ اب بھول چکا — پچھلے کچھ روز سے اس دل کو سکوں ہے یارو!!

یہ وسوسے تھے کہ تجھ سے بچھڑ کے کیا ہوگا — ترے بغیر بھی یہ زندگی گزر ہی گئی

جہاں کھڑا تھا کھڑا رہ گیا وہیں پہروں — وہ راستے میں اچانک ہوا جدا کچھ یوں

کیسا دھواں دھواں سا تھا رخصتِ یار کا سماں — اپنا بجھا بجھا سا دل اور وہ نظر اداس اداس

راہ کا ایک آشنا راہ میں کیا بچھڑ گیا — کیسے کٹا ہے کیا کہیں اپنا سفر اداس اداس

آپ اب آکے بھی کیا کیجئے گا — بس مرے حق میں دعا کیجئے گا

کسی کا شکوہ کہاں کا خود اپنے ہاتھوں سے — عروسِ زیست پہ ڈالی ردائے شامِ فراق

کبھی جو حُسن کی تابانیاں چُرائی تھیں — سو آج ہم کو ملی ہے سزائے شامِ فراق

جی میں ہے کہ جا کہئے جو بھی دل میں ہے لیکن — کون اس جہ جو کو دعوتِ عداوت دے

معاشرتی گھٹن کے دور کی ایک نظم 'فیصلہ تمہارا ہے' اور 'موجِ زیست' بھی بہت خوب ہے!

بشیر زیدی اسیرؔ نے بعض اشعار میں اپنے مرنے کی باتیں بھی کی ہیں جو ابھی انہیں نہیں کرنا چاہئیں۔ کہتے ہیں:

کس کُنجِ قفس میں ہے اسیر اُن کی بلا سے — شاید کسی اخبار میں مرنے کی خبر آئے

جانِ محفل جو تھا وہ اسیرؔ اٹھ گیا — اور محفل بجی کی بجی رہ گئی

ہے اسیرؔ آج یہ نفسا نفسی — مر کے بھی زیبِ خبر ہم نہ ہوئے

مدتوں بعد کل اسیرؔ شام کو اپنے گھر ملا — باندھ رہا ہے آجکل رختِ سفر اداس اداس

تم اسیرؔ آج جو بے نام ونشاں جیتے ہو — اس سے بہتر نہیں بے نام ونشاں مر جانا

مرے مکان پہ کوئی لگا دے یہ تختی — بشیر زیدی اسیرؔ اب یہاں نہیں رہتا

مراسلات

ڈاکٹر محمد علی صدیقی۔ کراچی

شکر گزار ہوں کہ آپ کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ مجھے آپ کا رسالہ پابندی سے ملتا ہے اور میں شرمسار ہوں کہ ابھی تک اپنا کوئی مضمون آپ کے رسالہ کیلئے بغرض اشاعت روانہ نہ کرسکا۔ آپ کا جریدہ ہر لحاظ سے معیاری ہے اس دفعہ حصہ مضامین کے بارے میں عرض کروں گا کہ اس کے دو تین مضامین آپ کے جریدہ کے معیار کے مطابق نہیں خاص طور سے ترقی پسند تحریک، اس مضمون میں ''آج'' یا ''حال'' مکمل طور پر غائب ہے۔ براہِ کرم خاکے اور افسانہ سیکشن پر بھی زیادہ توجہ دیجئے۔ اس لئے کہ آپ کے جریدہ کے مضامین بعض افسانے عموماً اچھے ہوتے ہیں۔ میں صرف اسی بار کی بات کر رہا ہوں۔ مسلم شمیم صاحب کا مضمون اچھا ہے۔ ڈاکٹر معزالدین نے ایک اچھا فریضہ سرانجام دیا ہے۔ ایک غفلت کے شکار شاعر کو سامنے لائے ہیں۔ ان کی خدمت میں میرا سلام۔

پروفیسر ڈاکٹر پیرزادہ قاسم رضا صدیقی۔ کراچی

آپ کا مراسلہ بتاریخ ۲۶ نومبر ۲۰۰۷ء بشکریہ وصول پایا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کے مجلّہ ''الاقرباء'' کو امریکہ میں شائع ہونے والی بین الاقوامی ڈائریکٹری ''الرچ'' کے ڈیٹابیس میں عالمی سطح کی ریسرچ شائع کرنے والے مجلّے کی حیثیت سے شامل کرلیا گیا ہے۔ میری طرف سے ''الاقرباء'' کی اشاعت کے دس سال مکمل ہونے پر مبارکباد قبول فرمائیے۔ خدا کرے کہ جنوری تا مارچ ۲۰۰۷ء کے شمارہ کو حسب سابق پذیرائی اور کامیابی حاصل ہو۔ اس سلسلے میں یاد فرمانے کا بہت بہت شکریہ۔

محمد اسماعیل قریشی۔ لاہور

آپ کا مکتوب گرامی موصول ہوا جس کے لیے ممنون ہوں۔ الاقرباء کے سالنامہ کے لیے آپ نے مضمون طلب کیا ہے جس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ شعر و ادب اور تحقیق کے میدان میں

الاقرباء کا کوئی ہمسر نظر نہیں آتا' یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا'۔

مجھ فقیر بے نوا کی آپ کے لیے اور آپ کے معاونین کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے ''اللھم زد فزد''۔ اقبال کے موضوع عقل و عشق کیلئے میرے پاس اپنے نوٹ موجود تھے اس لیے اس بارے میں مضمون لکھنے کا ارادہ تھا۔ پھر خیال آیا کہ اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اس لیے اقبال بہ حیثیت مفسر قرآن کے موضوع کا انتخاب کیا۔ اس دوران وفاقی شریعت کورٹ سے پاکستان کے اہم قانونی مقدمات کے لیے معاونت طلب کی گئی۔ عید بعد فرصت ملی لیکن میرے کمپیوٹر انچارج کل دستیاب ہوئے۔ خیال تھا کہ پانچ چار صفحوں میں مضمون مکمل ہو جائے گا لیکن جب لکھوانا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ یہ تو ایک سیل معانی ہے جو رکنے میں نہیں آتا۔ بہر حال تعمیل ارشاد ہو گئی ہے لیکن تشنگی برقرار ہے۔ اس کے لیے تو ایک مستقل اور ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ مضمون طویل ہو گیا ہے تو حسب منشا کم کر دیجئے۔

یہ سالنامہ بھی انشاء اللہ اپنی ارتقائی شان کے ساتھ منصۂ مشہود پر آئے گا۔ آخر میں حافظ کی زبان میں

باں گروہے کہ از ساغرِ وفا مستند   سلامِ ما برسانید ہر کجا ہستند

اکبر حیدر آبادی (آکسفورڈ۔ برطانیہ)

''الاقرباء'' کا اکتوبر، دسمبر کا شمارہ ہمیشہ کی طرح فکر افروز مضامین اور معیاری منظومات سے مزین ہے۔ اداریہ میں اردو کی منفرد ناول نگار قرۃ العین حیدر کو جو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے وہ بیک وقت نہایت جامع اور سیر حاصل ہے۔ مرحومہ پر ڈاکٹر صبیحہ صبا کی نظم دل آویز ہے۔

ڈاکٹر محمد معز الدین نے پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی کی زندگی کے نامساعد حالات اور ان کی شاعری پر بھرپور روشنی ڈال کر ان کے جو اشعار نقل کیے ہیں ان سے شاعرِ موصوف کی شاعرانہ خوبیوں اور خیالات کے تنوع کا اندازہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر شاہد اقبال کامران نے دنیا کے مختلف مذاہب میں انسان کے تعلق سے جو منفی تصورات کارفرما ہیں ان کے مقابلے میں اسلام کے مثبت و مستند نظریے کو اقبال کے یقینِ محکم اور نظرِ عمیق کی روشنی میں دیکھنے اور سمجھنے کی احسن کوشش کی ہے۔...... مسلم شمیم کے دلچسپ اور فکر انگیز مقالے میں یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے تناظر میں سرسید کے نظریات کا بڑی خوبی سے احاطہ کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر مظہر حامد نے ترقی پسند تحریک کے وجود میں آنے اور اس کے فروغ وارتقاء کے تحت ادب اور سماج میں وقوع پذیر ہونے والے اہم تغیرات کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے، جو دلچسپ بھی ہے اور معلوماتی بھی۔

مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ شاعروں کی نئی کھیپ کی طویل فہرست میں دو اہم نام ساحرلدھیانوی اور مجروح سلطانپوری شامل نہیں کیئے گئے!

آخر میں ایک چھوٹی سی شکایت، صفحہ ۱۲۲ پر میری پہلی غزل کے پانچویں شعر کے مصرعۂ ثانی ہیں ''یہ صفتِ دلبری'' کو حضرت کمپیوٹر کی ستم ظریفی نے ''یہ ادائے دلبری'' سے بدل کر مصرعے کو بے وزن کر دیا[1]! اگرچہ یہاں ادا زیادہ فصیح ہے مگر صفت بھی غلط نہیں اور مصرعے کا وزن بھی اسی لفظ سے قائم تھا۔

بیرسٹر سلیم قریشی۔ لندن

جولائی، ستمبر کا شمارہ[2] پورے آب وتاب کے ساتھ آیا۔ فیض کی زبان میں ''جیسے ویرانے میں ہولے سے چلے بادِ نسیم'' لیکن دوسرے مصرعہ کے برخلاف بیمار کو قرار آنے کے پورے وسائل ساتھ لایا۔ ''الاقرباء'' نے آپ کی انتھک کوششوں اور قابلِ قدر نگرانی میں جو بلند معیار حاصل کیا ہے وہ آسمانِ ادب میں ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔ الاقرباء اب الاقربا انٹرنیشنل ہوتا جارہا ہے۔ اس شمارہ میں آپ کا اداریہ ''ادب اور اظہار رائے کی آزادی'' حسبِ معمول متوازن اور دلائل سے مزین ہے۔ جو مجھے اظہار رائے پر اکسا رہا ہے۔

اکبر کے نورتن اپنی جگہ...... آپ کے ساتھ تو ایک کہکشاں ہے جس کی دلکش روشنی الاقرباء کے نثر اور نظم کے صفحات کو منور کر رہی ہے۔ مضامین اور مقالات میں پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی کی حمد نگاری اور نعت نگاری اور جناب نوید ظفر کے ''وطن کے خدوخال'' قاری کو دھرتی کے نشیب وفراز سے افتاں و خیزاں آسمان کی بلندیوں تک پہنچاتے ہیں۔ جناب محمد شفیع عارف دہلوی کا مضمون ''معمارِ حرم'' نہایت معلومات افزا اور بصیرت افروز ہے۔ ڈاکٹر شاہد اقبال کامران نے ''اقبال مذہب اور ترقی پسندی'' میں توازن کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

---

[1] ''ادائے دلبری'' میں لفظِ 'ادا' کا دوسرا الف واقعی بحر سے خارج ہے۔ اس سہوِ نظری پر ادارہ معذرت خواہ ہے۔

[2] فاضل مراسلہ نگار کا یہ مکتوب گذشتہ شمارہ میں سہواً شامل نہیں کیا جاسکا تھا لہٰذا اب نذرِ قارئین کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

سید انتخاب علی کمال کا مضمون ''فنِ تاریخ گوئی میں ہمزا کے اعداد کی حیثیت'' ان کے پچھلے سال اکتوبر تا دسمبر کے شمارے میں فنِ تاریخ گوی پر شائع ہونے والے مضمون کی طرح نہایت اعلیٰ تحقیقی تحریر ہے جو صاحبِ تحریر کے وسیع مطالعہ کی عکاس ہے۔ اس قدر دقیق مضمون کو اتنے دلکش انداز میں بیان کرنا ان ہی کا حصہ ہے۔ ڈاکٹر نسیم اے ہائنز نے اپنے مضمون 'پریم چند کا افسانہ روایت سے بغاوت تک' نثری ادب کے فروغ میں پریم چند کی جدو جہد کو بغاوت کی جھلکیوں کے ساتھ روایتی انداز میں پیش کیا ہے۔ محمد شیر افضل جعفری کی شاعری پر ڈاکٹر غلام شبیر رانا کا تبصرہ خاصا دلچسپ ہے۔ ''شیخ ایاز اور ترقی پسند تحریک'' میں جناب مسلم شمیم نے شیخ ایاز کے حوالے سے ترقی پسند تحریک کا اچھا جائزہ لیا ہے۔

ڈاکٹر محمد معز الدین کا ''بیادِ حکیم محمد سعید شہید'' خاکہ عظمتِ کردار کا منارۂ نور ایسا روشن منارہ ہے جس کی روشنی الاقربا کے شمارے کو منور کر رہی ہے۔ صاحبِ مضمون نے الاقربا کے ان صفحات پر الفاظ کی شکل میں حکیم صاحب کے گفتار و کردار کی پوری پوری عکاسی کی ہے۔

شہادت سے تقریباً تین چار سال قبل حکیم صاحب لندن کے اسٹر اٹفورڈ کے سوک ہال میں ایک ایجوکیشن ٹرسٹ کی طرف سے بلائے گئے جلسے کی صدارت کر رہے تھے۔ منتظمین نے مجھے ٹرسٹ کے سرپرست اعلیٰ کا پیغام پڑھ کر سنانے کی درخواست کی تھی۔ پیغام پڑھنے کے بعد مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے مختصر تمہید کے بعد حکیم صاحب کے حوالے سے اقبال کا یہ شعر پڑھا۔

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

لوگوں نے بہت پسند کیا اور منتظمین نے بھی بہت سراہا۔ چونکہ میں جلسے میں وقت سے پہلے آگیا تھا پہلی صف میں لوگوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وقت سے غالباً پانچ سات منٹ قبل حکیم صاحب ہال میں داخل ہوئے۔ درمیان میں لوگوں سے ملتے ہوئے ہماری طرف آئے۔ ایسی بے تکلفی سے بات کرنے لگے جیسے وہ ہمیں ایک عرصے سے جانتے ہوں۔ حکیم صاحب کی شہادت پر پاکستان سنٹر ولز ڈن گرین لندن میں تعزیتی جلسہ منعقد ہوا۔ مجھے بھی اظہارِ عقیدت کا موقع دیا گیا۔ میں نے فارسی کے ایک شعر کا سہارا لیا۔

بنا کردند خوش رسمے بہ خاک و خون غلطیدن خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

حاضرین مجسمِ غم بنے بیٹھے تھے۔ انصار برنی ٹرسٹ کے بانی بھی سوگواروں میں شامل تھے حکیم صاحب کے ایک عقیدت مند عقیل دانش جلسے کو کنڈکٹ کر رہے تھے۔ جلسے کے اختتام پر برادرم عقیل دانش نے جب آپ کے حوالے سے میرا تعارف کروایا تو انصار برنی کھڑے ہو کر یہ کہتے ہوئے مجھ سے بغل گیر ہوئے کہ جناب منصور عاقل میرے چچا ہیں۔ میں سوچتا رہا کہ ''یہ حکیم سعید شہید کی محفل ہے اس میں شامل ہونے ولی نامور ہستیاں بھی مشرقی روایات کی کس قدر دلدادہ ہیں''۔

ڈاکٹر عبدالحق خاں حسرت کاسگنجوی۔ حیدرآباد

الاقرباء کا تازہ شمارہ (اکتوبر۔دسمبر ۲۰۰۷) پیش نظر ہے۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ الاقرباء نے بہت کم وقت میں علمی وادبی معیار قائم کیا ہے اس کا شمار ادب کے معروف رسائل میں ہونے لگا ہے۔

آپ نے اداریہ نہیں مکمل مقالہ لکھا ہے۔ قرۃ العین حیدر کی علمی ادبی حیثیت ان کے فلسفیانہ خیالات اور ان کی گراں قدر تخلیقات کی خاصی تفصیل دی ہے۔ ان کا مقام ادب میں متعین کیا ہے۔ یہ آپ کی طرف سے خراجِ تحسین کے مترادف ہے۔ واقعی قرۃ العین نے مسلسل ستر سال اردو ادب کی کئی اصناف میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ ادب کی تاریخ کا سنہرا باب ہے۔ ادب کے حوالے سے انہیں عالمی ادب میں فخریہ پیش کیا جاسکتا ہے۔ وہ نوبل انعام کی حقدار تھیں۔ ان کی زندگی میں اور اب ان کے مرنے کے بعد ساری دنیا میں ان کی بے تحاشا خدمات کا اعتراف کیا جارہا ہے۔ آپ نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ ادب کے حوالے سے ان کا نام ہمیشہ احترام سے لیا جاتا رہے گا۔

سید انتخاب علی کمال صاحب کا مقالہ ''نابعہ روزگار تاریخ گو'' نہایت وقیع ہے اور بڑی محنت سے لکھا گیا ہے وہ اس فن پر عبور رکھتے ہیں مختلف حیثیتوں سے انہوں نے اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ ایسا فن ہے جس پر اور بھی لوگوں نے لکھا ہے لیکن کمال صاحب جن کے والد، دادا اور پر دادا سب ہی معروف تاریخ گو تھے ان کے بارے میں بھی معلومات ہیں اور تفصیل سے ہیں وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

''ترقی پسند تحریک'' اب پرانا موضوع ہوگیا۔ اس پر کوئی ستر اسی سال متواتر لکھا گیا۔ ترقی پسند تحریک وقت کی ضرورت تھی۔ اس نے ادبی حوالوں سے اس بات کو زندہ کیا تھا کہ سرمایہ دارانہ اور

جاگیردارانہ رویے اور ظلم وستم نے طبقاتی نظام کو جنم دیا تھا۔غریب غریب تر اور امیر امیر تر ہوتا جارہا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سماجی، معاشی، اخلاقی نظام سبوتاژ ہورہا تھا۔ترقی پسند تحریک کا اثر انقلابی تھا۔اس تحریک پر زوال اس وقت آیا جب اس کے ڈانڈے اشتراکیت کے انتہاپسندانہ نظریے سے مل گئے اور یہ تحریک روسی تحریک کے تحت تشدد پر اتر آئی۔ یہی ہوا جب روس اور اس کی سیاسی تحریکوں پر زوال آیا تو ترقی پسند تحریک بھی متاثر ہوئی اس کی اچھی باتیں بھی قصہ پارینہ بن کر رہ گئیں۔

نوید ظفر نے وطن کے خدوخال کے حوالے سے گوجرانوالہ اور گردونواح کے حوالے سے تاریخی انکشافات کیے ہیں۔اس علاقے میں مقبروں اور شہروں کے ذکر نے اسے اور بھی زیادہ دلچسپ بنادیا ہے۔

رانا غلام شبیر صاحب نے قرۃ العین حیدر پر معلومات کے حوالے سے بھرپور مضمون لکھا ہے۔ حج بیت اللہ کی روداد ایک معرکے کی چیز ہے عقیدت اور فرض کی تفصیل اس قدر موثر ہے کہ بار بار آنکھیں نم ہوجاتی ہیں۔ روداد میں جگہ جگہ علمی معلومات اور بھی دلچسپی بڑھادیتی ہیں۔حج بیت اللہ اور اس کے مناسک کے تمام مناظر جیسے جاگتی انکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔انسان عقیدت کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔

''آئینہ کیوں نہ دوں،، علمی معلومات کا خزانہ ہے ہر چند رفیق عزیزہ صاحب کا انداز کہیں کہیں جارحانہ ہوجاتا ہے لیکن اس کی ضرورت اس لیے ہے کہ تاجی صاحب نے ذہین شاہ تاجی کے نام سے فائدہ اٹھایا ہے۔تاجی صاحب کی شاعری اگر شاعری ہے تو قطعی دوسرے انداز کی شاعری ہے ان کی حدود اور پہنچ کا میدان دوسرا ہے۔جبکہ ذہین شاہ تاجی کی شاعری اعلیٰ اور ارفع اور وہ مذہبیات کے باب میں زیادہ سنجیدہ اور جید عالم تھے۔اگر کوئی غالب کے نام سے لکھنا شروع کردے، تو قانونی طور پر اس پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔ پڑھنے کے بعد ہی فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔اصل میں تاجی صاحب کی شاعری نقل بھی درست نہیں ہے۔ذہین شاہ تاجی اساتذہ میں شامل ہیں۔رفیق عزیزی اگر معاف کردیتے تو اس رویے کی حوصلہ افزائی ہوتی۔بعض اوقات انسان بغیر محنت کیے یہ سوچنے لگتا ہے کہ اسے اعلیٰ اور

ارفع مقام مل جائے۔

''گنجا'' ڈاکٹر عاصی کرنالی کا افسانہ ہے عاصی شاعر تو ہیں ہی لیکن افسانہ نگار بھی اچھے ہیں۔ ان کا افسانوں کا مجموعہ ''چہرہ چہرہ ایک کہانی'' شائع ہو چکا ہے جس کی کہانیاں خوب صورت ہیں اور نفسیاتی مسائل کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ان کے ہاں فلسفیانہ پہلو بھی نمایاں ہیں۔ لیکن افسانہ ''گنجا'' میں چاشنی ضرورت سے زیادہ گاڑھی ہوگئی ہے۔ یقیناً نجی محفل میں زیادہ بے تکلفی ممکن ہے لیکن اس کی زیادتی اسے بدمزہ بھی کر سکتی ہے۔ اور پھر ایسی محفل جس میں خواتین بھی ہوں اخلاق کا مسئلہ بھی پیش آ سکتا ہے۔ ہر چند اس کا اختتام چونکا دینے والا ہے۔ اگر عاصی تھوڑی سی احتیاط برتتے تو افسانہ اور بھی زیادہ موثر اور کارآمد ہو سکتا تھا۔ الاقرباء سے یہ توقع ہے کہ افسانوں اور انشائیوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔

''شہید کا وعدہ'' مذہبی عقیدت کا رنگ لیے ہوئے ایک خوبصورت خاکہ ہی ہے اس میں اسلامی تہذیب اور عقیدت کا عنصر غالب ہے، خاکے کے ساتھ یہ ایک خوب صورت مضمون بھی ہے جس میں شہلا نے اخلاقیات کو بھی شامل کر لیا ہے۔ اس خاکے نے ایمان تازہ کر دیا ہے۔ جذبۂ شہادت ہماری قوم کے ضمیر میں شامل ہونا چاہیے۔ دراصل یہ ایک آئیڈیل ہے آئیڈیلز ہی قوم کے کردار کو جلا بخشتے ہیں۔ ایسی کوششوں کو جاری رہنا چاہیے۔

نعیم فاطمہ علوی کا خاکہ علمی اور فلسفیانہ رنگ لیے ہوئے ہے اور متاثر کرتا ہے۔ ''نقد و نظر'' علمی اور ادبی حوالوں سے نہایت جاندار ہے۔ کتاب کے بارے میں علمی اور تنقیدی معلومات قاری کے ذہن پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہ سلسلہ بہت کارآمد ہے اسے جاری رہنا چاہیے۔ مراسلات فیڈ بیک کے مترادف ہیں اس سے بہت سے سوالوں کے جواب سامنے آتے ہیں اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری سوچ کا محور کیا ہے کہاں کہاں ہم سے غلطیاں ہوئی ہیں اور ان کا ازالہ کس طرح ممکن ہے۔

شفق ہاشمی۔ اسلام آباد

آپ سے گزشتہ دنوں ٹیلی فون پر گفتگو ہوئی تو اندازہ ہوا کہ ادبی جریدہ کا اجراء اور پھر اس کے معیار کا خیال فی الحقیقت آج کتنا جاں گسل ہے۔ جناب کی ہمت اور حوصلے کی یقیناً داد دینی چاہیے۔ الاقرباء

تو اُتر سے مل رہا ہے جس کے لیے ایک بار پھر بے حد شکریہ۔ آپ سے گفتگو کے بعد خیال آیا کہ کیوں نہ اپنی گذارشات تحریری شکل میں پیش کردی جائیں کہ قارئین بھی اس میں شریک ہوسکیں، سو یہ سطور حاضر ہیں۔

حالیہ شمارے میں جسے بجا طور پر اردو فکشن کی قرۃ عین (آنکھوں کی ٹھنڈک) کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے دو مضامین بطور خاص توجہ طلب ہیں: ''سرسید اور خرد افروزی کی تحریک'' اور ''ترقی پسند تحریک''...... چوں کہ دونوں مضامین شخصیات سے بڑھ کر دو عہد ساز تحریکات سے متعلق ہیں اس لیے بجا ہوگا اگر ان کا اجمالا جائزہ لے لیا جائے۔

اوّل الذکر مضمون کا تناقض یہ ہے کہ فاضل مضمون نگار نے ایک جانب ابتداء میں مذہبی جماعتوں پر عائد پرانے الزامات کے حوالے سے انہیں موردالزام ٹھہرایا ہے کہ انہوں نے تحریک پاکستان اور قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی تو دوسری طرف مسلسل یہ بات ذہین نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ نوآبادیاتی نظام کے بطن سے جنم لینے والی دوررس تبدیلیاں جنہوں نے پورے برصغیر کا سیاسی، سماجی اور تہذیبی نقشہ بدل دیا اور علی گڑھ تحریک جن تبدیلیوں کے خمیر سے وجود میں آئی اس کیلئے ہم سب کو نوآبادیاتی دور کا مرہون منت ہونا چاہیے۔ برطانوی سامراج کی خوبیاں گنواتے ہوئے موصوف رقمطراز ہیں:

> ''لہٰذا عہدِ مغلیہ کو عہدِ آزادی کہنا اور برطانوی دورِ حکومت کو عہدِ غلامی کہنا کہاں تک درست ہے اس پر غور کیا جانا چاہیے۔ میرے نزدیک تو انگریزی دورِ حکومت سے Rule of Law کا تصور وابستہ ہے اور ہمارا پورا نظامِ قانونی جو آج رائج ہے سب کا سب اس 'دورِ غلامی' کی دین ہے۔ میں تو برطانوی دورِ حکومت کے حوالے سے کوئی منفی رائے نہیں رکھتا، بلکہ اسے Blessing in Disguise سمجھتا ہوں''۔

یہ بات کہ مذہبی جماعتیں تحریکِ پاکستان اور قیام پاکستان کی مخالف تھیں ایک ایسا گھسا پٹا الزام ہے جسے اب کوئی معقول شخص سننا بھی گوارا نہیں کرے گا چہ جائیکہ کسی تحقیقی مقالہ کا وہ حصہ بنے جو تاریخی حقیقت ہے وہ یہ کہ علی گڑھ تحریک سے بھی پہلے تحریکِ دیوبند نے سامراج کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا جو بالآخر تحریک پاکستان کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اسلامیانِ برصغیر کی فکری اور سیاسی رہنمائی میں

اسیر مالٹا شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور ان کے نامور تلامذہ کا کردار نا قابل فراموش ہے۔ تحریکِ پاکستان کے ہراول دستے میں اسی لیے ہمیں ممتاز علماء دین کا ایک قافلہ نظر آتا ہے جس کے سرخیل شیخ الہند کے نامور تلامذہ میں علامہ انور شاہ کشمیری اور علامہ شبیر احمد عثمانی تھے۔ علمائے دیو بند کے پیر و مرشد مولانا اشرف علی تھانوی اور مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع کی خدمات کو بھلا کون فراموش کر سکتا ہے؟ دوسرے مکاتب فکر کے علماء میں بریلوی مسلک کے قائد علامہ عبدالحامد بدایونی اور شیعی مکتب فکر کے رہنما علامہ ابن حسن جارچوی کی خدمات سے کون واقف نہیں؟ جمعیۃ علماء ہند کا وہ حصہ جو مولانا ابوالکلام آزاد کی سرکردگی میں تقسیم کا مخالف تھا اور جس نے کانگریس کے ساتھ مل کر جدو جہد آزادی میں حصہ لیا اس نے بھی قیام پاکستان کے بعد کبھی پاکستان کی مخالفت نہیں کی۔ اس سلسلے میں آزادی کے بعد دہلی کی تاریخی جامع مسجد کے منبر سے اپنے پہلے خطبۂ جمعہ میں مولانا آزاد مرحوم نے جن جذبات کا اظہار اپنی تمامتر کانگرسی وابستگیوں کے باوجود کیا تھا وہ ہمارے لیے چشم کشا ہے۔ آپ نے پاکستان کے استحکام اور بقاء کے لیے دعا کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

> ''بارالٰہا ہماری خواہش تو نہ تھی کہ مسلمانوں کا ہر گھر تقسیم ہو جس کے نتیجے میں لاکھوں بے گناہوں کا کشت و خون ہوا مگر اب جبکہ اسلام کے نام پر پاکستان بن گیا ہے تو اسے اسلام کا قلعہ بنا اور استحکام عطا فرما!''

علماء دیو بند میں تقسیم مخالف گروہ کے قائد حضرت مولانا حسین احمد مدنی نے جب اپنی تحریر میں یہ دوررس نکتہ پیش کیا جس کی زد براہِ راست تحریک پاکستان پر پڑتی تھی کہ ''قومیں اوطان سے بنتی ہیں'' تو شعری محاذ پر اس کا فوری ردِعمل علامہ اقبال کی طرف سے ان کے مشہور قطعہ کی شکل میں یوں آیا:

عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ	ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست
سرود برسرِ منبر کہ ملت از وطن است	چہ بے خبر ز مقامِ محمدؐ عربی است
بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست	اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی ست

سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اس موقع پر آگے بڑھ کر اسلام کے نظریہ قومیت کی اپنے اچھوتے انداز میں یوں توضیح کی کہ تحریکِ پاکستان کو پہلی بار اس کی فکری غذا اور نظریاتی اساس میسر آ گئی۔ مولانا مودودی کی تصنیف "مسئلہ قومیت" کے پھر ہزاروں نسخے قائدِ اعظم علیہ الرحمۃ کی تحریک پر مسلم لیگ نے برصغیر کے طول وعرض میں پھیلا دیئے۔ یہی وہ قائد تھے جنہیں بعد ازاں قائداعظم نے بطور خاص دعوت دی کہ اسلام کے نظریہ حیات سے متعلق مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے وہ وقت کے سب سے مؤثر ذریعہ ابلاغ ریڈیو سے خطاب فرمائیں۔ اس طرح کل تیرہ تقریریں ابتداً آل انڈیا ریڈیو سے اور بعد از تقسیم ریڈیو پاکستان سے نشر ہوئیں۔ ان تقاریر کا مجموعہ "نشری تقریریں" کے عنوان سے مارکیٹ میں بآسانی دستیاب ہے۔ اس نشری خطاب کا سلسلہ شاید اور دراز ہوتا کہ عامۃ المسلمین میں پیاس بھی بہت تھی مگر قائد اعظم علیہ الرحمۃ کے وصال کے بعد یہ ممکن نہیں تھا۔ مولانا نے علامہ اقبال کی تحریک پر حیدر آباد دکن کی متمدن فضاء اور گھر بار کی تمام آسائشوں کو چھوڑ چھاڑ ہزاروں میل دور پٹھان کوٹ میں ابتداً بسیرا کر لیا تھا (۱۹۳۸ء)۔ قیام پاکستان کی مخالفت کی بنا پر یہاں سے وہ بآسانی واپس اپنے جنم بھوم لوٹ سکتے تھے مگر کیا وجہ ہے کہ تقسیم سے پہلے انہوں نے اپنے گنے چنے رفقاء کے ساتھ لاہور منتقلی کو ترجیح دی اور یہی شہر پھر ان کی تحریک کا مرکز قرار پایا اور یہیں وہ آسودۂ خاک ہوئے:

خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را!

سرسید کی تحریک، بقول فاضل مضمون نگار "براہ راست سیکولرازم سے جڑی ہے"۔ اس بحث میں پڑے بغیر کہ سیکولرازم کا مفہوم وہی ہے جو بقول صاحب مضمون "رجعت پرست حلقوں" کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے یا وہ جوان کی طرح روشن خیال گروہ پیش کرتا ہے۔ موصوف کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ Fundamentalism کی طرح Secularism کی اصطلاح بھی مغرب سے آئی ہے اور براہ راست چرچ اور ریاست کی تاریخی آویزش سے اس کا تعلق ہے۔ اسی لیے اس کے مفہوم کے تعین کا حق بھی مغرب ہی کو جاتا ہے۔ چرچ کی چیرہ دستیوں کے خلاف جو عمومی ردعمل وہاں سامنے آیا اس کے تحت جس مذہب بیزار تحریک نے جنم لیا اسے سیکولرازم کا نام دیا گیا تفصیلات دیکھنی ہوں تو Encyclopaedia

Britannica سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبال نے تو خود اس اصطلاح کا انتہائی بلیغ ترجمہ "لادینیت" کیا ہے اور پھر انہی کا یہ ارشاد بھی ہے:

لاطینی و لادینی کس پیچ میں الجھا تو   دارو ہے فقیروں کا لا غالب الا ھو

سرسید پر اس سے بڑی تہمت اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ سیکولرسٹ تھے۔ مذہبی حوالوں سے انفرادی سوچ کا یہ مطلب قطعاً نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو عبقریٔ وقت علامہ شبلی نعمانی اور مولانا الطاف حسین حالی جیسی شخصیات ان کے ساتھ نہیں چل سکتی تھیں۔ سرسید اگر سیکولر ہوتے تو کیا جامعہ علی گڑھ کے Insignia کے لیے قرآنی کلمات مقدسہ کا وہ انتخاب کرتے؟ کیا وہ اسلامیات کا مضمون لازمی قرار دیتے؟

سرکارِ انگلشیہ کی تعریف و توصیف میں فاضل مضمون نگار نے اس "نظام قانون" کا بطور خاص ذکر کیا ہے جسے وہ برصغیر کے لیے انگریز کی دین کہتے ہیں۔ ان کا مطلب ہے کہ اتنی بڑی سلطنت غزنوی، غوری، تغلق، سوری، خلجی، خاندانِ غلاماں اور خاندانِ مغلیہ کے تمام ادوار میں ہر قسم کے سول لاء اور انتظامیہ سے یکسر محروم تھی، شہنشاہانِ معظم بس مساجد اور مقبرے بنواتے رہے اور اس میں دفن ہوتے رہے۔ موصوف کو شاید علم نہیں کہ وہ گلا سڑا اینگلو سیکسن قانون جسے انگریز کی باقیادت نے آج بھی ہمارے یہاں سینے سے لگا رکھا ہے اسے خود اہل برطانیہ اپنے گھر سے دیس نکالا دے چکے ہیں اور ترمیم و تنسیخ کے بعد اس کی ہیئت کچھ کی کچھ ہو چکی ہے۔ محترم نے ارشاد فرمایا کہ "ہزار سالہ مسلم دورِ حکومت نے اس ملک کو چند مسجدوں اور چند مقبروں کے علاوہ کچھ نہیں دیا"۔ وہ عہدِ زریں جس نے اس پراگندہ انسانی جزیرے کو پہلی بار ایک متحدہ ریاست کی شکل دی، عربی لغت سے مستعار اسے اس کا نام "ہند" عطا کیا، اسے جداگانہ شناخت اور تہذیب بخشی، اس میں آباد پس ماندہ اقوام کو سر اٹھا کر چلنے کی ادا سکھائی، قد آور علمی شخصیات اور ادارے پروان چڑھائے، اس کی اپنی بھانت بھانت کی بولیوں اور مردہ زبان کی خاک سے نئی بول چال اور ایک بلند آہنگ بین الانسانی زبان منصۂ شہود پر ابھری، ان تمام کارہائے نمایاں پر بیک جنبش قلم سیاہی پھیر دینا کیا زیب دے سکتا ہے۔

محترم نے ایک اور خوبصورت ترکیب ''رجعت پرست'' بھی وضع کی ہے۔ اس طرح پھر ترقی پسند حضرات ''ترقی پرست'' ٹھہرے! لطف کی بات یہ ہے کہ یہ دونوں اصطلاحیں اب اپنا معنی ومفہوم کھو چکی ہیں، بالکل اسی طرح جیسے Left اور Right کی ترکیبیں اشتراکیت کی اپنے جنم بھوم میں پسپائی کے بعد Obsolete اور Outdated ہو چکی ہیں۔ کاروانِ ادب ترقی پسندی کو بہت پیچھے چھوڑ کر کب کا آگے بڑھ چکا ہے اور یہ تحریک محض ایک تاریخی حوالہ بن کر رہ گئی ہے۔ آج اصطلاحی معنوں میں دیکھا جائے تو ہر صاحب فکرِ سلیم ان دونوں کیفیات کا حامل ہے۔ وہ رجعت پسند ہے کہ ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے اور ترقی پسند بھی ہے کہ ترقی ایک فطری عمل ہے اور جبلی تقاضا بھی۔

دوسری تحریر کسی تفصیلی جائزہ کی مستحق نہیں اس لیے چند گزارشات پر ہی اکتفا کرونگا۔ ڈاکٹر مظہر حامد صاحب کا مضمون ''ترقی پسند تحریک، نئے سماج کی تعمیر میں اہم کردار'' پڑھ کر بے اختیار ڈپٹی نذیر احمد مرحوم سے منسوب وہ لطیفہ یاد آ گیا کہ جب کسی نے ان سے پوچھا کہ اس بلند پایہ علمی مقام اور جملہ وسائل رزق کے باوصف آپ پی ایچ ڈی کیوں نہیں کر لیتے تو جناب نے برجستہ جواب دیا کہ ''اگر مروجہ معیار کی پی ایچ ڈی ہی کرنی ہے تو پھر ''پھاٹک جبش خان، دہلی'' کا رہائشی ہونے کے ناطے میں تو پیدائشی پی ایچ ڈی ہوں'' [!]۔ ترقی پسند تحریک کے حوالے سے مضامین اور کتب لاتعداد ہیں۔ کسی نئے پہلو سے اس تحریک کا جائزہ لیا جاتا تو یقیناً کام کی بات ہوتی۔

سید انتخاب علی کمال۔ کراچی

الاقرباء کا تازہ شمارہ ملا۔ حسین سرورق پر قرۃ العین حیدر کی نیلگوں تصویر، اداریہ ''چراغ تیز ہوا نے بُجھا دیئے کیا کیا'' اعلیٰ تحریر ''پروفیسر مسلم عظیم آبادی کی شاعری'' مقالۂ پرتاثیر، دوسرا مقالہ ''حضرت انسان اور اقبال'' بھی لائق توقیر، اور سر سید اور خرد افروزی کی تحریک جامعیت کی تفسیر، اس کے بعد عاجز و حقیر کا مقالہ زینت بنا ہے۔ جس میں الاقرباء کے صفحہ ۵۹ پر نواب سراج الدین احمد خاں، سائل دہلوی کی

! 'پھاٹک جبش خاں دہلی' انگریزی رسم الخط میں لکھا جائے تو لفظوں کے پہلے حروف کا مجموعہ Ph.d بنتا ہے۔ (ادارہ)

وفات پر کہا ہوا حضرت شادؔ جے پوری کا تاریخی مصرع۔ ''بود آں اے چشم حق بیں، شرع اوصافِ کمال''
چھپا ہے۔ موجودہ حالت میں اس مصرع کے اعداد ۱۴۲۶ ہوتے ہیں اس لئے میں نے اس مصرع کو ''بود
آں اے چشم حق، شرع اوصافِ کمال'' لکھ کر اعداد پورے کردیئے تھے مگر آپ نے حاشیہ میں ارشاد فرمایا
کہ ''اس طرح عدد تو پورے ہوگئے مگر مصرع خارج از وزن ہوگیا'' لہٰذا میں نے حضرت قبلہ داد جان کی
قلمی بیاض ''عرضِ شادؔ'' میں مذکورہ مصرع کو تلاش کیا تو اسمیں یہ مصرع یوں لکھا ہے:۔

''بود آں اے چشم حق بیں، شرح اوصاف کمال''

۱۳ ہجری ۶۴

''شرح'' (ش+ر+ح) کے عدد ۵۰۸ ہوتے ہیں۔ اور ''شرع'' (ش+ر+ع) کے عدد
۵۷۰ ہوتے ہیں۔ سہ ماہی اردو میں ''شرح'' کے بجائے ''شرع'' کمپوز ہوگیا ہے۔ اس لئے مصرع کا
میزان ۱۳۶۴ کے بجائے ۱۴۲۶ ہوگیا ہے لہٰذا سہ ماہی الاقرباء اور سہ ماہی اردو کے قارئین تصحیح فرمالیں۔
میں اپنی تسامح پر اپنے معزز قارئین سے معذرت خواہ ہوں۔ اور آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے میری فرد
گذاشت پر مجھے متوجہ فرمایا۔ بہر حال اب مصرع کا وزن بھی درست اور اعداد بھی بلکہ مفہوم جامع ہوگیا۔
شرع سے مفہوم بھی متاثر تھا۔ مراسلات میں میرے سابقہ مقالے پر (فنِ تاریخ گوئی میں ہمزہ کے اعداد
کی حیثیت) محترم جناب عقیل دانش نے لندن سے، محترم جناب سید سلمان رضوی نے اسلام آباد سے
اور محترم جناب سید حبیب اللہ بخاری نے بہاولپور سے، اور محترمہ ڈاکٹر مسز نازیہ فہیم الدین نے لاہور سے
اظہار پسندیدگی فرما کر تعریفی کلمات تحریر فرمائے ان سب کے حسنِ ظن کیلئے شکریہ۔ الحمدللہ! پروردگار
نے دوسروں کی نگاہوں کے دریچوں سے اس کاوش کو دیکھنے کے امتحان میں کامیاب کیا۔ محترم جناب سید
سلمان رضوی کا تو بہت ہی شکریہ کہ موصوف نے خصوصی توجہ فرما کر اپنے مراسلے کی اکتیس سطروں میں سے
بیس سطریں فنِ تاریخ گوئی پر تحریر فرمانے کی زحمت گوارا فرمائی۔ ''ہمزۂ وصل''۔ ''احسن التواریخ'' اور
حضرت شمیم صبائی متھراوی کی غیر مطبوعہ کتاب کے حوالے نے فن تاریخ گوئی پر ان کا قابلِ قدر مطالعہ بھی
ثابت کردیا۔ لیکن موصوف کا ایک جملہ ''لیکن کیوں ہے؟'' ذرا وضاحت چاہتا ہے۔ اس ''کیوں'' کے

جواب میں عرض ہے:

☆ ''اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی اور قابلِ احترام ''یونیسکو'' نے قدیم تہذیب وتمدّن پر گفتگو کی اسلامی جمہوریہ ایران کی تجویز کو منظور فرمالیا ہے''۔ (از پروفیسر ڈاکٹر رضا مصطفوی سبزواری۔ سہ ماہی ''پیغامِ آشنا''۔ اسلام آباد۔ جون ۲۰۰۱ء)

☆ ''تہران یونیورسٹی آف میڈیکل سائنسز اینڈ ہیلتھ سروسز اور اسکی اعلیٰ انتظامیہ تمدنوں کے مابین گفتگو کرنے اور اسے وسعت دینے اور اسے فروغ دینے پر خاص توجہ دے رہی ہے''۔ (ڈاکٹر ضیائی۔ ماہنامہ ''مجحوبہ'' جلد ۲۰، شمارہ ۱، جنوری ۲۰۰۱ء۔ تہران۔ اسلامی جمہوریہ ایران۔ بحوالہ جواد فلاحی)

اس کمپیوٹرائزڈ دور میں قدیم تہذیب وتمدّن پر گفتگو کیوں کی جارہی ہے؟ ہم موہنجوڈارو اور ہڑپہ کے کھنڈروں اور وادیٔ دجلہ وفرات کی سطح مرتفع کی ''الجھنوں'' میں اپنا قیمتی وقت اور قومی سرمایہ کیوں خرچ کر رہے ہیں؟ اپنی قدیم تہذیب، ثقافت اور تمدّن کو کیوں کھو رہے ہیں؟ فنِ تاریخ گوئی بھی ہماری قدیم ادبی تہذیب وثقافت کا وَرثہ ہے۔ لہٰذا ہمیں فنِ تاریخ گوئی میں ہمزہ کی عددی قیمت قدیم اصولوں اور قواعد کے مطابق ہی شمار کرنی ہوگی۔ اپنی مرضی سے ہمزہ کا ایک عدد شمار کرلینا کہاں کا اصول ہے۔ یوں تو ہمزہ کا ایک عدد شمار کرنے کی مثالیں میں خود بھی پیش کر چکا ہوں۔ خالد یوسف صاحب آکسفورڈ سے جسے شترگربہ فرمارہے ہیں۔ غلط العام ہے جو جائز ہوتا ہے۔

ثناءاللہ اختر۔ راولپنڈی

سہ ماہی ''الاقرباء'' اسلام آباد کے شمارہ اکتوبر ردسمبر ۲۰۰۷ء میں الاقرباء کے صدر نشین سید منصور عاقل کا اداریہ جس میں انہوں نے معروف قلمکار قرۃ العین حیدر کی تاریخ وثقافت کے حوالے سے ادبی اور علمی خدمات کا تذکرہ کیا ہے اپنی جامعیت اور تجزیاتی معیار سے متصف ہونے کے علاوہ فکرانگیز ہے، اور تحقیق وتدقیق کی دعوت بھی دیتا ہے، وہ بجاطور پر پُرامید ہیں کہ نسلِ نو کے اہلِ قلم روشنیوں کے اُس ورثہ کو جو قرۃ العین انہیں سپرد کرگئی ہیں سنبھالتے ہوئے تسلسل کے ساتھ آگے بڑھاکر نئی وسعتوں اور بلندیوں سے ہمکنار کرینگے۔

ادب بلاشبہ روز مرہ زندگی کا عکاس ہے چنانچہ اصحاب علم و دانش کی تحریروں اور نگارشات سے جو وحدتِ فکر پیدا ہوتی ہے وہ اتحاد و یکجہتی کا سبب بنتی ہے اور زندگی کی کثافتوں کو مٹا کر لطافتوں کا خوشگوار ماحول پیدا کرتی ہے۔ قرۃ العین اور دوسرے اہل علم و دانش آفاقی سوچ رکھنے والے قلمکار تحسین و تعریف کے مستحق ہیں جو اپنی بلند نگاہی اور اعلیٰ ظرفی سے انسانی اقدار کے فروغ کے لئے کام کرتے رہے اور اب تک اپنی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ سید منصور عاقل نے اپنے اداریے میں قرۃ العین کے بارے میں بجا طور پر لکھا ہے کہ

"آج برِ صغیر میں مسلم تہذیب کی تاریخ، انکے ناولوں کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جاتی"

اور یہ کہ "جدید حسیت اور رومانوی حقیقت پسندی کی جو شمعیں انہوں نے اپنی تحریروں سے روشن کی ہیں دیکھنا ہے کہ ہمارے ناول اور افسانہ نگار انہیں تسلسل عطا کرنے میں کس حد تک اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہیں"۔

ڈاکٹر شاہد اقبال کامران کی "حضرت انسان اور اقبال" کے عنوان سے مقالے میں پیش کی گئی یہ رائے درست ہے کہ "جملہ مذاہب اور حکماء و فلاسفہ کے مکاتب فکر کا ہدف بنیادی طور پر حضرت انسان ہی رہا ہے اور سب کی کوشش یہی رہی کہ کسی طرح انسان، مصائب و مشکلات سے نجات پا کر امن و آشتی کی زندگی گزار سکے"، ڈاکٹر صاحب نے اس مشترکہ مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مختلف مکاتب فکر کی طرف سے جن دو عمومی رجحانات کی نشان دہی کی ہے ان میں اول رجحان حقائق کے بجائے محض قیاس پر مبنی نظر آتا ہے۔ لکھتے ہیں "وہ ادیان اور وہ مکاتب فکر جو انسان کو بنیادی طور پر کمزور، ناقص اور بے بس تصور کر کے اس کی نجات ایک غیر متحرک یا جامد طرز عمل میں تجویز کرتے ہیں...... ان ادیان و مکاتب فکر میں بدھ مت، ہندو مت، کسی حد تک عیسائیت اور فلسفیانہ مکاتب فکر میں افلاطونی مکاتب فکر شامل ہیں جو زندگی کو لا یعنی لغو اور انسان کو "آوٹ سائڈر" Outsider اور سٹرینجر (Stranger) کہہ کر اسے یتیم و لاوارث کا خطاب دیتے ہیں"۔

فاضل مقالہ نگار کی اس رائے سے اتفاق کرنا مشکل نظر آتا ہے بلکہ یہ محاکمہ حقیقت سے بہت

دور اور مذکورہ مذاہب سے متعلق عدم واقفیت کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ بدھ مت کے حوالے سے گوتم بدھ کا ایک بڑا مرتبہ و مقام ہے۔ انہیں انسانوں کا نجات دہندہ خیال کیا جاتا ہے۔ گوتم بدھ نے اپنی تعلیمات میں اصلاح نفس کے ذریعے برائیوں سے بچنے، اعلیٰ انسانی اوصاف راست گوئی، راست بازی اور حلال روزی نیز عزم صمیم کے ذریعے نفس امارہ کو قابو میں رکھنے، غلط خواہشات کو روکنے، علم و معرفت کے حصول پر بھرپور توجہ دینے اور خاندانی و معاشرتی فرائض احسن طور پر پورا کرنے کا درس دیا۔ یہ تمام فرائض عمل کے متقاضی ہیں۔ انہوں نے کہیں بھی غیر متحرک رہنے اور جامد طرزِ عمل اپنانے کے لیے نہیں کہا۔ چنانچہ ڈاکٹر شاہد کا یہ کہنا ''یہی وجہ ہے کہ بدھ مت نہ تو کوئی اعلیٰ تمدن پیش کر سکا اور نہ ہی ایسے افراد کو جنہوں نے انسانیت کی ارتقاء میں اس طور پر معاونت کی ہو جس طور مسلم نفوس نے کی''۔ حقائق پر مبنی نہیں ہے جدید دور میں بھی مشرق بعید کے کئی ممالک میں اس مت کے زیر اثر تہذیب و تمدن اپنی تمام توانائیوں کے ساتھ موجود ہے۔ لوگ اس کے زیر اثر بے عمل نہیں ہوئے اور تسخیر فطرت اور کئی ایجادات کر کے بنی نوع انسان کے لیے آسانیاں اور سہولیات پیدا کر رہے ہیں۔ سائنسی علوم کے حصول کے سبب تعمیر و ترقی کی عملی کاوشوں میں کئی اقوام سے آگے ہیں۔ جامد طرزِ عمل کی تلقین کرنے والے مذاہب میں انہوں نے ہندومت کو بھی شامل کیا ہے حالانکہ اس مذہب نے ویدوں میں علم و معرفت حاصل کرنے اور ریاضت کی طرف توجہ دینے کی تلقین کی نیز زندگی کے معمولات جاری رکھنے سے منع نہیں کیا۔

ڈاکٹر شاہد نے علامہ اقبال کی اس رائے سے کہ ''مسیحیت مذہبی نظام کی حیثیت سے گناہ کی حقیقت پر مبنی ہے۔ اس مذہب میں دنیا کو بدی اور گناہ کو انسان کے لیے موروثی شمار کیا جاتا ہے۔ انسان انفرادیت کے لحاظ سے ناقص ہے۔ اسے کسی کا فوق الفطرت شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کے اور اخلاق کے درمیان واسطہ بنے''، مکمل اتفاق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''عیسائیت کا یہی رویہ تھا جس کے باعث جب تک اس کا یورپ میں غلبہ رہا، یورپ تاریک اور ذلیل رہا اور جس دن مغربیوں نے کلیسا کے مذہبی استبداد سے تنگ آ کر کلیسا کو عملی زندگی سے نکال باہر کیا وہ دن ان کی ترقی کا پہلا دن تھا۔

جہاں تک اس رائے کا تعلق ہے کہ یورپ میں ترقی اس وقت شروع ہوئی جب مغربیوں نے

کلیسا یعنی مذہب کو زندگی سے باہر نکال کیا درست نہیں۔ اگر یورپ کی تیز رفتار تعمیر و ترقی کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ اس کی وجوہات متعدد اور عوامل بھی مختلف نوعیت کے تھے۔ یورپ کی معاشی ترقی اور سیاسی استیلا کے اسباب میں یورپ میں احیائے علوم، لوہے اور کوئلے کی دریافت سے صنعتی ترقی اور تجارت کی وسعت شہریوں کے آرام و آسائش کی بڑھتی ہوئی طلب کی بناء پر تجارت میں فروغ اور جدید سامان نقل و حمل اور جنگی اسلحہ کی تیاری نیز پرنٹنگ پریس کی ایجاد سے علوم و فنون تک عام لوگوں کی رسائی شامل تھی۔ مذہب کا عمل دخل یورپین اقوام میں ختم نہیں ہوا بلکہ انہوں نے اپنے مذہب کو اپنی نوآبادیات اور تجارتی مراکز میں پھیلانے کیلئے چرچ قائم کئے اور مبلغ متعین کیے جو بحری جہازوں کے سفر کے دوران بھی عیسائیت کی تبلیغ کرتے تھے۔ ڈاکٹر شاہد نے اس امر پر بھی یقین کرلیا کہ افلاطونی فلسفہ بے عملی کا مظہر ہے۔ ڈاکٹر نیاز فتح پوری کی تحقیق مندرجہ بالا رائے کے برعکس ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ''افلاطون نہ راہب تھا، نہ بے عملی کی زندگی کا مبلغ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنی بے عمل زندگی کی بدولت ملک و وطن سے نکالا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ افلاطونی تعلیمات نے قوموں کو بے عمل نہیں بنایا بلکہ جو قومیں بے عملی کی بنا پر زندگی سے محروم ہوگئیں انہوں نے افلاطونی افکار کی غلط تاویلیں کیں۔''

جناب مسلم شمیم نے اپنے مقالے بعنوان ''سرسید اور خرد افروزی کی تحریک'' میں سرسید کی برصغیر کے مسلمانوں کو علم و شعور سے بہرہ ور کرنے کے ضمن میں خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ان کی غیر معمولی تعریف اور توصیف کی ہے مگر ساتھ ہی دوسرے ممتاز کابرین کی مسلمانوں کی علمی، مذہبی اور سیاسی بیداری کے سلسلے میں جدوجہد اور تحریکوں کو ناکام قرار دے کر اس پر تشکر اور طمانیت قلب کا اظہار کرتے ہوئے یہ تاثر بھی دیا ہے کہ اگر مذکورہ رہنما اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جاتے تو سرسید کی خرد افروزی کا عمل رک جاتا اور مسلمانوں کی پسماندگی کی حالت موجودہ افغانستان سے بھی بدتر ہوتی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علی گڑھ کے ادارے نے سکول و کالج اور پھر یونیورسٹی کی درجہ تک بلند ہونے کے دوران مسلمانوں میں تعلیم کے فروغ اور خصوصی طور پر انگریزی زبان سکھانے میں اہم کردار ادا کیا مگر جدید علوم کی ترویج کا اعزاز تمام کا تمام سرسید خان کو دینا درست نہ ہوگا۔ مسلم شمیم صاحب کو غالبا

اس بارے میں آگاہی نہیں کہ جنگ آزادی کے بعد برطانوی حکومت نے مسلمانوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا مگر جلد ہی نئے سیاسی حالات میں انہوں نے اپنی سابقہ روش اور پالیسی کو تبدیل کر کے مسلمانوں سے معاندانہ رویہ ختم کرنے کے اقدامات کرنے شروع کر دیے اور اپنی زیادتیوں کی تلافی بھی شروع کر دی۔ سلطان ٹیپو کی شہادت کے بعد سے تمام شہزادے نظر بندی کی زندگی گزار رہے تھے مگر نئی حکمت عملی کے تحت سلطان کے بیٹے غلام محمد کو سر کا خطاب دیا گیا۔ جنگ آزادی کے قیدیوں کو رہائی دی گئی اور ہر سال مسلمانوں کی نامور شخصیات کو شمس العلماء اور خان بہادر کے خطابات ملنے لگے۔ اس دور میں مسلمان رہنماؤں کے قتل عام اور قید و بند کے بعد پیدا ہونے والے خلا کو پر کرنے کے لیے انگریز سر سید احمد خان کو سامنے لائے جنہوں نے حکومت سے وفاداری کا اظہار کیا۔ مزید برآں مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی دور کرنے بلکہ انہیں جدید انگریزی پڑھانے اور جدید علوم سکھانے کے لیے تعلیم کمیشن قائم کیا جس کی رپورٹ آنے کے بعد مختلف شہروں میں قائم کیے گئے انگریزی سکولوں میں انگریزی کے مسلمان استادوں کی تقرری کی گئی اور ایسے سکول کھولنے والوں کی مالی اعانت شروع ہو گئی۔ مقامی لوگوں کو جس میں مسلمان بھی تھے انگریزی تعلیم کے ذریعے حکومتی نظام میں شامل کرنے کی پالیسی شروع ہوئی۔ ۱۸۶۴ء میں لکھنو میں کیننگ کالج اور ۱۸۷۰ء میں اورینٹل کالج لاہور قائم ہوا جبکہ قبل ازیں ۱۸۵۷ء میں ہی کلکتہ اور ممبئی اور مدراس میں یونیورسٹیاں قائم کر دی گئیں تھیں۔ سر سید نے بھی دو سکول قائم کیے تھے الغرض ملک کے طول وعرض میں سکولوں اور کالجوں کا نظام جاری کیا گیا۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے انہوں نے ۱۸۷۱ء سے ۱۸۸۴ء تک ہندوؤں کے مقابلے میں جدید تعلیم سے زیادہ فائدہ اٹھایا اور ان کی تعداد پرائیوٹ سیکنڈری سکولوں میں زیادہ تھی۔ اس عرصہ میں یوپی کے مسلمان پورے ہندوستان میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اور خوشحال تھے۔ علی گڑھ کالج سے ۱۸۸۲ء سے ۱۹۰۲ء تک ۲۲۰ گریجویٹ نکلے جبکہ الہ آباد یونیورسٹی نے اس دور میں ۱۰۴ مسلمان گریجویٹ پیدا کیے۔ برطانوی پالیسی کے تحت گورنمنٹ سکولوں اور کالجوں میں انگریزی کے ساتھ عربی، فارسی، اُردو کی تعلیم دینے کی بھی منظوری ہوئی۔ مغربی تعلیم کی ترویج کے ضمن میں بیرسٹر بدرالدین طیب جی نے صوبہ ممبئی میں قائم ۱۱۱ مدارس کی اصلاح کی اور ۱۸۸۰ء میں ایک انجمن کے ذریعے

ہاں مغربی تعلیم کا سکول کھولا۔ اسی دوران کراچی میں سندھ مدرسۃ الاسلام اور لاہور میں انجمن حمایت اسلام کے سکول اور کالج قائم ہوئے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی طرز کی تعلیم حاصل کرنے کا حساس باشعور مسلمان قیادت کو ہو چکا تھا اور عام مسلمان بھی اس تعلیم کے مخالف نہ تھے۔ اور علی گڑھ کالج یا سکول سے قبل بھی وہ جدید تعلیم حاصل کر کے ملازمتوں میں آ چکے تھے۔ انھیں اگر اعتراض تھا تو وہ سرسید کے ہبی افکار، حکومت کی وفاداری اور مذہبی اور انگریزی تہذیب کی وکالت کرنے پر تھا۔ سرسید کے سامنے سکول ر کالج قائم کرنے کے علمی مقاصد کے علاوہ حکومت کی سیاسی پالیسیوں کی پیروی بھی تھی۔

جہاں تک ہندوستان کے مسلمانوں میں علم و شعور سے بیداری کا تعلق ہے۔ اس میں شاہ ولی اللہ ی تحریک احیائے اسلام کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جنھوں نے اپنی تعلیمات اور نگارشات کے ریعے مسلمانوں کے زوال کے نتیجے میں ذہنی علمی اور دینی فکر کی پستی کو روکا۔ پھر تحریک مجاہدین نے سید احمد ریلوی اور ان کے رفقاء کی قیادت میں اسلامی ریاست کی قیام کے ذریعے سامراج سے مقابلہ کا جذبہ اور حساس پیدا کیا۔ جنگ آزادی کے دس برس بعد علماء نے اپنی علمی جدوجہد کا رخ بدلا اور اپنی مدد آپ کے تحت یوبند کی درسگاہ قائم کر کے مسلمانوں کو باشعور اور بیدار کرنا شروع کر دیا۔ بیسویں صدی میں ندوۃ العلماء نے ینی علوم کے ساتھ جدید علوم و فنون سے مسلمانوں کو بہرہ ور کرنے کے لیے درس گاہ قائم کی جبکہ جامعہ ملیہ سلامیہ دہلی بھی اسی طرح کی ایک کوشش تھی۔ جدید دور کے تمام علوم میں مسلمان طلبا کی تربیت کر کے ان کے ہنوں کو غلامی کے اثرات سے نجات دلانے، خود اعتمادی پیدا کرنے اور سیاسی بیداری پیدا کرنے کے عمل کو تیز کیا گیا۔ دیوبند مکتبہ فکر کے مولانا عبید اللہ سندھی نے اس امر پر زور دیا کہ دنیا میں ترقی کے لیے علم اور سائنس کو زندگی کی اساس بنایا جائے۔ اور یورپ کی طرح صنعتی اور معاشی تنظیم کی تلقین کی۔ مولانا محمد علی جوہر نے جدید دور کے تمام علوم سکھانے اور انگریزی کو اول جماعت سے رائج کرنے کی مساعی کیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے مذہبی اور دینی رہنماؤں کی کوششوں سے ہی برصغیر کے مسلمان الحاد اور بے دینی کے اثرات سے محفوظ رہے اور مسلمانوں کا تشخص قائم رہا اور دوسرے مذاہب انہیں جذب نہ کر سکے۔ ملک کو آزادی میسر آئی اور مسلمان انگریز راج کی برکتوں پر پروپیگنڈہ کے باوجود غلام رہنے پر راضی

نہ ہوئے۔ آزادی، حریت، دین اور وطن کیلئے قربانیوں کا جذبہ نیز شجاعت و عزم وہمت کے چراغ دینی رہنماؤں نے ہی جلائے اور یہی نہیں بلکہ تقسیم ہندوستان کے بعد مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو ہندوؤں کے ظلم وستم سے بچانے، حکومت کے معاملات میں شریک کرنے اور دیگر تحفظات مہیا کرنے کیلئے آگے آئے۔

امین راحت چغتائی۔ راولپنڈی

اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۸ء کا ''الاقربا'' نظر نواز ہوا۔ حصہ مقالات بہت عمدہ ہے۔ ڈاکٹر معز الدین صاحب کو آپ نے صحیح کام تفویض کر رکھا ہے۔ ان کا ہر مقالہ فکر انگیز بھی ہوتا ہے اور ادب کے کچھ نئے پہلو بھی تلاش کرتا رہتا ہے۔ مسلم عظیم آبادی پر ان کا مقالہ بھی بے حد معلومات افزا اور محققانہ انداز کا حامل ہے۔ علمائے صادق پور کے افراد خاندان کے بارے میں پڑھنا تو میں یوں بھی اپنی سعادت سمجھتا ہوں۔ علمائے صادق پور پر تو ڈاکٹر صاحب کی بیگم کی کتاب معلومات کا اتنا بڑا خزانہ ہے کہ اس سے ایمان کو اور تقویت ملتی ہے۔

ترقی پسند تحریک پر ڈاکٹر مظہر حامد صاحب کا مقالہ بھی پسند آیا۔ انہوں نے شرح صدر کے ساتھ تحریک کا معروضی انداز میں تجزیہ کیا ہے۔ خوشی ہوئی کہ انہوں نے تحریک کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا۔ آج کے ادب میں جو بھی تنوع ہے اس میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی خدمات سب سے زیادہ ہیں۔ تفصیل میں جانے کا محل نہیں۔ اس پہلو پر بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ البتہ مذکورہ مقالے کے حوالے سے اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ضیا جالندھری اس تحریک کا کبھی بھی حصہ نہیں رہے۔ وہ تو میراجی کے مکتبِ فکر کے شاعر ہیں۔

آپ کی ادارتی صلاحیتوں کی تعریف اس لیے نہیں کرنا چاہتا کہ ''نظر لگے نہ کہیں تیرے دست بازو کو۔''

ڈاکٹر مظہر حامد۔ کراچی

الاقرباء اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۷ء موصول ہوا، دلی مسرت ہوئی۔ الاقرباء کا معیار تو پہلے ہی اعلیٰ و ارفع تھا، البتہ اب مزید نکھار سا آرہا ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ الاقرباء پر شباب آرہا ہے۔ ایک کہکشاں ہے جو جگمگا رہی ہے۔ ایک گلستان ہے جس میں رنگ رنگ کے پھول کھلے ہوئے ہیں اور خوشبو دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر شاہد اقبال کامران کو میری جانب سے مبارکباد دیجیے گا، انہوں نے اقبال کے افکار و

خیالات کو وقت کی مناسبت سے پیش کیا ہے۔ یہی وہ افکارِ تازہ ہیں اگر قوم عمل پیرا ہو جائے تو ٹھہری ہوئی زندگی میں انقلاب آ جائے، یہ وقت کی ضرورت بھی ہے اور اقبال کی خدمات کا اعتراف بھی۔ ڈاکٹر منیر الدین کا مضمون مسلم عظیم آبادی پر تحقیقی اور معلوماتی ہے، عرق ریزی اور ژرف نگاہی ہر سطر سے پھوٹے پڑ رہی ہے۔ مسلم شمیم اردو ادب وشعر میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں، ان کا مضمون معاشرتی، سماجی اور تاریخی اعتبار سے نہایت اہم ہے۔ نوید ظفر کا مضمون تاریخی اعتبار سے خوب تر ہے۔

گوشہ قراۃ العین مخصوص کر کے بین الاقوامی مصنفہ کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے، یقیناً فکشن میں بہت بڑا نام ہے۔ نظمیں اور غزلیں فکری اور فنی لحاظ سے اعلیٰ تر ہیں۔ منصور عاقل صاحب کے تبصرے نہایت عالمانہ اور اعلیٰ فکر کے ترجمان ہیں۔

خالد یوسف (آکسفورڈ برطانیہ)

امید ہے بخیریت ہوں گے۔ اکتوبر۔ دسمبر کا ''الاقرباء'' بہشت نظر ہوا۔ حسب معمول عمدہ اور معیاری نگارشات سے آراستہ ہے۔ مرحومہ قرۃ العین حیدر پر اداریہ دلدوز اور برمحل ہے کہ ان کی رحلت ہم سب کا دکھ ہے اور اردو ادب کے لیے ایک ناقابل تلافی نقصان۔ خدا انہیں جنت الفردوس نصیب کرے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر صبیحہ صبا کی نظم بھی تاثر سے بھرپور ہے۔

مسلم شمیم کی تحریر، سرسید اور خرد افروزی کی تحریک اور ڈاکٹر مظہر حامد کا مضمون، ترقی پسند تحریک، نئے سماج کی تعمیر میں اہم کردار، برصغیر میں ترقی پسند تحریک کی ضرورت اور ارتقاء کو سمجھنے اور سمجھانے میں بے حد مثبت کردار ادا کر رہے ہیں۔ حقیقتاً جب یورپ میں چھاپہ خانے کی ایجاد کے طفیل بائبل کے لاکھوں نسخے چھاپ کر تقسیم کئے جا رہے تھے تو ہمارے ہاں یا تو تاج محل بن رہے تھے اور یا اورنگزیب جیسے شہنشاہ اپنے ہاتھ سے قرآنِ کریم کی کتابت کر کے اپنی سادگی اور دیانت کا نمونہ تو پیش کر رہے تھے مگر عوام الناس کو سائنسی ایجادات سے بے بہرہ رکھ کر ان کی پسماندگی اور افلاس و جہالت میں اضافہ کر کے یورپین اقوام کے ہاتھوں ان کی غلامی کی راہ ہموار کر رہے تھے۔ ترقی پسند تحریک تو حضرت آدمؑ سے شروع ہوئی اور اسلام اس کی راہ کا ایک بڑا سنگِ میل تھا، یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ بقول اقبال

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز　　چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

ڈاکٹر عاصی کرنالی کا افسانہ ''گنجا'' پُر لطف بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ آپ کے تبصرے بھی عالمانہ اور بصیرت افروز ہیں خصوصاً مشکور حسین یاد کی کتاب، ''قرآن پاک میں حقیقتِ جنس'' بہت دلچسپ ہے جسے پڑھ کر غالب یاد آگئے

تھیں بنات النعش گردوں دن کے پردے میں نہاں　　شب کو انکے جی میں کیا آیا کہ عریاں ہوگئیں

مضطرا کبر آبادی کی نظم سماج، امین راحت چغتائی کی نظم، چراغوں کی ہوا سے ٹھن گئی ہے، مسلم شمیم کی نظم سقراط اور صابر عظیم آبادی کی رباعیات دلآویز ہیں۔ حسیر نوری کی آخری رباعی کے تیسرے مصرع میں لفظ، صرف سے وزن گر جاتا ہے، اگر اس کی جگہ ''اک'' کر دیا جائے تو درست ہو جائے گا۔

غزلیات میں رفیق عزیزی کی غزل کے پانچویں شعر کے دوسرے مصرعے میں ''مگر'' کی وجہ سے ابہام پیدا ہو گیا ہے، یہاں اگر اس کی بجائے ''فقط'' کر دیا جائے تو بات صاف ہو جائے گی، مندرجہ ذیل اشعار خصوصیت سے لائق ستائش ہیں۔

تھا اک خلا سا بیچ میں جو پُر نہ ہو سکا　　پورب سے بھی بچھڑ گئے پچھم نہیں ملا (اکبر حیدر آبادی)

غرورِ حسن بجا ہے مگر خیال رہے　　خزاں بھی آتی ہے گلشن میں ہر بہار کے بعد (ناصر زیدی)

جب چراغوں سے تیرگی پھیلے　　روشنی کی بڑی ضرورت ہے (ڈاکٹر مظہر حامد)

اب اس کو چہرہ تو کیا نام بھی نہ ہو گا یاد　　تمام شاعری ہم جس کے نام کرتے ہیں (منظور ہاشمی)

یہ دور وہ ہے کہ حق گوئی تو کجا دانش　　ولی ہیں آپ اگر مدحتِ ستم نہ کریں (عقیل دانش)

پڑے جو وقت تو ہم الجھنوں سے بچ جائیں　　کہ دوستوں کو مناسب ہے آزمارکھنا (سہیل اختر)

مرتضٰی برلاس۔ لاہور

''الاقرباء'' تسلسل سے مل رہا ہے اور ہر بار مجھے اپنی کوتاہی کا شدت سے احساس دلاتا رہتا ہے، بہر حال خوشی اس بات سے ہوتی ہے کہ آپ کی توجہ اس کو ''خوب سے خوب تر'' کی طرف لے جا رہی

ہے۔اللہ تعالیٰ آپ کی محنت کو مزید بار آور کرے۔آمین

آپ نے سالنامے کے لیے کچھ بھجوانے کا حکم دیا ہے، تعمیلاً دو غیر مطبوعہ غزلیں لف کر رہا ہوں۔قومی اور بین الاقوامی حالات کے تناظر میں پھیلے ہوئے ''کرب'' کا اظہار ہے۔

مجھے شعلۂ دل جلانے لگا تھا　　　غزل جب کہی ہے تو ٹھنڈا ہوا ہے　(برلاس)

اشاعت کے علاوہ اپنی رائے سے بھی نوازیئے کہ مجھے اپنی کاوش میں ایک تیقن کا احساس ہو۔

عبدالحمید اعظمی۔کراچی

فون پر آپ سے رابطہ کر کے دل کو اک گونہ اطمینان ہوا ورنہ اس سال کے آغاز سے رسالے کی عدم دستیابی نے طرح طرح کی تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ایک دھڑ کا سا لگا تھا کہ کہیں رسالے کی اشاعت کو کسی کی نظر تو نہیں کھا گئی۔ پھر ایک دن اچانک اکتوبر۔دسمبر ۲۰۰۷ء کا شمار نظر نواز ہوا تو گویا سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔آپ جیسے ہمہ تن خلوص صدیق صادق کی فرمائش کو رد کرنا، یا نظر انداز کرنا مجھ جیسے دیرینہ بلکہ بہت ہی دیرینہ نیاز مند کے بس کی بات نہیں۔اس لئے ایک مختصر سا مقالہ حاضر ہے۔ امید ہے تحریر نہ سہی مگر موضوع ضرور پسند آئے گا رسالہ بند نہ کیجئے گا ورنہ جو کچھ قلم بند کریں گے اسکا کیا بنے گا۔اسلام آبادی دوستوں کی آبادی کے لئے ہمیشہ دعا گو رہتا ہوں۔سب کو سلام پہنچا دیجئے گا۔

کرامت بخاری۔لاہور

''الاقرباء'' نظر نواز ہوا قرۃ العین پہ گوشہ اور ٹائیٹل بہت ہی بھلا محسوس ہوا۔برصغیر کا ایک بڑا نام اور ایک بڑا خاندان جس کی شہرت، عالمگیر اور کام اور مقام ادب کی دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔خدا کروٹ کروٹ جوارِ رحمت میں جگہ دے، ایسے لوگ اور ایسی ہستیاں روز روز نہیں ہوتیں۔

''الاقرباء'' ہمیشہ کی طرح وقیع، جامع اور موثر جریدہ ادب نظر آیا، تمام بڑے لکھنے والے آپ کے ہاں اکٹھے ہیں ایک کہکشاں روشن ہے۔اس دفعہ بھی مشکور یاد، حسن عسکری کاظمی، محشر زیدی، عاصی کرنالی، سید تابش الوری کی تخلیقات پسند آئیں۔مسلم شمیم صاحب کا ''سرسید اور خرد افروزی کی تحریک' ایک اچھا مضمون ہے۔سرسید احمد خان نہ ہوتے تو علی گڑھ تحریک نہ ہوتی اور اگر علی گڑھ تحریک نہ ہوتی تو

پاکستان نہ ہوتا، وہ ہمارے محسن ہیں۔

ڈاکٹر خیال امروہوی، صفدر جعفری، جعفر بلوچ اور سلمان رضوی صاحب کی تخلیقات پرچے کے دقار میں اضافہ ہیں، خدا کرے یہ چراغ جلتا رہے، خدائے واحد آپ کے نام، کام، کلام اور مقام میں اضافہ و برکت فرمائے۔

پروفیسر جعفر بلوچ۔ لاہور

میں آپ کا انتہائی شکر گزار ہوں کہ خط کتابت میں میرے تساہل کے باوجود آپ کی کرم فرمائی مسلسل جاری رہی ہے۔ میری ناچیز تصنیف ''بر سبیل سخن'' پر آپ نے نہایت محبت آمیز، حوصلہ افزا اور مفصل تبصرہ فرمایا۔ اس خصوصی حسنِ سلوک کے لئے میں سراپا سپاس ہوں۔ بہت عرصے کے بعد ایک غزل ہوئی ہے۔ میں اسے ''الاقرباء'' کیلئے بھیجنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔ اللہ کرے آپ کو پسند آئے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد میری بینائی بہت تیزی سے خراب ہونے لگی ہے۔ موتیا اور ذیابیطس نے مل کر یورش کر دی ہے۔ آپریشن کرانے کے لئے ہمت مجتمع کر رہا ہوں۔ دعا کا خواستگار ہوں۔ تمام معزز اراکین ادارہ کو سلام و دعا۔ حضرت توصیف تبسم صاحب کو خدمت میں آداب۔

غالب عرفان۔ کراچی

میری خواہش پر آپ نے ''الاقرباء'' کا تازہ شمارہ مجھے ارسال فرما کر جو کرم فرمایا ہے اس کا تہہِ دل سے شکر گزار ہوں۔ تازہ شمارہ، نہ صرف یہ کہ علمی، تحقیقی اور ادبی نگارشات سے مزین ہے۔ ''ادب اور اظہار رائے کی آزادی'' میں جن نکات پر بحث کی گئی ہے انہیں میں ''الاقرباء'' کے منشور کے نکات کہوں تو شاید بے جا نہیں۔ تاریخ عالم میں خطبۂ عرفات سے مراد حضورؐ کا آخری خطبۂ حج ہے۔ بے لگام فکری آزادی کے ابلاغ نے آج ملک میں موجود ساٹھ سے زائد ٹی وی چینلوں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے، ہمیں آج کے تجارتی معاشرے نے صرف تیز سے تیز دوڑنے کا درس دیا ہے کہیں ٹھہر کر سانس لینا او پیچھے مڑ کر دیکھنا تو اب ماضی کا قصہ پارینہ بن چکا ہے۔ آپ کے اس اداریئے کو میں بروقت

اور لائق تحسین سمجھتا ہوں۔ ڈاکٹر پروفیسر عاصی کرنالی جنھوں نے ''نعت'' میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے ان کی تحریر ''حمد نگاری اور نعت نگاری کے روایتی عمل میں نئے ممکنات کا عہد'' نہ صرف ایک تحقیقی بلکہ نہایت اہم مقالہ ہے اسی طرح ''دائرہ رموز الٰہی راجا نور احمد عبدالمومن ماہر کی ایسی تحریر ہے جو تحقیقی بھی ہے اور احساسِ عبدیت سے مملو بھی۔ اس مضمون نے میری معلومات میں اضافہ کیا ہے۔

ڈاکٹر عطش درانی۔ اسلام آباد

''الاقربا'' کا قرۃ العین حیدر نمبر ملا۔ آپ جس تسلسل اور خوب سے خوب تر کے انداز میں یہ رسالہ نکال رہے ہیں، وہ قابل تحسین ہے۔ اس میں چھپنا میری تحریروں کے لیے اعزاز اور تفاخر کی بات ہے۔ جیسے ہی کچھ ہوا، نذر کروں گا۔ قرۃ العین کے حوالے سے یہ تحریریں ان کے ادبی مطالعے کے لیے یقیناً ایک عمدہ حوالہ ثابت ہوں گی۔ خاص طور پر ان کی تاریخی بصیرت کا تجزیہ کرنے میں خاصی مدد ملے گی۔ شاہد کامران کے مضمون / تبصرے پر اختر صاحب کا جوابی تبصرہ ایک عمدہ نئی روایت کو جنم دے گا۔ اسے جاری رکھیے۔ جواب در جواب مضامین کے سلسلے تو عرصہ ہوا مفقود ہو چکے ہیں۔ مجھے تو اب یہی شکایت ہے کہ اردو میں جو چاہے لکھ ڈالو، کوئی گرفت نہیں، کوئی تنقید نہیں، کوئی اصلاح نہیں، ہر لکھنے والا اپنی جگہ ''مستند'' ہوتا جا رہا ہے۔ یہ زباں و ادب کے زوال کی پہلی نشانی / علامت ہوتی ہے۔ اختلاف رائے کا حوصلہ تو خیر پوری قوم کے باطن سے عنقا ہو گیا علمی اختلاف جو لازمی ہوتا ہے، وہ بھی مفقود ہو رہا تھا۔ اس لیے میں اس استحسان پر مجبور ہوا ہوں۔

ناصر زیدی۔ لاہور

''الاقرباء'' کے ذریعے ایک بار پھر آپ سے ذہنی و قلبی قربتوں کا اعادہ ہوا۔ ممنون ہوں! سال ہا سال سے خوشگوار تعلقات خاطر میں نا جانے کیوں اور کیسے گرہ لگ گئی تھی کہ مدتوں آپ کے معیاری ادبی جریدے کے دیدار سے بھی محروم رہا۔ اب تک آپ کے التفات خاص کے طفیل جو دو چار شمارے دستیاب ہو سکے ان سے آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کا ادراک ہوا آپ کی متعدد تصنیفات و تالیفات

کے ذریعے آپ کی علمی وادبی وشعری اور تحقیقی وتنقیدی کاوشوں سے تو باخبر تھا ہی!

ماضی بعید میں مسلسل پندرہ برس تک ''ادب لطیف'' لاہور کی ادارت کے ذریعے مجھے اس راہِ پُر خار کی کٹھنائیوں کا بخوبی اندازہ ہے۔ آپ نے اعلیٰ سرکاری عہدے سے ریٹائرمنٹ کے بعد بڑی والہانہ لگن اور عزم واستقامت کے ساتھ ادارت کے کارِ منصبی کو خوب نبھایا ہے۔ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔

نقوش، فنون، سیپ، سویرا، اوراق، افکار اور نئی قدریں جیسے موقر ادبی رسائل کی عدم اشاعت یا بعض کی ''حسب منشا'' اشاعت نے باذوق قارئین ادب کو جس پیاس میں مبتلا کیا، اس کو بجھانے کیلئے آپ کے عملی اقدام کو خوش آئند ہی قرار دیا جانا چاہیے!

سب سے پہلے میں نے پوری توجہ اور خصوصی دلچسپی کے ساتھ اداریہ پڑھا کہ اداریہ ہی کسی مدیر کا اصل چہرہ ہوتا ہے۔ آپ کا اداریہ اردو، ناول وافسانے کی ''لیجنڈ'' قرۃ العین حیدر پر ایک جامع مضمون لگا، تاہم ایک دو واقعاتی تسامح کی نشاندہی ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ نے لکھا ہے:

''بچوں کے رسالے ''پھول'' میں قرۃ العین حیدر کا پہلا افسانہ ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا''۔

''گوشۂ قرۃ العین حیدر'' میں ڈاکٹر غلام شبیر رانا کے مضمون میں بھی یہی فقرہ جوں کا توں موجود ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بچوں کے لئے عینی کی پہلی کہانی ہوگی، پہلا افسانہ تو رسالہ ''ادیب'' کی اشاعت نومبر ۱۹۴۳ء میں ''ایک شام'' کے عنوان سے چھپا تھا۔ اس وقت قرۃ العین حیدر کی عمر سولہ سترہ برس تھی یہ افسانہ ''لالہ رخ'' کے فرضی قلمی نام سے شائع ہوا تھا۔ افسانے میں اکثر ترقی پسند شاعروں، ادیبوں کے نام اور حلیے کو بگاڑ کر مضحکہ اڑایا گیا تھا۔ مثلاً علی سردار جعفری کو ''علی جرار صابری''........ ''سلام مچھلی شہری کو'' ''پیام مرغی شہری'' اور مشہور زمانہ کتاب ''انگارے'' کے مصنفین کو آتشیں کتاب ''شرارے'' کے مصنفین لکھا گیا تھا۔ یہی نہیں، ایک اعتبار سے سارا افسانہ ہی مصنفہ کے خیال میں گردن زدنی تھا۔ قرۃ العین حیدر کے افسانوں کے کلیات ''آئینۂ جہاں'' جلد چہارم میں جو نوٹ دیا گیا، وہ یوں ہے:

''یہ قرۃ العین حیدر کا اولین افسانہ ہے۔ اسی افسانے کے ذریعے عینی بچوں کی دنیا سے نکل کر بڑوں کی دنیا میں داخل ہوئیں۔ یہ افسانہ عینی نے اپنے فرضی نام ''لالہ رُخ'' سے چھپوایا تھا تاکہ لوگوں کو

ہضم کرنے میں آسانی ہو اور لوگ یہ نہ سمجھیں کہ "ایں قدر" نے لکھا ہے......"!

حصہ نظم و غزل میں جناب رفیق عزیزی کی غزل کا ایک شعر ہے:

جو حال ہے میرا وہ کبھی دیکھتے آ کر   جو بات سنی آپ نے اوروں سے سنی ہے

شعر پڑھ کر ذہن، چراغ حسن حسرت کے اس مشہور زمانہ شعر کی طرف گیا:

غیروں سے کہا تم نے، غیروں سے سنا تم نے   کچھ ہم سے کہا ہوتا، کچھ ہم سے سنا ہوتا

سلمان رضوی کی غزل کا مقطع ہے:

جہاں سکون ہو وہ گھر ملے گا کب سلمان   تمام عمر یہی انتظار کرتے رہے

اس شعر کو پڑھ کر افتخار عارف کے ایک مشہور مطلع کی طرف دھیان گیا:

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کردے!   میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کردے

ڈاکٹر مظہر حامد کی غزل کا مقطع ہے:

وصل ہو یا فراق ہو مظہر!   یہ بھی حسرت ہے، وہ بھی حسرت ہے

اس شعر سے ذہن فوراً اکبر الٰہ آبادی کے ایک بہت مشہور مقطع کی طرف گیا:

وصل ہو یا فراق ہو اکبر!   جاگنا ساری رات مشکل ہے

صابر عظیم آبادی کی ایک غزل کا مقطع ہے:

اس شہر بے چراغ میں صابر کوئی چراغ   پاگل ہوا کے رخ پہ جلایا نہ جا سکا

یہ مقطع پڑھ کر ناصر کاظمی مرحوم کی غزل کا ایک خوبصورت شعر یاد آیا:

اس شہر بے چراغ میں جائے گی تو کہاں؟   آ اے شب فراق تجھے گھر ہی لے چلیں

عقیل دانش (لندن) کا ایک شعر ہے:

اس انقلاب گردش دوراں نے دیکھئے   اجسام کیسے، کیسی قباؤں میں رکھ دیئے

مجھے اپنا ایک بہت پرانا شعر یاد آیا:

یہ انقلاب گردش دوراں تو دیکھئے   جو لوگ کامیاب تھے، ناکام ہو گئے

متذکرہ اشعار میں در آنے والے، پہلے سے موجود اشعار کے عکس کے تذکرے سے قطع نظر (۱) کچھ شعر جو، مجھے پسند آئے:

پیار خوشبو ہے تعصب سے نہ برباد کریں! اس سے تہذیب کا بے ساختہ پن کھلتا ہے (خیال امروہوی)

اسے پسند نہیں خواب کا حوالہ بھی تو ہم بھی آنکھ پہ نیندیں حرام کرتے ہیں (منظور ہاشمی۔ علی گڑھ)

یہ شہر حرص و آز ہے، یہاں بزور فکر و فن پنپ سکا ہے کب کوئی عداوتوں کے درمیاں (منظر ایوبی)

معرفت میری نہ تھی میرے طرفداروں کو مجھ کو لڑنے پہ ابھارا تو میں خاموش رہا (صفدر حسین جعفری)

کتابوں پر تبصرے نہایت عمدہ اور جامع ہیں، لگتا ہے محض سونگھ کر نہیں واقعی کتابیں پڑھ کر کئے گئے ہیں۔ مشکور حسین یاد کی کتاب "قرآن پاک میں حقیقت جنس" پر تبصرہ کرتے ہوئے آپ نے فراق گورکھپوری کا ایک شعر اس طرح لکھا ہے:

تم مخاطب بھی ہو قریب بھی ہو تم کو دیکھوں کہ تم سے بات کروں؟

مروجہ مشہور شکل میں واقعی اسی طرح ہے البتہ یاد صاحب نے دوسرا مصرعہ جس طرح لکھا ہے، وہ صحیح نہیں، یعنی: تم کو دیکھوں کہ تم سے پیار کروں؟

۱۔ فاضل مراسلہ نگار صاحب مطالعہ شاعر ہیں جن سے ہمیں ایک مدت سے شرف تعارف حاصل ہے۔ شعراء کے ہاں اشعار میں مضامین کی تکرار یا توارد خصوصاً اردو شاعری کی تاریخ میں ایک نمایاں عنصر ہے اور وہ اس طرح کہ مضمون آفرینی جہاں ایک تخلیقی عمل ہے وہیں اُسلوب کا حسن تخلیقی بھی ہے اور شاعر کے انداز فکر کا غماز بھی جس کا ثبوت میر، داغ اور جگر کے درج ذیل اشعار سے ملتا ہے جو سوئے ظن نہیں بلکہ حسن ظن کے متقاضی ہیں:

وہ آئے بزم میں اتنا تو ہم نے دیکھا میر پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی (میر)

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے (داغ)

کمال حسن کا اپنے دکھا دیا تو نے چراغ سامنے رکھ کر بجھا دیا تو نے (جگر)

تینوں اشعار میں چراغ یا شمع سے حسن یار کی تمثیلی نسبت قدر مشترک ہے جبکہ اقبال اور حسرت کے یہاں توارد لفظی کی مثال بھی ملتی ہے

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں (اقبال)

وفا تجھ سے اے بے وفا چاہتا ہوں مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں (حسرت)

(ادارہ)

مگر دراصل ان دونوں صورتوں سے ہٹ کر مطبوعہ شکل میں یہ شعر بالکل درست اس طرح ہے:

تم مخاطب ہو سامنے بھی ہو تم کو دیکھوں کہ تم سے بات کروں

اگرچہ پہلا مصرعہ مروجہ تحریف شدہ شکل ہی میں اچھا لگتا ہے مگر حضرت رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری نے خود جس طرح لکھا وہ یہی شکل ہے، جو میں نے لکھی کہ فراق صاحب کا ایک مجموعہ جو میرے پاس محفوظ ہے اس میں یہی شکل ہے۔

ڈاکٹر شاہد اقبال کامران کے اس ارشاد سے ثناء اللہ اختر کا اختلاف درست ہوسکتا ہے۔ کامران صاحب نے لکھا ہے کہ: ''یہ امر محققہ ہے کہ علامہ مشرقی سرکار کے نہایت محبوب ملازم تھے''۔

مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا کہ میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کا طالب علم تھا اور حسب معمول ماڈل ٹاؤن بس سے، کالج کیلئے میو ہسپتال کے آخری اسٹاپ تک جارہا تھا کہ علامہ مشرقی نہایت سادہ گیروے رنگ کے مخصوص خاکساری لباس میں اچھرہ سے اسی بس میں سوار ہوئے، رش کی وجہ سے بیٹھنے کو جگہ نہ تھی وہ بس کا راڈ پکڑ کر کھڑے ہوگئے۔ انہیں پہچان کر فرط حیرت سے مجھے اور کچھ نہ سوجھا تو میں نے چپکے سے کنڈکٹر سے ان کا ٹکٹ خرید لیا جب کنڈکٹر ان تک پہنچا تو انہوں نے ٹکٹ لینا چاہا، کنڈکٹر نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''آپ کا ٹکٹ ہوگیا ہے''...... علامہ مشرقی نے مڑ کر مجھے اس نظر سے دیکھا، جیسے انہیں میری یہ جسارت ہرگز پسند نہیں آئی۔ انہوں نے ٹکٹ کے دو آنے بصد اصرار مجھے واپس کیئے اور ریگل بس اسٹاپ پر اتر گئے۔!!!

بحیثیت مجموعی آپ کا رسالہ ''الاقرباء'' نہایت معیاری ہے، مضامین نظم ونثر اچھے ہیں لیکن ایک خامی جو حد سے زیادہ کھٹکتی ہے وہ ہے پروف ریڈنگ کا نہ ہونا یا مکمل توجہ سے نہ ہونا۔ اس شعبے کی طرف ہنگامی بلکہ انقلابی توجہ کی ضرورت ہے......!

پروفیسر آفاق صدیقی۔ کراچی

ممنونِ کرم بلکہ سراپا سپاس ہوں کہ ''الاقرباء'' کا ہر شمارہ آپ عطا فرماتے ہیں اور مجھ سے کہیں زیادہ وہ احباب اور شاگردان عزیز فیضیاب ہوتے ہیں جو بڑے ذوق وشوق سے مطالعہ ادب کو اپنی ذہنی

تربیت کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔رشک آتا ہے، ''الاقرباء'' کے ان قدردانوں پر جن کے بھرپور مراسلے شامل اشاعت ہوتے ہیں، رہا شعری اور نثری ادب کی دلکشی کا مسئلہ تو اس سلسلے میں فی الوقت ایک ہی بات اور وہ یہ کہ متعدد تحقیقی وتنقیدی مقالات ان طلبہ کے لیے کارآمد ثابت ہو رہے ہیں جو ایم اے اردو کے مقالہ تحریر کریں یا ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح کے تحقیقی کاموں میں مصروف ہوں، مثلاً ایک بیٹی جو محترمہ قرۃ العین حیدر کی شخصیت اور فن پر مقالہ لکھنے میں مصروف ہے اس نے تازہ شمارہ (اکتوبر، دسمبر ۲۰۰۷ء) دیکھا تو دل باغ باغ ہوگیا۔

عینی آپا واقعی اپنی مثال آپ تھیں، مجھ سے دو سال بڑی اور بڑے پیار سے 'بیرن' کہنے والی قیام پاکستان سے پہلے میں نے لکھنؤ کی ایک ادبی نشست میں دیکھا اور سنا تھا پھر دید وشنید کی سعادت کئی مرتبہ حاصل ہوئی۔ اداریہ نظر نواز ہوا تو آئینہ خانہ تصور میں نقوشِ ماضی کچھ اس طرح ابھرے کہ آنکھیں بھیگنے لگیں۔ ڈاکٹر صبیحہ صبا (نیویارک) کی نظم بھی بڑی پُرتاثیر ہے، ڈاکٹر غلام شبیر کا مضمون لائق تحسین ہے لیکن کراچی اور سرکاری ملازمت کو خیرباد کہنے کا سبب میری دانست میں وہ نہیں جو ڈاکٹر صاحب نے بیان فرمایا ہے۔ کوشش کروں گا کہ ''الاقرباء'' کے لیے ایک مضمون دید وشنید کے حوالے سے لکھ سکوں۔ مجبوری یہ ہے کہ پچھلے کئی مہینوں سے کچھ ایسی عدیم الفرصتی کے حصار میں ہوں کہ معاذ اللہ......کیسی عدیم الفرصتی اور کیوں؟ ان سوالوں کا جواب ''الاقرباء'' کی اگلی اشاعت کے لیے ایک غیر مطبوعہ مضمون اور کچھ منظوم تراجم کی صورت میں پیش کر رہا ہوں جو شاہ جو رسالو کے مختلف سروں (ابواب) سے تعلق رکھتے ہیں اور کسی جریدے میں ان کی اشاعت نہیں ہوئی، بالکل تازہ ہیں۔ کارسازِ حقیقی آپ اور آپ کے رفقائے کار کو سلامت باکرامت رکھے۔

ڈاکٹر شفیق انجم۔ اسلام آباد

سہ ماہی 'الاقرباء' کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ میری کتاب جائزے پر نعیم فاطمہ علوی نے تبصرہ کیا ہے۔ بہت عمدہ ہے، پسند آیا۔ میں آپ کا اور محترمہ کا شکر گزار ہوں۔ اللہ آپ کے علم وعمر میں برکت عطا فرمائے۔ آمین

چند ماہ پہلے میں نے ایک مقالہ بھی اشاعت کے لیے بھیجا تھا۔ای میل بھی کر دیا ہے۔مناسب معلوم ہو تو آئندہ شمارے میں شامل فرما لیجئے۔غیر مطبوعہ ہے اور میں نے ابھی تک کسی دوسرے رسالے کو نہیں بھیجا۔

سید حبیب اللہ بخاری۔بہاولپور

مجلہ ''الاقرباء'' اکتوبر۔دسمبر ۲۰۰۷ء موصول ہوا۔توجہ کا شکریہ! قرۃ العین حیدر کی ادبی خدمات کو بہترین انداز میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔مرحومہ نے قابلِ ستائش انداز میں اپنی صلاحیتوں کو قلم و قرطاس کی زینت بنایا اور ہمارے لئے علمی و ادبی سرمایہ چھوڑ گئیں۔اس دارِ فنا میں یہی کاوش انسان کی دائمی بقا کا ثبوت ہے۔ڈاکٹر محمد معز الدین کا مقالہ ''پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی کی شاعری اور اس کا پس منظر'' ان کی بھر پور تحقیق کا مظہر ہے۔سید انتخاب علی کمال نے بڑے خوبصورت انداز میں سید انوری علی شاد کی صلاحیتوں کو ''بحیثیت عظیم تاریخ گو'' اجاگر کیا ہے۔

ڈاکٹر صبیحہ صبا (نیویارک) کی نظم ''آہ! قرۃ العین حیدر......'' اُن کے قلبی تاثرات کی ترجمان ہے اور بلاشبہ ایک بہترین خراجِ عقیدت ہے۔ڈاکٹر غلام شبیر رانا کا مضمون اعلیٰ تحقیق اور ادبی کاوش ہے۔ سیّد تابش الوری کی نعت اور اختر علی خاں اختر چھتاروی کی منقبت بوترابؓ (فارسی) خوبصورت ہیں۔سید مشکور حسین یادؔ کی کتاب ''قرآن پاک میں حقیقت جنس'' پر آپ کا تبصرہ بڑا محتاط اظہارِ حقیقت ہے۔

صابر عظیم آبادی۔کراچی

الاقرباء کا تازہ شمارہ اکتوبر تا دسمبر موصول ہوا۔قرۃ العین حیدر کی تصویر سے سرورق کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔تمام نگارشات قابل توجہ اور قابل مطالعہ ہیں۔خصوصاً ڈاکٹر معز الدین، ڈاکٹر شاہد کامران اور مسلم شمیم صاحب کے مضامین بہت جامع ہیں اور شہلا احمد کا خاکہ ''شہید کا وعدہ'' مجھے بے حد پسند آیا۔حمد و نعت اور غزل و نظم کا حصّہ بھی بڑا جاندار ہے۔

آئندہ اشاعت کے لئے ایک غزل ایک نظم اور چند رباعیات ارسال خدمت ہیں۔امید ہے پسند فرمائیں گے۔

شاکر کنڈان۔ سرگودھا

آپ کی محبتوں کا ممنون ہوں۔ ''الاقرباء'' باقاعدگی سے مل رہا ہے لیکن میں خود بے قاعدہ ہوں۔ الاقرباء کا مطالعہ ذہن کے بہت سے در وا کرتا ہے اور بہت سی معلومات سے مستفید۔

آکسفورڈ سے خالد یوسف صاحب نے ''نعت گویانِ سرگودھا'' میں شامل نہ ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ میرے علم میں ہیں۔ نعت گویانِ سرگودھا کا دوسرا حصہ انشاءاللہ ضرور منظر پر آئے گا۔ میں کام کر رہا ہوں۔ آپ کی وساطت سے عرض ہے کہ اگر وہ اپنی نعتیں اور تعارف بھجوا دیں تو ممنون ہوں گا، مزید یہ کہ میں نے جو تعارف ان کا لکھا ہے اس میں بھی خوب صورتی پیدا ہو جائے گی۔

سید صفدر حسین جعفری۔ اسلام آباد

شمارہ اکتوبر۔ دسمبر میں میری غزل کا ایک شعر بدل گیا ہے، شعر یوں تھا۔

تھا سماعت پہ مری ایسا گراں شورِ خزاں مجھ کو اس گل نے پکارا تو میں خاموش رہا

پہلا مصرعہ یوں چھپ گیا ہے۔ یوں سماعت پہ مسلط تھا میری شورِ خزاں

محمود رحیم۔ اسلام آباد

''الاقرباء'' کا شمارہ برائے اکتوبر، دسمبر ۲۰۰۷ء موصول ہوا۔ جریدہ باقاعدگی سے موصول ہو رہا ہے اور میں اس کرم فرمائی پر بے حد ممنون ہوں۔ مذکورہ شمارے میں قرۃ العین حیدر کی وفات پر آپ کے لکھے ہوئے اداریے، ڈاکٹر صبیحہ صبا کی پرتاثیر مرثیہ نظم ''آہ۔ قرۃ العین حیدر'' اور ڈاکٹر غلام شبیر رانا کے مضمون ''قرۃ العین حیدر...... خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں'' نے اسے ایک قیمتی دستاویز کی حیثیت دے دی ہے۔ ڈاکٹر مظہر حامد کا مضمون ''ترقی پسند تحریک...... نئے سماج کی تعمیر میں اہم کردار'' نئے لکھنے والوں کو اس تحریک سے متعارف کرانے میں اہم ہے۔ نوید ظفر تاریخ کے جھروکوں سے جھانکتے ہوئے وطن کے مختلف شہروں کا جس انداز سے ذکر کرتے ہیں، وہ یقیناً قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہے اور یہ سلسلہ گویا تاریخ کا مطالعہ بھی بنتا چلا جاتا ہے۔ خیال آفاقی کی حمد، توصیف تبسم، سیّد تابش الوری

اور احتشام ادیب کی نعتیں عقیدت اور محنت سے لکھی گئی ہیں اور پڑھنے والے کو سرشار کرتی ہیں۔

مشکور حسین یاد کی غزل ''اپنے سے بیگانہ ہو جاتے ہیں ہم''، صفدر جعفری کی غزل ''اب کے ساون نے پکارا تو میں خاموش رہا''، کرامت بخاری کی غزل ''جب مہکتا ہے زخمِ بینائی'' اور عقیل دانش کی غزل ''کتنے سوال سب کی نگاہوں میں رکھ دیئے'' بحر اور خیال کی تازگی اور ہنر مندانہ بُنت کے سبب توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہی ہیں۔

اچھی نظم کا کال ہے۔ لوگوں نے چند مصرعوں کی ترتیب کا نام نظم رکھا ہوا ہے۔ نظم کے آہنگ، تخیل کے ترفع اور اسلوب کی تازہ کاری سے کماحقہٗ آشنا نہ ہونے کے باعث کمزور نظمیں زیادہ لکھی جارہی ہیں۔ موجودہ شمارے میں احتشام ادیب کی نظم ''ہم اَب'' قابلِ مطالعہ نظم ہے۔

تبصروں میں ڈاکٹر شیر محمد زمان چشتی کی کتاب ''نقوشِ سیرت'' امین راحت چغتائی کے نعتیہ مجموعے ''محرابِ توحید'' اور سید مشکور حسین یاد کی کتاب ''قرآنِ پاک میں حقیقتِ جنس'' پر لکھے گئے آپ کے تبصرے قاری کو ان کتابوں سے صحیح تناظر میں متعارف کراتے ہیں۔ میں نے آپ کے اداریے اور تبصرے ہمیشہ شوق سے پڑھے ہیں اور یقیناً حظ کشید کیا ہے۔ آپ کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ کا شکوہ او علو، ان کی مناسب ترین دروبست اور موضوع پر گرفت آپ کی تحریروں کو معلومات افزاء اور قابلِ مطالعہ بناتے ہیں۔

سہ ماہی الاقرباء کی ویب سائٹ کا اجراء

ہم مسرت کے ساتھ یہ اعلان کر رہے ہیں کہ سہ ماہی الاقرباء کی ویب سائٹ کا اجراء کیا جاچکا ہے۔ قارئینِ کرام انٹرنیٹ کے ذریعہ اس سہولت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ (ادارہ)

www.alaqreba.com

خبرنامہ

الاقرباء فاؤنڈیشن

(اراکین کیلیے)

مرتبہ شہلا احمد

احوال و کوائف

شادی خانہ آبادی:

الاقرباء فاؤنڈیشن کی مجلسِ عاملہ کے رکن جناب سید حسن سجاد و بیگم عالیہ سجاد کے بڑے صاجزادے عزیزی سید محمد محسن حسن الحمدللہ مورخہ ۲۶، دسمبر ۲۰۰۷ء بروز بدھ شادی کے مبارک بندھن میں بندھ گئے۔ ان کی شریک حیات عزیزہ فریحہ جناب و بیگم طاہر سعید کی صاجزادی ہیں۔ انہوں نے ACCA کیا ہے اور آج کل چارٹرڈ اکاؤنٹینسی (Chartered Accountancy) میں تعلیم دے رہی ہیں۔ عزیزی محمد محسن حسن کمپیوٹر سوفٹ ویئر انجینئر ہیں۔ اور کینیڈا میں ''الیکٹرونکس آرٹ'' میں فرائضِ منصبی انجام دے رہے ہیں۔ ولیمہ کی پروقار تقریب کا اہتمام پی۔ اے۔ ایف گالف کلب اسلام آباد میں کیا گیا تھا۔ جس میں حسن سجاد صاحب و بیگم عالیہ حسن صاحبہ کے عزیز واقارب، احباب اور الاقرباء فاؤنڈیشن کی مجلس عاملہ کے اراکین مدعو تھے جن کی تواضع کا پرتکلف اہتمام تھا۔ اس مبارک وخوبصورت موقع پر ادارہ سہ ماہی الاقرباء جناب و بیگم حسن سجاد اور اہل خانہ کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ زندگی کے اس حسین سفر میں عزیزی محسن حسن و فریحہ دلہن کو سدا خوش وخرم رکھے۔ آمین

فرحان منصور کا لاہور تبادلہ:

صدر الاقرباء فاؤنڈیشن محترم سید منصور عاقل و بیگم ناہید منصور صاحبہ کے صاجزادے سید فرحان منصور جو عسکری بنک اسلام آباد میں بحیثیت آپریشنز مینجر فرائض منصبی انجام دے رہے تھے، تبادلہ کے بعد لاہور میں عسکری بینک کے ڈیفنس آفس میں انہوں نے شہر کی تینوں برانچوں کے آپریشنز سربراہ کی حیثیت سے چارج سنبھال لیا ہے۔ ادارہ اُنکی کامیابی کے لئے دعا گو ہے۔

معزالدین صابری کو دلی تہنیت:

عزیزی معزالدین صابری الاقرباء فاؤنڈیشن کی مجلسِ منتظمہ کے رکن جناب جی۔ اے۔

صابری و بیگم ماریہ صابری کے ہونہار صاحبزادے ہیں۔ انہوں نے گذشتہ دنوں میلان یونیورسٹی اٹلی سے Energy and Environmental Economics میں ماسٹرز کیا ہے۔ آجکل وہ اپنے شعبہ ہی سے متعلق اٹلی کے ایک ادارے میں اعلیٰ عہدہ پر فرائض منصبی انجام دے رہے ہیں۔ ادارہ سہ ماہی الاقرباء ان کو اور جناب و بیگم صابری کو ان کی کامیابی پر ہدیۂ تہنیت پیش کرتا ہے۔

سیدہ سدرہ سالاری کی ایک اور کامیابی:

رکنِ مجلس منتظمہ الاقرباء فاؤنڈیشن جناب سید ظفر اللہ سالاری و بیگم نیرّ سالاری کی ہونہار صاحبزادی عزیزہ سدرہ سالاری نے F.Sc انٹرمیڈیٹ کا امتحان ماشاء اللہ گریڈ +A میں 86.7 فیصد نمبروں کے ساتھ پاس کرلیا ہے۔ آجکل وہ راولپنڈی میڈیکل کالج میں زیرِ تعلیم ہیں۔ ادارہ آئندہ بھی ان کی کامیابیوں کیلئے دعاگو ہے۔

سانحاتِ رحلت پر دعائے مغفرت:

مجلس انتظامیہ کے دو ماہانہ اجلاسوں میں، جو جناب سید محمد حسن زیدی اور محترم سید ممتاز اللہ سالاری کی رہائشگاہوں پر منعقد ہوئے درجِ ذیل حضرات کیلئے فاتحہ خوانی اور دعائے مغفرت کی گئی۔

عزیزہ سارہ سلمان کے حقیقی ماموں جو محترمہ شہلا حسن زیدی کے کزن بھی تھے گذشتہ دنوں رحلت فرما گئے۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔ مرحوم سید عابد علی واسطی کو مذہب سے گہرا لگاؤ تھا۔ ان کے دو بچے قرآن پاک حفظ کررہے ہیں۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ پانچ بچے ہیں۔

شہلا حسن زیدی صاحبہ کے ایک اور کزن سید آصف علی (حقیقی پھوپھی زاد بھائی) کراچی میں ایک شقی القلب کی درندگی کا شکار ہوگئے۔ وہ صبح آفس جانے کیلئے گھر سے نکلے اسکوٹر سوار لڑکوں نے ان کے اسکوٹر کو زبردستی روک لیا اور ان سے موبائل فون و نقدی چھیننے کی کوشش کی۔ مزاحمت پر ان درندوں نے ان کے سر میں گولی ماردی اور فرار ہوگئے۔ گولی جاں لیوا ثابت ہوئی اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہوگئے۔ پسماندگان میں ان کی بیوہ کے علاوہ چار بچے شامل ہیں۔

محترم سید ممتاز اللہ سالاری سینئر نائب صدر الاقرباء فاؤنڈیشن کے برادر نسبتی جناب سید مصداق

حسین مورخہ ۱۳، دسمبر ۲۰۰۷ء کو انتقال کر گئے۔ آپ ڈینٹل سرجن تھے اور ۲۵ سال سے نیویارک (امریکہ) میں رہائش پذیر تھے۔ پسماندگان میں انہوں نے دو صاحبزادے چھوڑے ہیں۔ ایک صاحبزادے میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں جبکہ دوسرے MBA کر رہے ہیں۔ ادارہ سہ ماہی 'الاقربا' بھی مرحومین کی مغفرت کے لئے دعا گو ہے۔ اللہ تعالیٰ پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

بیگم حسن سجاد صاحبہ ممبر مجلسِ انتظامیہ کی چھوٹی ہمشیرہ کے شریک حیات سید محمد ظفر جو بیگم حسن صاحبہ کے خالہ زاد بھی تھے گذشتہ ماہ دماغ کی شریان پھٹ جانے کے باعث انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم طویل عرصہ سے امریکہ میں رہائش پذیر تھے اور اپنا پرائیویٹ بزنس کر رہے تھے۔ مذہب سے گہرا لگاؤ تھا۔ حافظِ قرآن و تہجد گذار تھے۔ نہایت نیک، ملنسار اور ہمدرد تھے۔ فلاحی کاموں سے دلچسپی تھی۔ امریکہ میں فلاحی ادارہ چلا رہے تھے۔ چار پانچ ماہ پہلے ہی پاکستان آئے تھے۔ یہاں ایکسپورٹ کا بزنس شروع کرنے والے تھے لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور اکیاون (۵۱) سال کی عمر میں خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو صاحبزادے اور ایک صاحبزادی ہیں۔ جو زیرِ تعلیم ہیں۔ ایک صاحبزادے حافظِ قرآن ہیں۔

ادارہ سہ ماہی الاقرباء مرحومین کی مغفرت کے لئے دعا گو ہے۔ اللہ تعالیٰ پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

نعیم فاطمہ علوی

مسلم حکمرانوں کا ثقافتی ورثہ۔۔۔ بھارت کا سیاحتی اثاثہ

ڈاکٹر ایوب علوی کی قیادت میں پاکستانی وفد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی دعوت پر نیشنل یونیورسٹی فاسٹ کے ڈین ڈاکٹر ایوب علوی کی زیر سرکردگی اکیاون طلباء اور سات فیکلٹی ارکان پر مشتمل گروپ بھارت کے تعلیمی دورے پر روانہ ہوا......اس پروگرام کی تیاری تو تقریباً ایک مہینے سے ہو رہی تھی مگر جس دن اس قافلے کو روانہ ہونا تھا محترمہ بے نظیر بھٹو کو قتل کر دیا گیا۔ان حالات میں یہ پروگرام خطرے میں پڑ گیا۔سارا ملک ہی شش و پنج، اضطراب اور بے چینی کی حالت میں تھا۔ بہر حال ایک دن کی تاخیر سے ڈاکٹر آفتاب اور یاسر بھٹی صاحب نہ صرف بسوں کا انتظام کرنے میں کامیاب ہو گئے بلکہ ڈیزل کے حصول کو بھی ممکن بنا لیا۔

رات کے اندھیرے لیکن موٹروے کی چکا چوند روشنی میں بسوں یہ قافلہ روانہ ہوا۔ دن کی روشنی میں واہگہ پہنچے، واہگہ سے باڈر کراس کیا۔ خار دار تاروں سے پنجاب کی تقسیم نے خیالوں، خوابوں اور رویوں کو ہی تبدیل کر دیا تھا۔ کچھ اور تو بدلا ہوا نظر نہ آیا۔ البتہ خدا جتنا مہربان ہم پر تھا، اتنا ہی سرحد پار بھی نظر آیا۔ لہلاتے کھیت رنگ برنگ پھولوں سے بھری دکانیں۔ یہ پیغام دے رہی تھیں۔ خدا پروردگار ہے اس کی کائنات قانون وضوابط کے ساتھ چلتی ہے۔ وہ میرا تیرا نہیں تمام نوع انسان کے لیے ہے......

واہگہ باڈر پر پاکستان کسٹم آفس کی بلڈنگ کو بنے چند ہفتے ہی گزرے تھے۔ لہٰذا چمکتی دمکتی ٹائلیں اور صاف شفاف باتھ روم مہمان نوازی اور میزبانی کے تمام فرائض ادا کرتے ہوئے نظر آئے......

اور جب ہم خاردار تاروں کے اس پار گئے تو ہمیں محسوس ہوا کہ منتظمین کہیں گہری نیند سو رہے ہیں۔ دیواروں پر اکھڑا ہوا پلستر سفیدی کو ترستی دیواریں...... بے لباس صوفے...... سرکار کی بے توجہی کا شکار لگ رہی تھیں...... یہاں ہمیں خاصا وقت لگا...... منتظمین نے خبر سنائی کہ یہاں سے ہم لوگ چونکہ بسوں کے ذریعے دھلی جا رہے ہیں۔ لہٰذا لمبے سفر کے لیے ذہنی طور پر تیار رہیں...... میں نے سوچا باتھ روم سے فارغ ہو کر ذہنی فراغت حاصل کر لینی چاہیے۔ باتھ روم کسٹم آفس کے ایک کونے میں تھا، ایک دروازہ چھوٹے سے لاونج میں کھلتا تھا۔ دروازے پر صرف باتھ روم کا نشان تھا...... دروازہ کھولا...... تو باتھ روم ڈیزائن کرنے اور بنانے والوں کا ماتم کرنے کو دل چاہا...... مین دروازہ کھولتے ہی جس جگہ نظر پڑی وہ دروازے کے بغیر کھلا علاقہ تھا دائیں بائیں دیکھا تو ایک دروازہ بائیں طرف نظر آیا...... یہ دروازہ بھی کنڈی سے بے نیاز تھا۔ اس کے اندر دو باتھ روم بنے ہوئے تھے۔ جہاں کسی نے...... شاید ساٹھ سال پہلے کموڈ نما کوئی چیز رکھی ہوگی۔ کموڈ کے بیشتر پرزہ جات زمانے کی شکست و ریخت کا شکار ہو چکے تھے۔ باتھ روم تو تھے...... مگر نہ وہاں پانی، نہ لوٹا...... نہ مسلم شاور اور نہ ہی ٹشو...... اور نہ صفائی......

اٹاری کی کچی گراونڈ میں دو بسیں ہماری منتظر تھیں، دو چار لوگ کرسی میز رکھے کرنسی کی ردو بدل کے لیے بیٹھے نظر آئے۔ پھلوں اور جوس وغیرہ کی دکانیں بھی نظر آئیں۔ اٹاری سے ہم تقریباً ایک بجے نکلے۔ سردار جی کی تیز رفتاری خاصی جان لیوا تھی۔ گائیڈ نے بتایا ہم لوگ جی ٹی روڈ سے دھلی کی طرف براستہ امرتسر جائیں گے۔ اس نے مزید بتایا یہ جی ٹی روڈ شیر شاہ سوری نے بنائی تھی...... سکھ کے منہ سے مسلمان لیڈر کا نام سن کر خوشی ہوئی...... اعترافِ حقیقت کے سوا کوئی چارہ نہ تھا...... جی ٹی روڈ پر سفر کرتے ہوئے میں ساٹھ سال پہلے اپنے بزرگوں کے اس سفر میں کھوگئی جو لٹے پٹے اپنے پیاروں کی قربانیاں دیتے بے یار و مددگار اسی راستے سے پاکستان داخل ہوئے تھے۔ میری نانی، دادی اور ساس اسی راستے پر ٹرکوں اور ریل گاڑیوں پر سفر کرتے ہوئے کیا کیا سوچتی ہونگی...... جی ٹی روڈ کا چپہ چپہ مجھے کہانیاں سنانے لگا، ان گنت کہانیاں......

اس سفر میں ہماری ذہنی اور جذباتی حالت ایسی ہرگز نہ تھی جیسی اپنے ملک سے نکل کر کسی بھی

ملک کے تفریحی دورے کے وقت ہوتی ہے، ہم تو ان طلسماتی کہانیوں کے دیس کو دیکھنے کے لیے مضطرب تھے جو بزرگوں نے ہمارے خمیر میں گوندھا تھا لہٰذا میں اس دیس کو بزرگوں کا خوابستان کہوں گی۔

امرتسر سے دھلی پہنچے تو کرول باغ کے رونق پیلس میں ٹھہرنے کا بندوبست تھا جو کسی سردار جی کا ہوٹل تھا۔ یہ ہوٹل گلیوں کے اندر رہائشی علاقے میں کئی گھروں کو اجاڑ کر بنایا گیا تھا۔ ہوٹل بہت واجبی سا تھا۔ باتھ روم بھی خستہ حال، رات بھر دھلی کے آوارہ کتے اپنی سمع خراش موسیقی سے دل بہلانے کی کوشش میں مصروف تھے، صبح اٹھے تو بتایا گیا ہوٹل کے پچھلی سائیڈ پر ناشتے کا انتظام ہے۔ گلی سے گزرے تو دو موٹے موٹے مرے ہوئے چوہوں کو پھلانگتے آگے بڑھے تو دو تین کتوں نے قدم بوسی کا شرف حاصل کرنا چاہا...... ان سے آنکھ مچولی کھیلتے ناشتے کے ہال میں داخل ہوئے تو خوشبو سے ہی دل بہلانے کو غنیمت جانا......

ہماری اگلی منزل علیگڑھ مسلم یونیورسٹی تھی، رونق پیلس سے نکلے دھلی کا سرسری جائزہ لیتے ٹوٹی پھوٹی...... زیرِ تعمیر سڑکوں پر ہندو ڈرائیوروں کے ساتھ آرام دہ بسوں میں سفر کوئی زیادہ تکلیف دہ نہ لگا۔ ہندو ڈرائیور بہت ہی آرام سے بسیں چلاتے ہیں۔ علوی صاحب نے ہندو ڈرائیوروں کی سست روی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ آئندہ آئے تو اپنے ڈرائیور بھی پاکستان سے ساتھ لائیں گے۔

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی نے ڈاکٹر ایوب علوی کی تقریر کا خاص انتظام کیا ہوا تھا۔ وی سی آفس کے باہر بینر لگائے ہوئے تھے۔ فوٹو گرافر اور پریس والے مدعو تھے۔ بہت سارے سٹوڈنٹ فیکلٹی ممبر منتظر تھے مگر ہم لوگ بوجوہ بروقت نہ پہنچ سکے۔ جس کا بہت افسوس ہوا۔ مگر ان لوگوں کی محبت کا اندازہ اسی سے لگایئے کہ انھوں نے اپنے باقی پروگرام جاری رکھے اور کسی بھی لمحے اس کا ہمیں احساس نہیں ہونے دیا۔ ہماری تاخیر میں باعث تاخیر چھبیس گھنٹے کا سفر سڑکوں کی ناگفتہ بہ حالت اور ڈرائیوروں کی سُست روی شامل تھی۔ علیگڑھ کے گیسٹ روم میں ڈاکٹر مسعود خالد، ایم ایس قدوائی، ذیشان احمد اور پروفیسر کلیم الدین احمد نے حق میزبانی ادا کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی...... یوں لگ رہا تھا ہم ساٹھ سال بعد اپنے بچھڑے ہوئے بھائیوں سے ملے ہیں۔ علیگڑھ کے منتظمین کو دیکھ کر مولوی عبدالحق کا وہ جملہ یاد آ گیا

''لوگ کہتے ہیں کہ سرسید نے کالج بنایا کالج نہیں اس نے قوم بنائی'' علیگڑھ کے ہر شخص میں وہی روح نظر آئی۔ علیگڑھ میں ہمارا استقبال بے مثال بھی اور یادگار بھی۔ ہمیں پوری یونیورسٹی دکھائی گئی۔ لائبریری کے تمام گوشے جن میں صدیوں پرانے نوادرات بھی شامل تھے دکھائے گئے...... یونیورسٹی کو دیکھتے ہوئے ہمارے ساتھ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ، منتظمین اور پریس کے لوگ تھے۔ ہمیں علیگڑھ کی لائبریری کا اثاثہ دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ یہاں انہوں نے بتایا ۳۷۰۰ اردو کی کتابیں ہیں، مجھے بھی اپنی کتاب ''عقیدتوں کا سفر'' (سفرنامہ حجاز) تحفتاً دینے کا شرف حاصل ہوا۔

نوادرات کی تصویر کھینچنے سے منع کر دیا گیا..... نوادرات میں حضرت علیؓ کا قلمی نسخہ کوفی رسم الخط میں لکھا ہوا..... نوشتہ عالمگیر۔ منقبت حضرت علیؓ جو دوسو سال پرانی تھی، جس کے شرٹ عالمگیر جس کے بازو پر لکھا ہوا قرآن جو جنگوں میں پہنا جاتا تھا۔ ۲۵۰ سال پرانی مہابھارت، حافظ شیرازی کی کریمہ کا ۳۵۰ سال پرانا نسخہ، ۶۰ صفحوں میں لکھا ہوا قرآن، ایک سپارہ ایک صفحے پر، خط ناخن، یعنی کاغذ کے الٹے طرف ناخن سے لکھا ہوا قصیدہ تھا۔

پام کے پتے پر لکھے ہوئے ویداز، تفسیر حسینی جو سونے سے لکھی اور نقش و نگار سے مزین تھی، سورۃ یونس جو ۱۸۶۵ء میں لکھی گئی تین انچ کی پٹی ڈیڑھ انچ چوڑی رول پٹی کاغذ کے ساتھ کپڑا لگایا گیا ہے جو مکمل قرآن ہے۔ ایک چھوٹی سی ڈھائی سنٹی میٹر ۸ کونوں والی ڈبیہ میں بند قرآن جو انیسویں صدی کے آخر میں لکھا گیا تھا۔ جہانگیر کے پینٹر منصور نقاش کا بنایا ہوا، Tulip کا پھول اور اس طرح کی اور بے شمار چیزیں۔ لائبریرین ڈاکٹر شکیل احمد خاں نے انتہائی خلوص اور محبت سے تمام لائبریری دکھائی، سرسید احمد خاں کا گھر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلباء کی بنائی ہوئی فلم جس میں سرسید
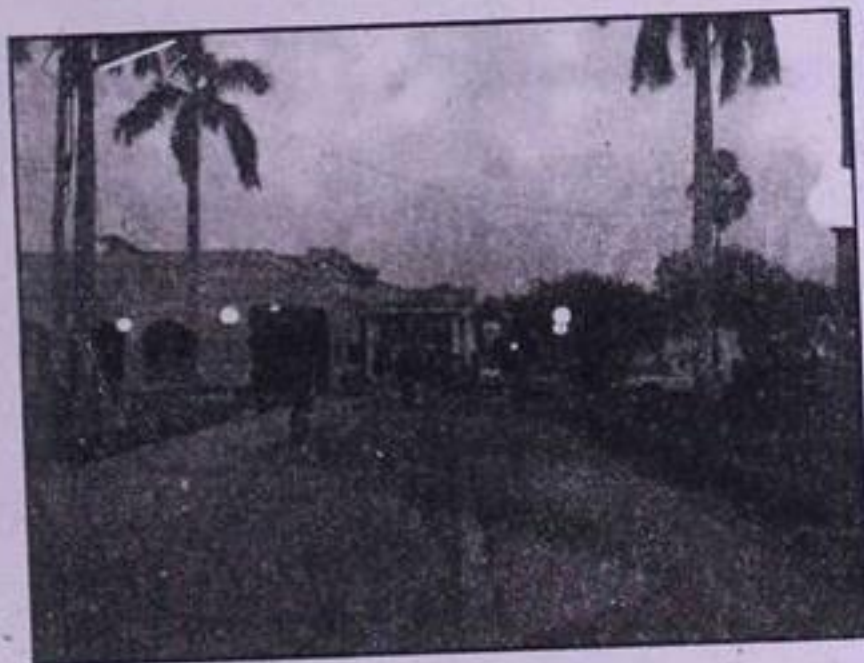
سرسید احمد خاں کی رہائش گاہ علی گڑھ

احمد خاں کی ساری کوشش اور کاوش کو سمو دیا گیا تھا...... دکھائی گئی...... علیگڑھ میں قیام خوابوں کا مرکز تھا، یوں لگا علیگڑھ نے اپنے سحر میں گرفتار کر لیا ہے، ان کی میزبانی ان کے کھانے، ان کی محبتیں اور ان کا خلوص ہماری زندگی کا ناقابلِ فراموش اور قیمتی سرمایہ ہے۔

قلعہ آگرہ

اس کے بعد آگرہ گئے، آگرہ کا قلعہ اور تاج محل آنکھیں جھپکنے کو دل نہیں چاہتا تھا، پتھروں میں مینا کاری اور کارونگ ان عمارتوں کے حسن کو محیط کرنے کیلئے بصارت ہاتھ باندھ کر دامن چھڑا لیتی ہے، فتح پور سیکری اکبر بادشاہ کا سلیم چشتی کی خواہش پر بسایا ہوا شہر حسن کا نادر نمونہ ہے۔ یہاں آ کر قدم رک جاتا ہے۔ نظر ٹھہر جاتی ہے اور انسان سوچتا ہی رہ جاتا ہے، فانی انسان کائنات کو سجاتا سنوارتا کہاں چلا جاتا ہے، ہر بادشاہ کا ذہن اور خیالات عمارتوں کی صورت میں عیاں تھے۔ اکبر کی تین بیویاں، مسلمان، عیسائی اور ہندوان تینوں کے محلات اس کی محبتوں کی درجہ بندی کے عکاس تھے مگر تاج محل سب پر حاوی تھا۔

تاج محل کے پیش منظر میں ڈاکٹر ایوب علوی اور اہلیہ نعیم فاطمہ علوی

جے پور کا گلابی شہر لوگوں کو شہزادے اور شہزادیوں کے دیس میں لے گیا، محلات میں پھرتے ہوئے یوں لگ رہا تھا، ہم سب یکایک شہزادے اور شہزادیاں بن گئے ہیں۔ جے پور میں ہمارا قیام فائیو سٹار ہوٹل میں تھا۔ جے پور سے ہمارا واپسی کا سفر شروع ہو گیا اور ہم واپس دھلی آئے اور ایک رات ٹھہرے۔ دھلی کا وہ علاقہ جو کبھی لال
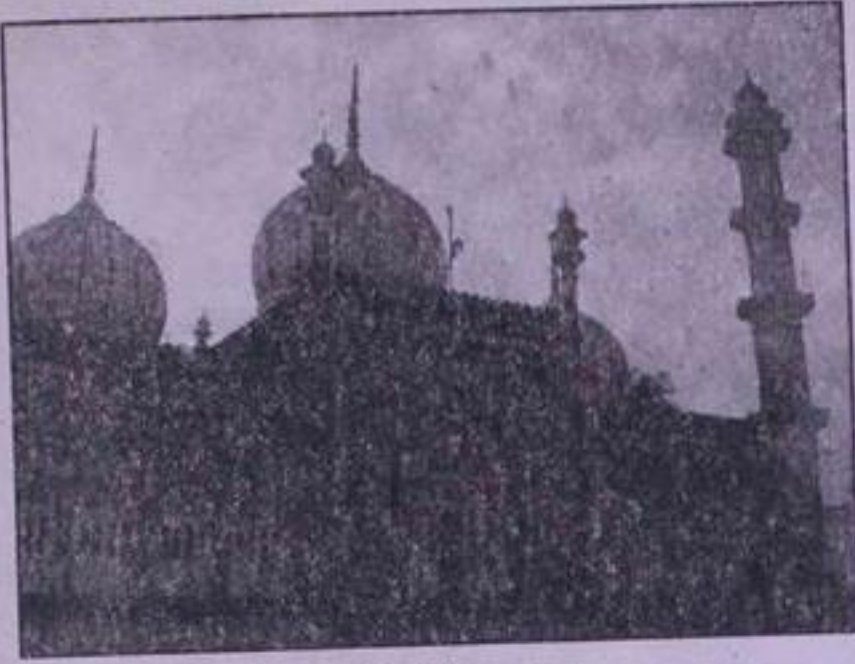
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی مسجد

قلعے کے گردو پیش تک محدود تھا بہت زیادہ پھیل چکا ہے، نئی دھلی، پرانی دھلی، غرباء کا علاقہ، شرفاء کا علاقہ، سرکار کا علاقہ تمام علاقوں میں درجہ بندی نمایاں تھی، شہر کی بڑھتی ہوئی ٹریفک کو بہت ہی اچھے طریقے سے کنٹرول کیا گیا ہے۔ جگہ جگہ اوور ہیڈ برج نظر آئے۔ دھلی میں بسوں کی اوورٹیکنگ منع ہونے کی وجہ سے لوگوں میں قطار بندی تحمل اور برداشت کا مادہ نظر آیا، قلعے کے طلسماتی حسن کو باہر سے دیکھا۔ جامع مسجد کو دیکھ کر مایوسی ہوئی، وسیع وعریض مسجد جس کی سج دھج کبھی دیکھنے کے قابل ہوگی، خستہ حال نظر آئی۔ مسجد میں نمازی کم اور کبوتر زیادہ نظر آئے...... مسجد کا حوض جو کبھی حوضِ کوثر کی طرح ہوگا۔ مسجد کے نقش ونگار میں معماروں کے حسین خوابوں کی جھلک نظر آرہی تھی۔ ہم نے اپنے خیالات اور تاثرات دربان کو امانت سمجھ کر بتائے۔ واہ دھلی جسے کبھی اپنی زباں دانی پر ناز تھا زمین بردھوگئی اب تو زبان میں شستگی کی بجائے دُرشتی، اور کرختگی نظر آئی، یہ کرختگی اور بیچارگی لوگوں کے چہروں پر بھی تھی۔ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اور امیر خسرو کے مزار کو دیکھا۔ ہٹے کٹے دربان ہاتھ میں ڈنڈا پکڑے چندا مانگ رہے تھے۔

قلعہ فتح پور سیکری

ان مجاوروں کے رعب اور دبدبے کا یہ عالم تھا کہ نظر بھر کر دیکھیں تو خوف سے ٹانگیں کانپنے لگیں۔ چندا دیئے بنا جان بچا کر بھاگنے میں عافیت سمجھی۔ غالب کے مزار کا تالا کھلوا کر فاتحہ پڑھی، وہاں ایک شخص سے پوچھا غالب کا گھر (محلّہ بلی ماراں) یہاں سے کتنی دور ہے۔ وہ کہنے لگا کونسا گھر کیسا
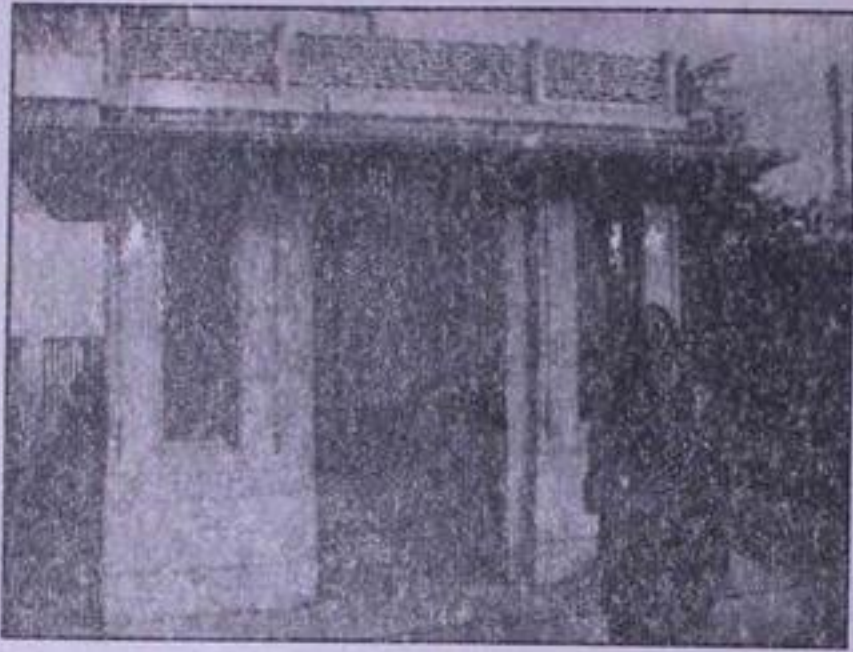
صاحب مضمون دہلی میں مزار غالب پر

گھر، غالب کا کوئی گھر نہیں تھا جہاں شراب کی بوتل ملی بیٹھ گیا۔ سکوٹر چلاتی ہوئی عورتیں معاشرے میں عورت کی آزادی کی متحرک علامت بن کر نظر آئیں۔ فٹ پاتھ پر لوگوں کو پیدائش سے موت تک کے مراحل طے کرتے ہوئے دیکھا۔ بہرحال مغلون کا یہ اثاثہ جو مسلمانوں کے ساتھ وابستہ ہے، ہندوستان کیلئے سونے کا انڈا دینے والی مرغی سے کم نہیں۔ انہوں نے اس اثاثے کو نہ صرف سنبھال کر رکھا ہوا ہے بلکہ اربوں روپے کما رہے ہیں...... ہمارے گائیڈ نے بتایا ہماری قوم آہستہ آہستہ سدھر رہی ہے...... امرتسر میں جلیانوالہ باغ برصغیر کی مشترکہ۔ جدوجہد آزادی کی یاد دلاتا ہے، وہاں ہر وقت ترانے لگے رہتے ہیں۔ گولڈن ٹمپل بھی دیکھنے کی چیز ہے...... مشترکہ تہذیب میں مشترکہ مذہب...... کبھی دین الٰہی اور کبھی سکھ ازم گولڈن ٹمپل کے چار دروازے چاروں مذہب کے لوگوں کیلئے ہر وقت کھلے۔ تمام لوگوں کو بلا تفریق مذہب لنگر کھاتے دیکھا...... یہاں مسجود پتھر نہ تھا عمارت تھی......

طیبہ آفتاب

گھریلو ٹوٹکے

۱۔ پیٹھے کے فائدے

یہ ایک مکمل غذا ہے اس میں حرارے بہت کم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ذیابیطس کے اور موٹاپے کے شکار لوگوں کے لیے مفید ہے۔ اس کی تاثیر سرد اور جلاب آور ہے اس کا استعمال رطوبتوں کا اخراج بڑھاتا ہے۔ چنانچہ پیشاب میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اس کا رس السر کے علاج میں موثر ہے۔

۲۔ پیٹھے کی مٹھائی کے فائدے

پیٹھے کی مٹھائی وزن بڑھانے، دل کی کمزوری، جسم میں حدت خون کی کمی اور تپ دق میں بھی استعمال کی جاتی ہے۔ انجماد خون کی صورت میں پیٹھا اہم کردار ادا کرتا ہے۔ پیٹھے کا رس ایک چمچہ آملے اور لیموں کا رس ایک چمچہ ملا کر پیجئے، یہ بیماری دور ہو جاتی ہے۔

۳۔ خشک پھلیاں (یعنی لوبیا)

لوبیا اور سالم دالوں میں معدنیات ریشہ اور پروٹین کثرت سے اور وٹامن اے اور سی وافر مقدار میں پائی جاتی ہیں ان سے بڑھاپا آنے کا عمل سست ہو جاتا ہے۔ لیکن خیال رہے ہر رنگ کی یعنی سرخ، سبز، سفید اور کالے رنگ کی پھلیاں۔ استعمال کی جائیں تا کہ سب طرح کی وٹامن حاصل کی جا سکیں۔

۴۔ سبزیوں کے فائدے

سبزیوں میں جیسے پالک، سلاد، بند گوبھی یا شلغم میں خوب غذایت ہوتی ہے۔ ان میں وٹامن اے اور سی کے علاوہ کیلشیم اور فولاد وغیرہ بھی ہوتے ہیں، جن کے استعمال سے خون کی کمی کا عارضہ نہیں ہوتا ہے۔

۵۔ دودھ اور دہی کے فائدے

دودھ اور دہی کیلشیم اور وٹامن بی کی تمام ضروریات پوری کرتے ہیں اس کے علاوہ ایسا بیکٹیریا بھی مہیا کرتے ہیں جس سے جسم میں امراض کے خلاف مدافعت پیدا ہوتی ہے۔ انہیں مکمل غذا کے طور پر

کھانے کے علاوہ پھلوں کے ساتھ بھی کھایا جاسکتا ہے، چکنائی والا دودھ شریانیں تنگ کرتا ہے۔

۶۔ ہچکی کا علاج

اگر آپ کو ہچکیاں آ رہی ہوں تو لونگ کھالیں ہچکیاں آنا بند ہو جائیں گی۔

۷۔ آنکھوں کی سوجن کے لیے

اگر آپ کی آنکھیں سوج گئی ہوں تو آلو کے قتلے بند آنکھوں پر رکھنے سے سوجن دور ہو جاتی ہے۔

۸۔ ڈینگی بخار کے لیے

ڈینگی بخار کے لیے پپیٹے کے تازہ پتے لیکر پتوں کے بیچ سے ڈنٹھل نکالنے کے بعد کچل کر کپڑے میں چھان کر پلانے سے فائدہ ہوتا ہے۔ یہ کڑوا تو ہوتا ہے مگر فائدہ مند ہے۔

۹۔ آنکھوں کی خشکی کے لیے

آنکھوں کی خشکی اور جلن کے لیے صاف برف کچل کر صاف کپڑے میں پوٹلی بنالیں اور ہر دو گھنٹے کے وقفہ سے پانچ، پانچ منٹ ٹھنڈی سکائی کریں یہ سکائی فریج میں رکھے انڈے سے بھی کی جاسکتی ہے بشرطیکہ انڈا دھلا ہوا ہو اور ٹوٹا ہوا نہ ہو۔

۱۰۔ کالی کھانسی کے لیے

کالی کھانسی کے لیے لہسن عمدہ چیز ہے اس کیفیت میں لہن کے پانچ قطرے چائے کا ایک چمچہ دن میں دو یا تین بار پلانا فائدہ مند رہتا ہے اگر کھانسی زیادہ ہو تو اور اس کے دو سے بار بار پڑتے ہوں تو خوراک بڑھائی جاسکتی ہے۔

۱۱۔ زخم ناسور کے لیے

زخم ناسور کے علاج میں لہسن کو جراثیم کش دوا کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور اس سے یقینی نتائج حاصل کئے جاتے ہیں، ایک حصہ لہسن کا جوس تین حصے پانی پر مشتمل لوشن سے زخم اور انفیکشن دھوئیں۔ تو فائدہ تیزی سے رونما ہوتا ہے یقینی بہتری ابتدائی چوبیس گھنٹوں میں دیکھنے میں آجاتی ہے۔